نمونے کے انسان

(بزرگان دین کے واقعات وحکایات کا مجموعہ)

مؤلف

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ

(م: ۲۸؍ستمبر ۲۰۱۳ء)

(بانی: مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ، ضلع مئو، یوپی)

ترتیب
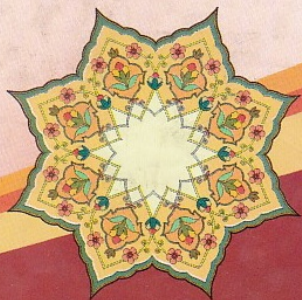
محمد عرفات اعظمی

مکتبہ ضیاء الکتب خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)

نمونے کے انسان

(بزرگان دین کے واقعات وحکایات کا مجموعہ)

[حصہ اول]

از

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی (م: ۲۸؍ستمبر ۲۰۱۳ء)

(بانی: مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ، ضلع مئو یوپی)

ترتیب

محمد عرفات اعجاز اعظمی

ناشر

مکتبہ ضیاء الکتب، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)

پن کوڈ: 276403   موبائل: 9235327576

تفصیلات

نام کتاب	:	نمونے کے انسان (حصہ اول ودوم)
مرتب	:	محمد عرفات اعجاز اعظمی
صفحات	:	۳۱۸
سنہ طباعت	:	۲۰۱۵ء
ناشر	:	مکتبہ ضیاء الکتب، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)
قیمت	:	
برقی پتہ	:	arfatazmi89@gmail.com

ملنے کے پتے

☆ فرید بک ڈپو پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲

☆ مولانا اعجاز احمد اعظمی لائبریری، چھپرا، چریاکوٹ، ضلع مئو 9936029463

☆ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

☆ مکتبہ الفہیم صدر چوک مئوناتھ بھنجن 9236761926

☆ مولانا محمد خالد قاسمی مکتبہ دارارقم اسلام آباد (ڈکہا) جون پور 9554983430

انتساب

مولانا محمد عابد اعظمی صاحب

اور

مولانا محمد عامر اعظمی صاحب

کے

نام

فہرست (حصہ اول)

علماء کا مقام

تعلیمی انہماک اور تحمل شدائد

شفقت وخیر خواہی

صبر و رضا

ضبط و تحمل

احتیاط وتقوی

ادائیگی حقوق واحترام مشائخ

قناعت و استغنا

قدر نعمت اور انتظام

شجاعت اور اعتماد علی اللہ

اختلاف کی حدود

مرض الوفات

شہدا کا دم واپسیں

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے واقعات

اشتات رمتفرقات

مصافحہ کیا اور مسلمان ہو گیا

رشیدین

مرشد رومی کی خدمت میں

☆☆☆☆☆☆

پیش لفظ

مولانا محمد عابد اعظمی صاحب
استاذ۔ مدرسہ شیخ الہند قاسم آباد، انجان شہید، اعظم گڑھ

سلف صالحین کے واقعات وقصص کو تربیت وتزکیہ اور زندگی کو درست سمت میں گامزن کرنے میں مینارۂ نور کی حیثیت حاصل ہے، قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں گزشتہ امتوں اور انبیاء ورسل کے واقعات اسی مقصد سے بیان کئے گئے ہیں کہ بعد والے ان سے عبرت وموعظت کا درس لیں، اور اپنی زندگیوں کو انہیں نقوش پر استوار کریں۔

واقعات وقصص کے ذکر کی حکمت کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالی فرماتے ہیں۔ ''وکلاً **نقص علیک من انباء الرسل ما نثبت به فوادک وجاءک فی هذاالحق و موعظة و ذکریٰ للمومنین**''۔ (سورہ ہود) اور پیغمبروں کے قصوں میں سے ہم یہ سارے قصے آپ سے بیان کرتے ہیں، جن کے ذریعے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں، اور ان قصوں میں آپ کے پاس ایسا مضمون پہونچا ہے جو خود بھی راست ہے، اور مسلمانوں کے لئے نصیحت ہے اور یاددہانی ہے۔

یعنی گذشتہ اقوام ورسل کے واقعات سن کر پیغمبر ﷺ کا قلب بیش از بیش ساکن ومطمئن ہوتا ہے، اور امت کو تحقیقی باتیں معلوم ہوتی ہیں، جن میں نصیحت اور تذکیر کا بڑا سامان ہے۔

آدمی جب سنتا ہے کہ میرے ابنائے نوع پہلے فلاں فلاں جرم کی پاداش میں ہلاک ہو چکے ہیں، تو ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، اور جب دیکھتا ہے کہ فلاں راستہ اختیار کرنے سے پچھلوں کو نجات ملی تو طبعاً اس کی طرف دوڑتا ہے، فی الحقیقت قرآن کریم میں قصص کا حصہ اس قدر

مؤثر ومذکِّر واقع ہوا ہے کہ کوئی شخص جس میں تھوڑا سا آدمیت کا جز ہو، اور خوف خدا کی ذراسی ٹیس دل میں رکھتا ہو، انہیں سن کر متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔(تفسیر عثمانی)

واقعات وقصص کی اسی افادیت کے پیش نظر امت میں ہمیشہ سے اس کے تذکرہ وتحریر کا مبارک سلسلہ جاری رہا ہے، حضرت والد صاحب علیہ الرحمہ کو ابتدائے شعور سے اکابرین وسلف صالحین کے تذکرے اور ان کے واقعات وحکایات کے ذکر سے غیر معمولی شغف رہا ہے، چنانچہ اس کا واضح ثبوت آپ کے نوک قلم سے نکلے ہوئے متعدد مفصل تذکرے اور سوانحی مضامین ہیں، جن میں ان کے احوال وواقعات کو اپنے خاص والہانہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ بس ''وہ کہا کریں اور سنا کرے کوئی''۔

بعینہ یہی کیفیت ان کے زبانی ذکر وبیان کی تھی، سلف صالحین کا تذکرہ وہ اس کثرت سے کرتے تھے کہ ان کے خاص احباب نے ایک زمانے میں ان کا لقب ہی ''تذکرۃ الاولیاء'' رکھ دیا تھا۔

والد صاحب علیہ الرحمہ نے یہ تحریریں کس مقصد اور نظریے کے تحت لکھی ہیں، خود تحریر فرماتے ہیں:

''لکھنے والے نے ان تذکروں کو اسی نیت سے لکھا ہے کہ شاید رحمت الٰہی کا کوئی جھونکا اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اور پھر جہاں جہاں تک یہ تذکرے پھیلیں گے، رحمت الٰہی کا جھونکا پھیلتا جائے گا۔ اور اگر صحبت صالحین میسر نہ ہو تو یہ ذکر صالحین کچھ اس کا قائم مقام بن جائے۔ ہوسکتا ہے کہ رحمت الٰہی کی یہ چشم التفات لکھنے اور پڑھنے والوں کی سیرت میں روشنی اور نکھار پیدا کردے''۔

زیر نظر کتاب اکابرین وسلف صالحین کے واقعات وحکایات کی ایک روشن کہکشاں ہے، جسے برادر عزیز مولانا محمد عرفات اعظمی سلمہ نے بڑے سلیقے سے یکجا کیا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرتب کی اس کاوش کو اپنے محبوب بندوں کی طفیل میں حسن قبولیت عطا فرمائے اور حضرت والد صاحب علیہ الرحمہ کے حق میں صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

☆☆☆☆☆☆

مُقدّمہ

مولانا ضیاء الحق صاحب خیرآبادی مدظلہ

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی ناکامی کے ساتھ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا چراغ بھی گل ہوگیا، چونکہ اس تحریک میں علماء کرام نے قائدانہ رول ادا کیا تھا اس لئے انگریزوں نے اس کا بدلہ اس طرح لیا کہ خود انگریز مورخین نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ پچاس ہزار سے زیادہ علماء کرام کو پھانسی دی گئی، علماء کرام کی اتنی بڑی تعداد کے ختم ہوجانے کے بعد یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں یہاں سے دین ہی کا خاتمہ نہ ہوجائے، اس لئے کہ دین کی بقاعلمِ دین سے ہے، جب علماء ہی نہ ہوں گے تو علم کیونکر باقی رہے گا۔ یہ صورتحال دیکھ کر اس زمانے کے مخلص علماء کرام واہل دل حضرات کی ایک جماعت نے یہ فیصلہ کیا کہ عوامی طرز کا ایک مدرسہ قائم کیا جائے، جس کے ذریعہ عوام کو علماء اور دین سے مربوط کیا جائے۔ چنانچہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک ایسا ادارہ وجود میں آیا جس کا تمام تر مدار عوامی چندے پر رکھا گیا، یہ الہامی ادارہ دارالعلوم دیوبند تھا، جس نے ہندوستان کی تاریخ پر نہایت گہرے اثرات مرتب کئے۔

دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ایسے اخلاص وللہیت، خداترسی اور تقویٰ واعتماد علی اللہ پر رکھی گئی تھی جس نے بارگاہ خداوندی میں شرف قبول پایا اور اس سے ایسے قدسی صفت افراد کی جماعت وجود میں آئی جس کی نظیر چشم فلک نے کم ہی دیکھی ہے۔ ان کی سیرت وسوانح دور حاضر میں صحابہ و تابعین اور اکابر متقدمین کا سچا نمونہ تھی، ایسا نمونہ جس نے قرآن وحدیث کے نصوص کی عملی تشریح دنیا کے سامنے رکھ دی اور ایمان وعمل کا راستہ آسان کردیا۔ ان کے احوال وواقعات کو پڑھ کر ایمان

میں تازگی اور افکار ونظریات میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے عہد صحابہ کا کوئی بچھڑا ہوا کوئی قافلہ اس دور میں آ گیا ہو۔

علماء دیوبند کے ایمان افروز وروح پرور واقعات ان کے حالات وسوانح پر لکھی گئی کتابوں میں جابجا موجود ہیں ۔حضرت الاستاذ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ جنھیں بزرگان دین ، اولیاء کرام اور علمائے سلف کے واقعات سے خصوصی شغف تھا، اس حد تک کہ ان کے بےتکلف دوست انھیں ''تذکرۃ الاولیاء'' کہہ دیتے تھے۔حضرت مولانا علیہ الرحمہ کا حال یہ تھا کہ خانوادۂ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، اکابر دیوبند، سلف صالحین اور اولیاء اللہ سے انھیں جو بے پناہ عقیدت ومحبت تھی اس سے سرشار ہوکر آپ ان کی داستان دلنواز سناتے رہتے۔تقریر میں، تدریس میں اور نجی مجلسوں میں جہاں کہیں ان بزرگان دین کا ذکر خیر آجاتا پھر آپ کی کیفیت دیدنی ہوتی، گھنٹوں ایک کیف کے ساتھ ان کے واقعات سناتے رہتے ، یہ واقعات تربیت واصلاح کیلئے بہت مفید ثابت ہوتے تھے، سننے والے جب مجلس سے اٹھتے تو ان کا دل ایمان ویقین سے لبریز اور ان اہل اللہ کی محبت وعقیدت سے معمور ہوتا تھا، اور وہ ایک جذبۂ عمل کو لیکر اٹھتے تھے، نہ جانے کتنے لوگوں کی زندگیاں ان مجالس اور ان واقعات کی برکت سے بدل گئیں، اور سنت وشریعت کے نور سے منور ہوگئیں۔

ان واقعات کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر ایک زمانہ میں حضرت مولاناؒ نے بڑی کاوش اور دیدہ ریزی کے ساتھ اکابر دیوبند کے واقعات کو مختلف عناوین کے تحت جمع کرنا شروع کیا، جیسے ''ذوق عبادت وذکر''، ''حب نبوی''، ''اتباع سنت''، ''علماء کا مقام''، ''شفقت وخیر خواہی'' ''صبر ورضا'' اور ''ضبط وتحمل'' وغیرہ۔آپ کا ارادہ تو یہ تھا کہ علماء دیوبند کی سوانح سے تمام واقعات کو ایک خاص انداز سے جمع کردیا جائے، چنانچہ آپ نے مدرسہ دینیہ غازی پور کے زمانۂ قیام میں اس کو جمع کرنا شروع کیا، تقریباً دوسو صفحات لکھے جا چکے تھے، اسی دوران مئو کا وہ تاریخی فرقہ وارانہ فساد ہوا جس میں ۱۶ر دن تک لگاتار کرفیو لگا رہا، اس میں پولیس اور پی اے سی کے ذریعہ مسلمانوں پر ظلم وبربریت کی انتہا کردی گئی، حضرت مولانا فرماتے تھے کہ مئو کے فساد کا طبیعت پر یہ اثر ہوا کہ جیسے دل ودماغ منجمد ہوگیا ہو، اور ترتیب واقعات کا یہ سلسلہ بھی بند ہوگیا ، پھر بعد میں چاہا کہ اسے

منصوبہ کے مطابق مکمل کردیں لیکن کثرتِ مشاغل کی وجہ سے اس کی تکمیل حسب منشا نہ ہوسکی، حضرت مولانا نے اس کا عنوان ''اک محفل تھی فرشتوں کی ....'' تجویز کیا تھا۔لیکن ان کے استاذ محترم حضرت مولانا افضال الحق صاحب جوہر قاسمیؒ نے اسے بدل کے ''نمونے کے انسان'' تجویز کیا، اس وقت اس کی متعدد قسطیں اسی عنوان سے ان کے رسالہ ''الریاض'' گورینی میں شائع ہوئیں۔اور باقی مسودات کی شکل میں پڑی رہیں، بعد میں چند قسطیں ایک دو رسالوں میں شائع ہوئیں، مسودات کا کچھ حصہ رکھے رکھے ضائع بھی ہوگیا، جس پر مجھے بہت افسوس ہوا۔

مجھے حضرت مولانا کے علوم ومعارف اور ان کی صحبت وتربیت سے جو نفع ہوا اس کے پیش نظر یہ بات ہمیشہ میرے دل میں رہی کہ آپ کی تمام چیزیں منظر عام پر آجائیں تاکہ ان کا نفع عام اور تام ہو، چنانچہ میں نے آپ کی حیات میں شائع ہونے آخری کتاب (حدیثِ دردِ دل) ......جو آپ کے اداریوں کا مجموعہ ہے......میں لکھا:

''مولانا کی تحریر وتقریر سے مجھے جو دینی نفع ہوا، اس کی وجہ سے زمانۂ طالب علمی ہی سے میرے دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ مولانا کے پیغام کو عام کرنے کے لئے جو بھی ممکنہ کوشش و کاوش مجھ سے ہوسکے گی اس سے دریغ نہ کروں گا، تاکہ متلاشیانِ حق اس کی روشنی میں بآسانی اپنی منزلوں تک رسائی حاصل کریں، اور اپنے افعال وکردار کو سنت وشریعت کے سانچے میں ڈھال سکیں۔اگر اس سے کسی ایک شخص کی دینی زندگی سنور گئی تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت و کاوش ٹھکانے لگ گئی۔چنانچہ میں نے اسی قت سے آپ کی ایک ایک تحریر کو حرزِ جاں بنا کر رکھا، اور اپنی تمام چیزوں سے زیادہ اس کی حفاظت کی، اور جب بتوفیق الٰہی اس کی اشاعت کے مواقع میسر آئے تو اب یہ تمام تحریریں شائع ہوکر منظر عام پر آگئیں۔اب تک تقریباً ۲۵؍ کتابیں اور رسائل منظر عام پر آچکے ہیں، اور اس سلسلے کی یہ آخری کڑی ہے۔

حضرت مولانا کے انتقال کے بعد بھی نشر واشاعت کا یہ کام الحمد اللہ جاری وساری ہے، کئی پرانی کتابوں کے جدید ایڈیشن اچھے خاصے اضافے کے ساتھ منظر عام پر آچکے ہیں، میرے لئے یہ امر قلبی وروحانی مسرت کا باعث ہے کہ حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے عزیزم مولانا محمد عرفات سلّمہٗ......اللہ انھیں حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے علوم ومعارف

کا حامل وامین بنائے...... میرے دست وبازو بن کر سامنے آئے اور بہت سا کام اپنے ذمہ لے کر انھوں نے میرے بوجھ اور ذمہ داری کو ہلکا کردیا، ابھی کچھ عرصہ پہلے انھوں نے میرے مشورے اور رہنمائی میں حضرت مولانا کے مقالات کو دو ضخیم جلدوں میں نہایت سلیقے سے مرتب کیا، اور یہ مقالات ''علوم ونکات'' کے نام سے شائع ہوکر حضرات اہل علم کے ہاتھوں میں پہونچ گئے ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ ''نمونے کے انسان'' کو بھی شائع کردیا جائے، کچھ تو رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں کچھ مسودات کی شکل میں ہیں، مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی، میں نے کہا کہ ضرور، ورنہ یہ سب بھی کچھ دنوں کے بعد ضائع ہو سکتے ہیں، انھوں نے کہا کہ لیکن یہ کل ڈیڑھ سو صفحات کے قریب ہی ہوں گے، میں نے کہا کہ کوئی حرج نہیں، اس کتاب کے دو حصے کردو، پہلے حصے میں یہ واقعات آجائیں اور دوسرے حصے میں حضرت مولانا نے اپنی جملہ تصانیف میں جتنے واقعات بیان کئے ان کو جمع کردو، میرے پاس حضرت مولانا کی تمام تصانیف کی ان پیج فائل موجود ہے وہ میں نے ان کے حوالہ کردی تاکہ جمع وترتیب میں سہولت رہے، انھوں نے اس پر ایک عمدہ اضافہ یہ کیا کہ خود حضرت مولانا کے واقعات بھی اس میں جمع کردیئے جو یقیناً ہم لوگوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔ اب یہ کتاب علماء دیوبند کے واقعات کے ساتھ ساتھ بہت سے بزرگان دین کے احوال وواقعات کا مجموعہ ہے۔

ان واقعات کی روشنی میں علماء دیوبند کا دینی مزاج مجموعی اعتبار سے نکھر کر سامنے آگیا ہے، یہ کتاب صرف علماء دیوبند کے ایمان افروز واقعات کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک آسان راہ عمل اور بہترین رہبر بھی ہے۔ اپنے انداز کی اتنی عمدہ اور دلچسپ کتاب کہ شروع کرنے کے بعد ختم ہی پر ہاتھ سے رکھی جائے۔

اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کی دیگر تحریروں کی طرح اسے بھی قبول عام عطا فرمائیں اور بلندئ درجات کا ذریعہ بنائیں، اور مرتب موصوف کو اس سعی وکاوش پر بہترین اجر دیں اور علمی ترقیات کا ذریعہ بنائیں۔ آمین یارب العالمین

ضیاء الحق خیرآبادی

۱۵؍اگست ۲۰۱۵ء مطابق ۲۹؍شوال ۱۴۳۶ھ

مرتب کی جانب سے

واقعات وحکایات کے لکھنے اور بیان کرنے کا دستور قدیم زمانے سے رائج ہے، ہر زمانے اور ہر دور میں مشاہیر کے واقعات اوران کی اولوالعزمیوں کے قصے بعد والوں کی قوت عمل کو بیدار کرنے اوران کے تخیل کو پرِ پرواز دینے کے لئے بیان کئے گئے ہیں،قرآن کریم میں بھی بہت سے صاحب عزیمت لوگوں کے واقعات بعد والوں کی قوت عمل کوتحریک دینے کے لئے خداوند قدوس نے بیان کئے ہیں،اوراحادیث کا بھی ایک معتدبہ حصہ واقعات وحکایات پر مشتمل ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ عملی میدان میں انسان کواسوہ اورآئیڈیل کی ضرورت پڑتی ہے،عمومی تجربہ یہی ہے کہ انسان کی قوت کاراسی وقت برسرکار ہوتی ہے جب اس کے سامنے میدان عمل میں کسی فرد کا عملی نمونہ موجود ہو،پچھلوں کو دیکھ کر ہی بعد کے لوگ خودکواس رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتے ہیں،انسان کی اسی فطرت کی وجہ سے اللہ نے دنیا کو نبی کریم ﷺ کا اسوہ عطا فرمایا،" **لقد کان فی رسول الله اسوة حسنة**". (تمہارے لئے اللہ کے رسول بہترین آئیڈیل ہیں) پھر آپ کے نقش قدم کوآپ کے اصحاب نے اختیار کیا تو وہ بھی نمونہ بن گئے،اسی طرح قرناً بعد قرن آپ کا اسوہ ایک سے دوسرے تک منتقل ہوتا رہا،اورجس نے بھی پیروی کرنے کی کوشش کی وہ بعد والوں کے آئیڈیل بنتا چلا گیا۔

اس کتاب میں آپ ﷺ،صحابہ کرام اور بزرگان پیشیں کے کچھ سچے پیروکاروں کے واقعات وحکایات بیان کی گئی ہیں،ان واقعات کے کردار بہت پرانے نہیں بلکہ زمانہ قریب کے لوگ ہیں،ان واقعات کے درج کرنے کا مقصد حظ نفس نہیں بلکہ احتساب نفس ہے کہ ہم غورکریں

کہ یہ لوگ بھی ہمارے اسی فتنہ پرور دور کے لوگ تھے، زمانہ کی تمام تر فتنہ سامانیوں کے باوجود انہوں نے ہمت وعزیمت سے کام لیا اور کلمہ ''لا الہ'' کے ضمن میں خدا اور سول سے کئے ہوئے وعدہ کو نبھا کر دکھا دیا، اگر ہم بھی تھوڑی سی عزیمت اور حوصلے سے کام لیں تو ہمارے لئے بھی یہ راہ آسان ہوسکتی ہے۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ حضرت والد صاحب کا ترتیب دیا ہوا ہے، جس میں مختلف تذکروں اور سوانح عمریوں سے والد صاحب نے واقعات چن کر اکٹھا کئے ہیں، جو ازحد دلچسپ، معلوماتی اور فکروعمل کی دعوت دینے والے ہیں۔ مسودے میں جس ترتیب سے واقعات درج تھے ہم نے اسی ترتیب کو باقی رکھا ہے، ہاں کہیں کہیں جہاں اشد ضرورت محسوس ہوئی ہے بقدر ضرورت ترمیم کی ہے۔

مسودے میں حوالے کا اہتمام نہیں تھا، بعض واقعات کے ساتھ صرف کتاب کا نام لکھا ہوا تھا، صفحہ نمبر کہیں بھی درج نہیں تھا، ہم نے اہتمام کرکے تمام واقعات کا اصل ماخذ سے موازنہ کرکے بقید صفحہ کتاب کے حوالے درج کردیئے ہیں، تاکہ اس کتاب کی استنادی حیثیت دوبالا ہوجائے۔ چند ایک واقعات ایسے ہیں جن کے ماخذ تک ہماری رسائی نہیں ہوسکی، جس کی وجہ سے ان کے حوالے یا تو تشنہ ہیں یا سرے سے ہی نہیں، لیکن ایسے دو چار ہی واقعات ہیں۔

ایک زمانہ میں والد صاحب نے ''نمونے کے انسان'' کے نام سے بزرگان دین کے واقعات کو لکھنا شروع کیا تھا، جس کی متعدد قسطیں دو ماہی ''الریاض'' گورینی میں شائع ہوئی تھیں، ہم نے ان شائع شدہ واقعات کو بھی الریاض کے صفحات سے نقل کرکے کتاب کا حصہ بنا دیا ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں والد صاحب کی جملہ تصانیف سے واقعات چن کر جمع کئے گئے ہیں، ترتیب کی صورت یہ رکھی گئی ہے کہ اگر کسی بزرگ کے متعدد واقعات کسی کتاب میں درج ہیں تو ان بزرگ کے نام کے تحت ان کے تمام واقعات کو جمع کیا گیا ہے، بصورت دیگر کتاب کے نام کے تحت واقعات درج کئے گئے ہیں۔

اخیر میں والد صاحب کی خودنوشت ''حکایت ہستی'' سے خود ان کے واقعات جمع کرکے

کتاب کی زینت بنا دیئے گئے ہیں۔اور ’’براویت دیگراں‘‘ کے عنوان کے تحت دوسرے لوگوں نے والد صاحب سے متعلق جو واقعات ذکر کئے ہیں (خاص طور سے وہاٹس ایپ کے گروپ ’’معارف مولانا اعجاز احمد اعظمی‘‘ میں) ان کے نام کے حوالے کے ساتھ ان کو کتاب کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔اس میں کسی خاص تلاش وتتبع کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔

دعا ہے کہ والد صاحب کی دیگر کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی حسن قبولیت حاصل کرے، اوران کے لئے صدقہ جاریہ بنے۔آمین

محمد عرفات اعظمی

۲۰۱۵/۸/۱۵ء

☆☆☆☆☆☆

مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب اور تذکرۂ صالحین

صالحین سے محبت اوران کے ذکر خیر کی توفیق خدا کی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے،اس راستہ سے خدااور رسول کی محبت دل میں جاگزیں اور مستحکم ہوتی ہے،صالحین کا تذکرہ خدا کی سنت ہے،قرآن میں جابجا اللہ کے نیک بندوں کے تذکرے اور واقعات ملتے ہیں،اور یہ بات تو طے ہے کہ بزرگان پیشیں کے اولوالعزمیوں کے تذکرے سے بعد والوں کو عمل کی تحریک ملتی ہے، اوران کے نقش پا سے درست سمت کی راہنمائی ملتی ہے،اسی لئے ہر دور اور ہر زمانہ میں بزرگان دین کے تذکار و حکایات کے لکھنے اور بیان کرنے کا اہتمام ہوا ہے۔ان اہتمام کرنے والوں میں سے زمانہ قریب کی ایک صالح ہستی حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی نوراللہ مرقدہ کے ذکر صالحین سے شغف کو اس مجلس میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

برگان دین کے واقعات ،ان کے تذکرے اوران کی سوانح عمریاں حضرت مولانا کی زندگی کا اہم جز رہی ہیں، بلکہ کہنا چاہئے کہ یہ چیزیں ان کے لئے مثل ہوا و پانی کے تھیں،انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''مجھے بچپن سے بزرگوں کے تذکروں اور سوانح عمریوں سے شغف ہے بلکہ عشق ہے، اس موضوع پر لکھا ہوا ایک ایک حرف پڑھتا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ مکتب کے دوسرے یا تیسرے درجہ میں تھا،تو میرے استاذ حضرت مولوی محمد یوسف صاحب علیہ الرحمہ نے ''سیرۃ الصدیق'' نامی ایک چھوٹا سا رسالہ پڑھایا تھا۔اس سے مجھے اتنی دلچسپی ہوئی ، کہ بار بار پڑھ کر بھی سیری نہیں ہوتی تھی ، پھراس کے بعد سلسلہ چل پڑا۔رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھ ڈالیں ، اسی وقت میں نے علامہ شبلی کی ''الفاروق'' اتنی مرتبہ پڑھی کہ اس کے

مضامین اور اس کے جملے حفظ ہوگئے پھر اللہ ہی جانتا ہے کہ اس وقت سے اب تک کتنے تذکرے، سوانح عمریاں پڑھ چکا ہوں۔ اس راستے سے بزرگوں سے محبت پیدا ہوئی، قلب میں اس محبت کا رسوخ ہوا۔

جن کو حضرت مولانا کی شاگردی کا شرف حاصل ہے یا پھر ان کی صحبت اٹھائے ہوئے ہیں وہ بخوبی اس سے واقف ہوں گے کہ ان کی کوئی مجلس، کوئی گفتگو، وعظ وتقریر، درس وتدریس بزرگان دین کے تذکرے سے خالی نہیں ہوتی تھی، اس کثرت سے بزرگان دین کا تذکرہ کرتے تھے کہ ایک زمانہ میں ان کے کچھ خاص دوستوں نے ان کا نام ہی ''تذکرۃ الاولیاء'' رکھ دیا تھا، اور یہ سچ بھی ہے کہ وہ چلتے پھرتے تذکرۃ الاولیاء'' تھے۔

بزرگان دین کے تذکرہ کے وقت ان پر ربودگی سی کیفیت طاری ہوجاتی تھی، ہر چیز فراموش ہوجاتی تھی، پھر وہ ہوتے اور تذکرے ہوتے۔ مولانا مسلم صاحب کے تذکرے میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

''مولانا کو اپنے اکابر سے بے حد لگاؤ تھا۔ ان کا تذکرہ چھڑ جاتا تو کسی طرح انھیں سیری نہ ہوتی۔ میرا طبعی ذوق بھی یہی ہے، میں کبھی مجلس میں بزرگوں کا تذکرہ چھیڑ دیتا اور بے تکان ان کے احوال وواقعات اور اقوال بیان کرتا، کبھی گھنٹوں یہ سلسلۂ بیان جاری رہتا مگر مولانا پہلو نہ بدلتے بلکہ یکساں دلچسپی اور انشرح کے ساتھ سنتے، میں رکتا تو مزید کوئی بات چھیڑ کر سلسلہ دراز کردیتے کبھی کبھی صراحۃً فرمائش کرتے کہ بزرگوں کے احوال وواقعات سناؤ اور میرا یہ حال ہوتا کہ ''دیوانہ راہوئے بس است'' شروع ہوجاتا۔

''ایک مرتبہ غازی پور میں وہیں کے ایک استاذ میرے محبوب دوست جناب قاری شبیر احمد صاحب...... جو ازراہ ظرافت کبھی کبھی مجھے تذکرۃ الاولیاء کے نام سے یاد کیا کرتے تھے...... کے کمرے میں ہم لوگ موجود تھے۔ حضرت مولانا صدر مجلس تھے، کسی تقریب سے بزرگوں کا تذکرہ چھڑ گیا اور میں دیر تک اسی مبارک ذکر میں محو ومنہمک رہا۔ مولانا بھی اسی انہماک سے سنتے رہے، مولانا پان کھانے کے عادی تھے مگر اس وقت گفتگو کی محویت میں کسی کو پان کا خیال نہ رہا خود مولانا بھی بھولے ہی رہے، بہت دیر کے بعد میں خاموش ہوا تو فرمایا:

’’قاری صاحب! اتنی اچھی باتیں سنی ہیں اب تو پان کا استحقاق ہو گیا ہے، سب لوگ ہنس پڑے اور پان کا دور چل پڑا‘‘۔

میرا بھی اس سلسلہ کا ایک مشاہدہ سنتے چلئے۔ حضرت مولانا جب ڈائلیسیس کے سلسلہ میں ممبئی میں مقیم تھے، اسی وقت ان کے استاذ حضرت مولانا زین العابدین صاحب بھی بغرض علاج ممبئی آئے ہوئے تھے، حضرت مولانا ان کی مدت قیام میں کئی مرتبہ ملنے گئے، ایک مرتبہ مجھے بھی ساتھ لے گئے، مولانا کو کینسر کا مرض تھا، اور مولانا کو بھی اندیشہ ہو چلا تھا کہ اب وہ اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکیں گے، اسی مناسبت سے ان کی مجلس شوق لقاء الٰہی کی باتوں سے اور اس کی مسرتوں سے لبریز ہوا کرتی تھی، اور ایک گونہ مسرت کی لہریں بھی ان کی چہرے سے ہویدا تھیں، اس کیفیت کو دیکھنا تھا کہ حضرت مولانا کے تذکرہ صالحین کی حس جاگ اٹھی، وہاں سے اٹھے تو مجھ سے کہا کہ بیٹے! مولانا کے چہرے کو دیکھ رہے تھے، کیسا لقاء الٰہی کی خوشی میں دمک رہا تھا؟ اس کے بعد بزرگان پیشیں کے دم واپسیں کے واقعات سنانا شروع کر دیئے، پورے راستے قصص بزرگاں کا سلسلہ چلتا رہا، اس میں اتنی محویت ہوئی کہ گھر کا آنا بھی فراموش ہو گیا، ڈرائیور نے جب گاڑی روک کر متنبہ کیا تب خیال آیا، تھوڑی دیر کے لئے سلسلہ ٹوٹا، گھر پہونچ کر پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا، تقریباً ایک گھنٹہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا، ظہر کی اذان ہوئی تو قصص اکابر کا باب بند ہوا، اور ظہر کی نماز پڑھی گئی۔

مولانا زین العابدین صاحب کے انتقال کے بعد ان کی اس کیفیت کو اس ذوق وشوق اور محبت کے ساتھ ایک مضمون میں بیان کیا ہے کہ پڑھ کر پہلوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس مضمون سے خود صاحب مضمون کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا قلب یاد الٰہی اور بزرگوں کی عظمت سے کس درجہ معمور تھا۔

اگر کہا جائے کہ تذکرہ بزرگاں مولانا کا وظیفہ حیات تھا تو غلط نہیں ہوگا، زمانہ قدیم اور ماضی قریب کے بزرگوں کے واقعات اس کثرت سے ان کو یاد تھے کہ حیرت ہوتی تھی، موضوع گفتگو چاہے جو ہو، ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ اس موضوع پر چند واقعات نہ سنائیں، بزرگان دین سے ان کی یہ دلچسپی صرف واقعات تک محدود نہیں تھی بلکہ ان کے احوال وکوائف بھی ازبر تھے، جہاں کسی

نے کسی بزرگ کے بارے میں پوچھا، ان کے احوال وکوائف اور حالات زندگی اور ان کے بارے میں دوسرے لوگوں رائیں بیان کرنا شروع کر دیتے، کبھی کبھی تو حیرت ہوتی کہ اس تفصیل کے ساتھ یہ چیزیں ان کو کیسے یاد ہیں؟۔

زمانہ قریب کے دو بزرگ جن کی قربت کا لطف مولانا اٹھائے ہوئے تھے، ایک حضرت مولانا محمد احمد صاحب نوراللہ مرقدہ اور دوسرے حضرت مولانا قاری صدیق صاحب نوراللہ مرقدہ، ہر دو حضرات کا تذکرہ بکثرت اور تسلسل کے ساتھ کیا کرتے تھے، ان کے الطاف وعنایات جو مولانا کی ذات پر تھی، ان کا حلم وعفو، ان کی بے نفسی وسادگی، ان کی عبادت گزاری وشب بیداری، ان کے ورع وتقوی کی داستان ہمیشہ سنایا کرتے تھے، کئی مرتبہ میں نے دیکھا کہ ان کا تذکرہ کرتے کرتے آواز بھرا گئی، طبیعت بے چین ہوگئی، اور آنکھوں سے اشکوں کے موتی ٹپکنے لگے۔

اپنے شیخ حضرت مولانا عبدالواحد صاحب مدظلہ کا تذکرہ مجھ سے بہت کیا ہے، خلوت و جلوت ہر جگہ، جب بھی ان کا تذکرہ ہوا ہے میں نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ آواز ضرور رندھی اور گلو گیر ہوئی ہے، خاص طور سے جب ان کے تحمل اور ان کی سادگی کو بیان کرتے تو ضرور اشکوں کے سوغات لٹاتے۔

والد صاحب کا آخری حج جس میں مَیں بھی ساتھ تھا، ایک مرتبہ حرم میں ایک ستون سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے، ساتھ میں صرف میں تھا، بقیہ لوگ سعی وطواف میں مشغول تھے، نہ جانے کس مناسبت سے شعر وشاعری کا ذکر چھڑ گیا، اکبرالہ آبادی کے اس شعر سے بات چلی۔

الا یاایہاا لطفلک بجو راہک بناولہا
کہ قرآں سہل بوداول ولے افتادمشکلہا

اور جگر کے اس شعر تک بات پہونچی۔

میرا کمال عشق بس اتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پہ چھا گیا

اس شعر کا ذکر ہونا تھا کہ طبیعت پھڑک اٹھی، پے در پے بزرگوں کے کمال عشق کے کئی واقعات سنائے، اور بتلایا کہ کیسے ان پر اللہ ورسول چھا گئے اور یہ لوگ پورے جہاں پر چھا گئے۔

بات چلتے چلتے ان کے شیخ حضرت مولانا عبدالواحد صاحب مدظلہ تک پہونچی، ان کا ذکر آنا تھا کہ آواز گلوگیر ہوگئی، بہت دل گرفتہ ہوئے، کہنے لگے کہ ہر سال حضرت حج کے لئے آیا کرتے تھے، اس سال علالت کی وجہ سے نہیں آسکے، اگر آئے ہوئے تو ان سے ملاقات ہوتی، ان کی مجلس میں بیٹھتے، اور تم بھی ان سے ملاقات کر لیتے، ان سے دعا کرا لیتے۔

گزشتہ سطروں میں آپ نے پڑھا کہ مولانا کو بچپن ہی میں جب وہ حرف شناسی کے منزل میں تھے، تذکرہ صالحین سے عشق ہوگیا تھا، عمر کی منزلیں طے کرنے کے ساتھ یہ عشق بھی دم بدم عروج پذیر رہا، ان کی زندگی کا کوئی حصہ اس کار خیر سے خالی نہیں رہا، حرف شناسی کی منزل سے گزر کر جب انہوں نے قلم اٹھایا تو اس سلسلہ میں مزید توسع پیدا ہوئی، جو تذکرہ ابھی تک زبان اور دل ودماغ تک محدود تھے، اب قلم کے راستے دل سے ٹپک کر صفحات پر مرتسم ہونے لگے۔

مولانا نے جو سب سے پہلا مفصل کتابی صورت میں تذکرہ لکھا وہ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہ کا تذکرہ ہے، جو حیات مصلح الامت کے نام سے ۱۴۰۶ھ میں شائع ہوا، اس کے بعد تو بہت سے صلحا کے تذکرے مولانا قلم سے نکلے، بعض مفصل اور بعض کتابچے کی صورت میں۔ بیشتر تذکرے مضامین کی صورت میں لکھے گئے اور کسی رسالہ کی زینت بنے۔

مولانا تفصیلی تذکروں میں سرفہرست حیات مصلح الامت ہے، اس کے علاوہ ''تذکرہ شیخ ہالیجوی'' عارف باللہ حضرت مولانا حماداللہ صاحب ہالیجوی کی سوانح۔ ''حیات سراج الامت'' حضرت مولانا سراج صاحب امروہوی خلیفہ حضرت تھانوی کی سوانح۔ ''ذکر جامی'' حضرت مولانا عبدالرحمان صاحب جامی خادم خاص مولانا وصی اللہ صاحب کی سوانح۔ ''تذکرہ مولانا عبدالقیوم صاحب فتح پوری'' اور حضرت چاندشاہ صاحب اور ان کا خانوادہ تصوف۔

مولانا جب غازی پور میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے اس وقت ایک سلسلہ مضامین ''نمونے کے انسان'' کے نام سے شروع کیا، جس میں بزرگان دین کے واقعات و حکایات ہوتی تھیں، اور اس کی قسطیں مجلّہ ''الریاض'' گورینی میں شائع ہوتی رہیں، یہ سلسلہ لمبی مدت تک چلا، اس کے بعد جب مجلّہ ''المآثر'' کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی تو اس میں بھی

وفیات کے عنوان سے تذکروں کا سلسلہ شروع کیا، اور بہت بزرگان دین جن کو مولانا نے دیکھا اور برتا تھا، ان کا ذکر خیر المآثر کے صفحات میں کیا۔

اس کے بعد جب مولانا کی سرپرستی میں ماہنامہ ضیاء الاسلام کا اجرا ہوا تو یہ تذکرے المآثر سے منتقل ہوکر ضیاء الاسلام کی زینت بننے لگے۔

قلم وقرطاس سے ایک گونہ بعد کے باوجود مولانا کو تذکرہ لکھنے سے شغف تھا، کوئی بھی صالح ہستی جس کو انہوں نے دیکھا اور برتا ہو، ان کا ذکر خیر ضرور کرتے اور بہت محبت واپنائیت کے ساتھ کرتے، تذکرہ لکھنے میں ان کے یہاں بڑے اور چھوٹے کی کوئی تفریق نہیں تھی، جیسا کہ عموماً دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی بڑے کی وفات پر سارے لوگ اپنا قلم لے کر دوڑ پڑتے ہیں، اور ان کے ذکر سے اپنا قد اونچا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کے برعکس اگر نسبتاً کسی غیر معروف آدمی کی وفات ہوجائے تو انہیں لوگوں کا قلم چھوٹا اور فرصت قلیل ہوجاتی ہے، اور ایسی سردمہری برتتے ہیں جیسے اس بیچارے کی کوئی خدمت ہی نہیں ہے۔ مولانا ہر صالح انسان ..... جس سے ان کی شناسائی ہوتی تھی ..... کا تذکرہ لکھتے تھے، چاہے وہ معروف یا غیر معروف یا پھر بالکل ہی گمنام ہو۔ مولانا کی تذکروں کی کتاب ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' میں بہت سے ایسے لوگوں کا ذکر خیر ہے جس کو پڑھنے والا اول وآخر ان کو صرف انہیں صفحات پر دیکھتا ہے، اس کے علاوہ کہیں ان کا نام ونشان تک نہیں پاتا۔

اخیر میں تذکروں سے شغف کا ایک چشم دید نمونہ لکھ دینا مناسب معلوم ہورہا ہے۔ ڈائلیسیس شروع ہونے سے پہلے مولانا کو بہت زیادہ کمزوری اور نقاہت رہا کرتی تھی، کھانا پینا چھوٹ گیا تھا، مسلسل متلی کی شکایت رہا کرتی تھی، جس کی وجہ سے لکھنے کا کام معرض التوا میں پڑ گیا، اور مہینوں یہ کیفیت رہی، اسی دوران کئی برگزیدہ ہستی اس دنیا سے رخصت ہوئیں، خصوصاً مولانا کے استاذ حضرت مولانا افضال صاحب جوہر قاسمی اور مولانا کے دیرینہ رفیق مولانا فاروق صاحب حیدرآبادی۔ ان حضرات کے وفات کے صدمے نے مولانا کو اور بھی لاغر بنادیا، مولانا کی دیرینہ روایت کے مطابق ان کا تذکرہ لکھنے کا داعیہ شدت کے ساتھ پیدا ہوتا، مگر صورت حال یہ تھی لکھنا تو دور کی بات تھوڑی دیر بیٹھنا بھی مشکل تھا، پھر جب ڈائلیسیس شروع ہوئی اور روبصحت

ہوئے، گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھنے کی سکت ہوگئی اور کچھ لکھنے کے لائق ہوگئے تو سب سے پہلا کام یہی کیا کہ ان کا تذکرہ لکھا، حالانکہ اس کے علاوہ بھی بہت سے ضروری لکھنے کے کام تھے، مثلاً تسہیل الجلالین کا کام، بلکہ ایک مرتبہ میں نے پوچھا بھی کہ تسہیل الجلالین کا کام کب شروع کریں گے؟ اس کو جلد ہی شروع کردینا چاہئے، تو فرمایا کہ پہلے یہ قرضے ادا کرلوں اس کے بعد تسہیل الجلالین پر ہاتھ لگاؤں گا۔

اسی وقت مولانا نے یہ بھی تہیہ کیا تھا کہ اپنے محبوب استاذ حضرت مولانا افضال صاحب جوہر قاسمی کی مفصل سوانح لکھیں گے، اوراس کے لوازمات بھی اکٹھا کرلئے تھے مگر افسوس کہ یہ کام شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوگیا۔

قلم وقرطاس کی اس جدائی کے بعد (جس کا ابھی تذکرہ ہوا ہے) مولانا نے جب قلم اٹھایا تو بہت سے لوگوں کے تذکرے لکھے۔ مولانا افضال صاحب کا مفصل تذکرہ لکھا، مولانا زین العابدین صاحب پر تین تفصیلی مضامین لکھے، مولانا فاروق صاحب حیدرآبادی پر لکھا، اپنے ہم وطن دوست حافظ عیسیٰ صاحب کا تذکرہ لکھا، مولانا کے خصوصی جواں مرگ شاگرد مولانا ثناء اللہ صاحب کا ایک حادثہ میں انتقال ہوگیا تھا، جس کا مولانا قلب پر خاصا اثر رہا، ان کا بھی تذکرہ لکھ کر دل کا بوجھ کچھ ہلکا کیا۔

بہت سے مرحومین کو کتابوں کے صفحات پر زندگی عطا کرنے والے ہمارے مولانا نے بھی بالآخر ۲۸/ستمبر ۲۰۱۳ء کو اپنی زندگی کا سفر مکمل کیا، اور آخرت کی منزل پر پہونچ کر کمر کھول دی، انہوں نے تاحیات صالحین کے تذکرے کئے اور ان کی حیات وخدمات پر لکھتے رہے، ان کو دنیا سے روشناس کراتے رہے۔ دعا ہے کہ ان کا یہ وظیفہ حیات ان کے شاگرد اور ان کی اولاد کے توسط سے ہمیشہ قائم ودائم رہے اور تذکرہ صالحین جو مہم انہوں نے چھیڑ رکھی تھی، وہ ہمیشہ باقی رہے، اوران کے لئے بہترین صدقہ جاریہ بنے۔ آمین

محمد عرفات اعظمی

۲۰۱۵/۸/۱۶

حبِ نبوی

بارگاہ نبوت سے لگاؤ:

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے فرمایا:

''علامہ علاؤ الدین حصکفی (متوفی ۹۸۸ھ) اپنی کتاب ''الدرالمختار'' کو لے کر روضہ اقدس نبوی پر حاضر ہوئے، اور ورق گردانی کرتے رہے اور دعا کرتے رہے، میں نے جب معارف القرآن کی پہلی جلد مکمل کی تو مدینہ منورہ حاضری ہوئی، روضہ اقدس پر حاضر ہوا، معارف القرآن کی جلد اول میرے ساتھ تھی، مگر مجھے کھول کر ورق گردانی کی جرأت نہیں ہوئی، البتہ معارف القرآن کی جلد اول بغل میں تھی اور میں روضہ اقدس پر اس کی مقبولیت کی دعا مانگتا رہا۔

(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ۲۔ ص ۹۹۴)

اتباعِ نبوی:

امیر شاہ خان صاحب نے فرمایا کہ مولوی اسماعیل صاحب کاندھلوی (والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاس صاحب) نہایت سیدھے متبع سنت بزرگ تھے، میں ان سے بہت مرتبہ ملا ہوں، لیکن جب کبھی ملاقات ہوتی تو وہ یہ ضرور فرماتے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب کسی سے کسی کو محبت ہو تو اسے چاہیئے کہ اس کو اطلاع کر دے، اس لئے میں بہ تعمیل ارشاد نبوی تم سے کہتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ یہ ان کا ہر ملاقات میں معمول رہا، اور کبھی اس میں تخلف نہیں ہوا۔

(ارواح ثلاثہ ص ۱۶۶)

گلاب سے محبت:

ایک مرتبہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرین مجلس سے فرمایا کہ مولانا قاسم کو گلاب سے زیادہ محبت تھی، جانتے بھی ہو کیوں؟ ایک صاحب نے عرض کیا ایک ضعیف حدیث میں آیا

ہے کہ گلاب جناب رسول اللہ ﷺ کے عرق مبارک سے بنا ہوا ہے۔ فرمایا: ہاں، اگر چہ حدیث ضعیف ہے مگر ہے تو حدیث۔ (ارواح ثلاثہ۔ ص ۲۱۶)

نسبت نبوی سے تعلق:

حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ مدنی کھجوروں کی گٹھلیاں پسوا کر صندوقچہ میں رکھ لیتے تھے، اور کبھی کبھی سفوف بنا کر پھانکا کرتے، ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ لوگ حرمین شریفین کی چیزوں زمزم کے ٹین اور تخم خرما کو یونہی پھینک دیتے ہیں، یہ خیال نہیں کرتے کہ ان چیزوں کو مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کی ہوا لگی ہے۔ مولوی اسماعیل صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مدنی کھجور کی گٹھلی پسی ہوئی حضرت نے صندوقچہ سے نکال کر مجھے عطا فرمائی کہ لو اس کو پھانک لو، ایک مرتبہ مدینہ منورہ کی املی مجھے کھلائی اور ایک مرتبہ مدینۃ الرسول کی مٹی عطا فرمائی کہ اس کو کھالو، میں نے عرض کیا کہ مٹی کھانا تو حرام ہے، تو فرمایا کہ ’’میاں وہ مٹی اور ہوگی‘‘۔ (تذکرۃ الرشید۔ ج ۲۔ ص ۴۸)

حرمین شریفین سے آئے ہوئے تبرکات جب آپ تقسیم فرماتے تو چہرۂ مبارک پر بشاشت اور آواز کے لہجے میں مسرت وانبساط محسوس ہوتا تھا، آپ کا دل چاہتا تھا کہ دوسرے بھی ان اشیاء کا احترام کریں۔ ایک مرتبہ مولوی حسین احمد صاحب مہاجر مدنی نے ایک گھڑا بھر کر (مسجد نبوی) کا غسالہ شریفہ بھیجا، جس دقت اور اہتمام کے ساتھ گنگوہ پہونچا ہوگا، وہ ظاہر ہے، آپ نے اس کے پہونچتے ہی اس کو کھلوایا اور سبیل لگوادی، اس دن جو بھی آیا جواب سلام کے بعد آپ کا ارشاد ہوتا تھا ’’میاں مولوی یحییٰ ان کو بھی پلاؤ‘‘ بندہ بھی خوش نصیبی سے اس دن جا پہونچا اور تبرک سے فیضیاب ہوا۔

حضرت امام ربانی کا جی چاہتا تھا کہ ہر مسلمان حق تعالی اور اس کے رسول کی اس درجہ محبت لئے ہوئے ہو کہ حرمین کی ہوا لگی ہوئی اشیاء کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہوں۔ مولوی محمد اسماعیل صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا نے موم بتی کا ذرا سا ٹکڑا مجھے عطا فرمایا اور کہا کہ ’’اس کو نگل جاؤ‘‘ اور ایک بار کعبہ کے ریشم کا ایک تار ایثار فرمایا اور کہا کہ ’’کھالو‘‘۔

(تذکرۃ الرشید۔ ج ۲۔ ص ۴۹)

خلاف سنت پر خفگی:

ایک دفعہ ایک صاحب تشریف لائے، حضرت (گنگوہی) اس وقت بیت الخلا تشریف لے گئے تھے، آنے والے مسافر کچھ ایسے مغرور وجری تھے کہ بیٹھے ہوئے مجمع سے نہ سلام نہ دعا، مونڈھا اٹھا کر سب سے آگے بڑھے، حضرت کی چارپائی کے پاس جا بیٹھے، حضرت استنجا سے فارغ ہوکر تشریف لائے تو دور ہی سے انہوں نے پکارا ''جناب آداب'' حضرت نے بے ساختہ جواب دیا، کون بے ادب ہیں؟ جن کو شریعت کا ایک ادب بھی نہیں معلوم''۔ ایک مرتبہ ایک صاحب اور آئے اور بولے ''حضرت سلامت'' آپ کے چہرے پر غصہ کا اثر ظاہر ہوا، اور فرمایا کہ مسلمانوں والا سلام چاہئے، یہ کون ہے حضرت سلامت والا؟ اس شخص نے عرض کیا میں کچہری میں رہتا ہوں، وہی عادت ہے، آپ نے فرمایا کہ یہاں تو کوئی کچہری نہیں ہے بھائی، میں تو فقیر آدمی ہوں۔ (حضرت کی ظاہری بینائی اس وقت جا چکی تھی)۔ (تذکرۃ الرشید۔ ج ۲۔ ص ۴۹)

سنت نبوی سے عشق:

حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کا سنت مصطفویہ کے ساتھ عشق اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ آپ کو عربی مہینے چھوڑ کر بلا ضرورت انگریزی مہینوں کا استعمال بھی گراں گزرتا تھا۔ مولوی محمد اسماعیل صاحب حضرت کی خدمت میں حاضر تھے کہ کسی شخص نے پوچھا کہ گوالیار کب جاؤ گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ جولائی کی فلاں تاریخ کو، حضرت مولانا نے تأسف کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ اور ماہ و تاریخ نہیں ہے جو انگریزی مہینوں کا استعمال کیا جائے؟۔ (تذکرۃ الرشید۔ ج ۲۔ ص ۵۰)

حدیث نبوی کی تعظیم:

ایک مرتبہ نواب صاحب (نواب ابراہیم خان والی ریاست ٹونک) مولانا سید مصطفیٰ صاحب (نواسۂ سید احمد شہید) کے درس حدیث میں تشریف لائے، آپ نے ان کی کوئی تعظیم نہ کی، درس کے بعد فرمایا کہ ''نواب صاحب میں اس وقت رسول اللہ ﷺ کی حدیث پڑھا رہا تھا، اس لئے میں اس کو چھوڑ کر آپ کی تعظیم نہ کرسکا''۔ (کاروان ایمان و عزیمت۔ ص ۱۶۹)

☆☆☆☆☆☆

ذوق عبادت وذکر

ذکر وعبادت:

حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب کے زمانے میں دارالعلوم دیو بند کا کام بہت پھیل گیا تھا، بہت سے شعبے قائم ہو چکے تھے، اور سینکڑوں طلبہ دارالاقامہ میں رہتے تھے، اس لئے مولانا شب وروز انتظامی کاموں میں مصروف رہتے تھے، اس کے باوجود ان کی نوافل اور تلاوت وغیرہ کے علاوہ روزانہ سوا لاکھ مرتبہ ذکر اسم ذات کا معمول کبھی قضا نہیں ہوا۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ا۔ص ۲۷۶)

جماعت اور مسجد کا اہتمام:

مجھے یاد ہے کہ دیو بند میں جب میری عمر تقریباً دس بارہ سال تھی، ایک دن فجر کی نماز کے وقت سخت آندھی، موسلا دھار بارش اور گرج چمک کی بنا پر والد صاحب (مفتی محمد شفیع صاحب) مسجد تشریف نہ لے جا سکے اور نماز گھر میں ہی ادا فرمائی، ادھر دادا ابا جو مسجد کے عاشق اور نماز با جماعت کے شیدائی تھے، اسی حالت میں پائینچے چڑھا کر مسجد کی جانب روانہ ہو گئے، اور والد ماجد کو بارش کی وجہ سے ان کے جانے کا پتہ نہ چل سکا، دادا ابا جب مسجد پہونچے تو دیکھا کہ بجز موذن کے کوئی دوسرا شخص موجود نہیں ہے، خیر موذن کے ساتھ دو آدمیوں کی جماعت ہوئی، اور بعد نماز جب دادا ابا گھر لوٹنے لگے تو سب محلے والوں کو ان کے گھروں سے اٹھا کر ساتھ لیتے ہوئے سخت غصے میں گھر پہنچے اور والد صاحب کو بلا کر سب کے سامنے اس قدر ڈانٹا کہ والد صاحب اور سب محلے والے دم بخود رہ گئے، اور فرمایا: افسوس ہے کہ مجھے اپنی زندگی میں ایسا دن دیکھنا پڑا، جس کی مجھ کو تم سے توقع نہ تھی، آج اگر میں نہ پہونچتا تو مسجد ویران ہو جاتی، اور جماعت نہ ہوتی، میرے بعد تو تم اس مسجد کو ویران ہی کر دو گے، مجھے افسوس تو سب پر ہے، لیکن سب سے زیادہ اپنے اس بیٹے

پر ہے،اور بھی نہ جانے کیا کیا کہا؟ دادا ابا کو دنیا میں والد صاحب سے بڑھ کر کوئی عزیز نہ تھا،مگر ترک جماعت پر اس قدر گرفت فرمائی اور تمام محلّہ والوں اور چھوٹی اولاد کے سامنے، یہ حضرت والد صاحب کی انتہائی سعادت مندی تھی کہ انہوں نے ذرا بھی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا، بلکہ ندامت اور شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے سب کے سامنے معافی مانگی، بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ اگر اس دن اتنی لتاڑ نہ پڑتی تو عمر بھر احساس نہ ہوتا کہ ہم سے کوئی غلطی سرزد ہوئی تھی۔(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ۲۔ص ۱۰۶۹)

سفر میں عبادت کا معمول:

مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی عموماً پیدل سفر کرتے تھے،اور سامان سفر لوٹا، لنگی، لکڑی، مشکیزہ ہوتا تھا، جہاں شام ہوجایا کرتی تھی وہیں شب بسر کرتے تھے۔ایک مرتبہ شام ایک ایسے گاؤں میں ہوئی جہاں سب ہندو تھے،کوئی مسلمان نہ تھا، وہاں والوں سے کہا کہ رات کو رہنے کے لئے جگہ بتادو، ایک شخص نے گاؤں کے باہر کولھو پر بتادیا،آپ کے پاس روٹی تھی ،اس کو نوش فرمایا، اتفاقاً وہی شخص رات کو کسی کام سے جنگل میں آیا تو حضرت کو قرآن پڑھتے سنا، تمام شب بیتابی میں گزار دی، اور صبح کو حاضر خدمت ہوکر عرض کیا کہ رات جو تو پڑھ رہا تھا وہ جلدی سے مجھے بھی پڑھا دے، اس کے بعد آپ کو اپنے گھر لے گیا اور وہاں اس کے بیوی بچے سب مسلمان ہوگئے۔(ارواح ثلاثہ۔ص ۱۵۷)

ذوق عبادت:

رمضان المبارک میں حضرت شیخ الہند کے یہاں عبادت کا اہتمام بہت بڑھ جاتا تھا، پوری رات مصروف عبادت رہتے ،تراویح کے بعد حاضرین سے کچھ دیر خطاب فرماتے ، ظاہر ہے کہ گفتگو دین و مذہب اور تعلق مع اللہ کے دائرے سے باہر نہ ہوتی ہوگی، اس کے بعد چند منٹ آرام فرما کر پھر نوافل کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ مولانا خود حافظ قرآن نہ تھے، کوئی دوسرا سناتا، دو چار پارے پڑھ کر ایک حافظ آرام کرتا تو دوسرا شروع کردیتا، حافظ بدلتے رہتے لیکن مولانا اپنی جگہ جمے رہتے ،تمام رات یہی اہتمام رہتا، جذب وشوق کا یہ پیکر باری تعالی کے حضور کھڑا رہتا یہاں تک ”حتی تو ارت قدماہ“ کی سنت نبوی پر عمل کی صورت پیدا ہوجاتی۔

آخر عمر میں جب قویٰ ضعیف ہوگئے تھے، عبادت کے انہماک میں اس وقت بھی کمی نہ آئی تھی، زیادہ کھڑے رہنے سے پاؤں پر ورم آجاتا، لیکن صحت و مرض سے بے نیاز ہوکر یہ بندہ اپنے مولا کے حضور مصروف راز و نیاز ہوتا۔

ایک مرتبہ رمضان المبارک میں پاؤں پر ورم آیا ہوا تھا، اس کے باوجود زیادہ سے زیادہ قرآن سننے کے لئے مستعد تھے، تکلیف کا خیال کر کے مستورات نے مولوی حافظ کفایت اللہ صاحب کے پاس کہلا بھیجا کہ آج کسی بہانے سے کم مقدار میں پڑھائیں، انہوں نے تھوڑا پڑھ کر کسل مندی اور گرانی کا عذر کردیا، مولانا بھی آرام کے لئے چلے گئے، اور خود حافظ صاحب بھی آرام کرنے لگے، تھوڑی دیر کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ کوئی آہستہ آہستہ ان کے پاؤں دبا رہا ہے، دیکھا تو خود حضرت شیخ الہند تھے، حافظ صاحب کے چہرے پر شرمندگی کے آثار دیکھ کر مولانا نے فرمایا کہ ''بھائی کیا حرج ہے؟ تمہاری طبیعت اچھی نہیں، ذرا راحت آجائے گی''۔

معمولات عبادت میں مالٹا کی اسارت اور قید و بند بھی کچھ تبدیلی نہ کراسکی، شب میں عموماً ایک یا ڈیڑھ بجے تک اٹھ جاتے، پیشاب کے لئے جاتے پھر آکر وضو فرماتے اور نوافل میں مشغول ہوجاتے، نوافل سے فارغ ہوکر مراقبہ، ذکر خفی میں مشغول رہتے، ہزار دانہ تسبیح سرہانے رہتی، اسے بھی التزام سے پڑھتے تھے، مولانا موصوف کو سردی برداشت نہ ہوتی تھی، لیکن اس کے باوجود عبادت کے اس انہماک میں کبھی بھی فرق نہ آیا، رات کے علاوہ دن کے بھی مختلف اوقات کو اوراد و وظائف میں صرف فرماتے۔ (تذکرۂ شیخ الہند۔ ص ۱۵۴)

تکبیر اولی کا اہتمام:

دیوبند کے جلسہ دستار بندی میں جب آپ (مولانا رشید احمد گنگوہی) تشریف لائے تو غالباً عصر کی نماز میں ایک دن ایسا اتفاق پیش آیا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب نماز پڑھانے کو مصلی پر جا کھڑے ہوئے، مخلوق کے ازدحام اور مصافحہ کی کثرت کے باعث باوجود عجلت کے جس وقت آپ جماعت میں شریک ہوئے ہیں، قرأت شروع ہوگئی تھی، سلام پھیرنے کے بعد دیکھا گیا اداس اور چہرہ پر اضمحلال برس رہا تھا، اور آپ رنج کے ساتھ یہ الفاظ فرما رہے تھے کہ افسوس بائیس برس کے بعد آج تکبیر اولی فوت ہوگئی۔ (تذکرۃ الرشید۔ ج ۲۔ ص ۱۶)

دعا کا اہتمام:

جن دنوں مشکوۃ شریف کا درس حضرت سید احمد شہید قدس سرہ کے لشکر میں ہوتا تھا، ایک روز سید صاحب نے مولانا اسماعیل صاحب سے فرمایا کہ یہاں صاحب دل میں آتا ہے کہ اب چندروز جناب الٰہی میں خوب سب مل کر دعا کریں، مگر اس طرح کہ ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اکیلے دعا کریں، اور آپ سب بھائیوں کو لے کر کہیں جنگل میں دعا کریں، مولانا موصوف نے فرمایا کہ بہت بہتر، میں حاضر ہوں، سید صاحب نے عصر کا وقت مقرر کیا، ہر روز نماز عصر سے فارغ ہوکر سید صاحب ایک کوٹھری میں اکیلے بیٹھ کر دعا کرتے تھے، اور مولانا صاحب سب غازیوں کو اپنے ہمراہ لے کر بستی کے باہر ایک نالے پر جاتے تھے، پہلے آپ سب لوگوں کی طرف مخاطب ہوکر کچھ دیر وعظ ونصیحت فرماتے تھے، اس کے بعد برہنہ سر ہوکر کمال گریہ وزاری اور عجز وانکسار کے ساتھ جناب باری تعالی میں بہت دیر تک دعا کرتے تھے، اس دعا میں طرح طرح سے اپنی محتاجی وانکسار اور جناب باری کی عظمت وجباری اور رحمت وغفاری بیان کرتے تھے، دعا کے بعد سب کو ہمراہ لے کر سید صاحب کے پاس آتے تھے اور دعا کرنے کا حال عرض کرتے تھے، یہ دعا پانچ سات روز متواتر ہوئی۔ (سیرت سید احمد شہید۔ ج ۲۔ ص ۴۰۳)

توبہ وانابت:

سید ابو محمد صاحب نصیر آبادی، سید احمد شہید قدس سرہ کی اہلیہ کے خالہ زاد بھائی بانکوں میں مشہور تھے، (مہیار کی جنگ کے موقع پر) اپنا گھوڑا تھان پر چھوڑ کر پیادہ پا آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میاں صاحب! جس روز سے میں آپ کے ساتھ گھر سے نکلا ہوں، آج تک میرا خیال یہی رہا ہے کہ یہ میرے عزیز اور رشتہ دار ہیں، میں بھی ان کے ساتھ رہوں، جو ان کو اللہ تعالی عروج دے گا تو ان کی وجہ سے میری بھی ترقی ہوگی، نہ میں آج تک خدا کے واسطے رہا اور نہ کچھ ثواب جان کر، مگر اب میں نے اس خیال فاسد سے توبہ کی اور ازسر نو آپ کے ہاتھ پر اللہ تعالی کی رضا مندی کے واسطے بیعت جہاد کو آیا ہوں، آپ مجھ سے بیعت لیں اور میرے واسطے دعا کریں کہ اللہ تعالی مجھے اس نیت اور ارادے پر ثابت قدم رکھے، آپ نے ان سے بیعت لی اور ان کے واسطے دعا کی، اس وقت تمام حاضرین پر رقت سے ایک عجیب حال واقع تھا کہ ہر ایک کی آنکھ سے

آنسو جاری تھے۔

دعا کے بعد سید ابو محمد صاحب آپ سے مصافحہ کر کے اپنے گھوڑے کی طرف چلے، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، انہوں نے بسم اللہ کر کے داہنا پاؤں رکاب میں رکھا اور بآواز بلند پکار کر کہا کہ سب بھائیو! اس بات کے گواہ رہنا کہ آج تک ہم گھوڑے پر اپنی شان وشوکت اور خواہش نفس کے لئے سوار ہوتے تھے، اس میں کچھ خدا کے واسطے نہ تھا مگر اس وقت ہم محض اللہ تعالی کی خوشنودی ورضا جوئی کے واسطے بہ نیت جہاد اس گھوڑے پر سوار ہوئے ہیں۔ (سیرت سید احمد شہید۔ ج ۲۔ ص ۲۵۰)

مفارقت رمضان کا رنج:

مولوی سید اسماعیل صاحب (فرزند نبیرہ حضرت سید احمد شہید قدس سرہ) بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ عید کی چاند رات کو آدھی رات کے وقت ایک شخص کی دردناک آواز کے ساتھ رونے کی آواز آئی اور یہ معلوم ہوا کہ وہ روتا ہوا ایک طرف کو چلا گیا، معلوم ہوا کہ مولانا سید عرفان (نواسۂ حضرت احمد شہید) تھے اور رمضان المبارک کے اختتام پر اس درد سے روئے تھے۔

(کاروان ایمان وعزیمت۔ ۱۶۷)

بخت بیدار:

حضرت سید احمد شہید قدس سرہ کے قیام دہلی کے اثنا میں رمضان پڑا، اکیسویں شب کو آپ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، اس عشرے کی کس رات میں شب بیداری کر کے شب قدر کی سعادت حاصل کی جائے؟ مولانا نے متبسم ہو کر فرمایا، فرزند عزیز! شب بیداری کا جو روزانہ معمول ہے اسی طرح ان راتوں میں بھی عمل کرو، صرف شب بیداری سے کیا ہوتا ہے؟ دیکھو! چوکیدار اور سپاہی ساری رات جاگتے رہتے ہیں، مگر اس دولت سے بے نصیب ومحروم رہتے ہیں، اگر تمہارے حال پر اللہ کا فضل ہے تو شب قدر میں اگر سوتے بھی رہو گے تو اللہ تم کو جگا کر ان برکات میں شریک کر دے گا۔ یہ سن کر اپنے مسکن پر آ گئے اور عادت کے مطابق شب بیداری کا معمول رکھا، ستائیسویں شب کو آپ نے چاہا کہ ساری رات جاگوں اور عبادت کروں مگر عشا کی نماز کے بعد کچھ ایسا نیند کا غلبہ ہوا کہ آپ سو گئے، تہائی رات کے قریب

دو شخصوں نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر جگایا، آپ نے دیکھا کہ آپ کی دائیں طرف رسول اللہ ﷺ اور بائیں طرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں، اور آپ سے فرمارہے ہیں کہ احمد اٹھ اور غسل کر، سید صاحب ان دونوں حضرات کو دیکھ کر دوڑ کر مسجد کے حوض کی طرف گئے اور باوجودیکہ سردی سے حوض کا پنی یخ ہورہا تھا، آپ نے غسل کیا اور فارغ ہوکر خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت ﷺ نے فرمایا کہ فرزند! آج شب قدر ہے، یاد الٰہی میں مشغول ہو اور دعا و مناجات کرو، اس کے بعد دونوں حضرات تشرف لے گئے۔

صاحب مخزن لکھتے ہیں کہ اس کے بعد سید صاحب بارہا فرمایا کرتے تھے کہ اس رات کو اللہ کے فضل سے واردات عجیب و واقعات غریب دیکھنے میں آئے، تمام درخت اور دنیا کی ہر چیز سجدے میں تھی اور تسبیح وتہلیل میں مشغول، مگر ان ظاہری آنکھوں سے اپنی اپنی جگہ کھڑی معلوم ہوتی تھی، اس وقت فناء کلی اور استغراق کامل مجھے حاصل ہوا، صبح میں شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کیا تو آپ نے بہت مسرور ہوکر فرمایا کہ اللہ تعالی کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج کی شب تم اپنی مراد کو پہونچ گئے، اس وقت سے ترقیات وعلوِ درجات کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ (سیرت سید احمد شہید۔ ج ا۔ ص ۱۲۸)

☆☆☆☆☆☆

علماء کا مقام

کالج کی ملازمت:

دارالعلوم دیوبند کے ایک انتہائی ممتاز مدرس جو حضرت شیخ الہند کے شاگرد بھی تھے، ان کو کسی کالج کی طرف سے اچھی تنخواہ پر مدرسی کی پیش کش ہوئی، انہوں نے حضرت شیخ الہند سے ذکر کیا اور کہا کہ حضرت! ہم یہاں دارالعلوم میں آٹھ آٹھ دس دس گھنٹے پڑھاتے ہیں، باقی وقت مطالعہ میں گزر جاتا ہے اور تصنیف وتالیف یا وعظ وخطابت کے لئے وقت بہت کم ملتا ہے، خیال ہے کہ کالج میں تدریس کا وقت بہت کم ہوگا، اور باقی فارغ وقت میں تصنیف وتالیف اور دوسری دینی خدمات کا زیادہ موقع ملے گا، اس لئے یہ رجحان ہے کہ اس پیش کش کو قبول کرلیا جائے۔

حضرت شیخ الہند نے اس رائے کی مخالفت کی اور فرمایا کہ مولوی صاحب! مجھے امید نہیں ہے کہ وہاں جا کر آپ اتنی دینی خدمات بھی فارغ اوقات میں انجام دے سکیں، جتنی یہاں ہوجاتی ہیں، لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ زیادہ فرصت اور فراغت کے باوجود کام زیادہ کیوں نہیں ہوسکے گا؟ حضرت کی رائے تو نہ تھی لیکن اس کی شدید خواہش دیکھ کر اجازت دیدی، وہ کالج چلے گئے، تقریباً ایک سال کے بعد چھٹیوں میں وہ دیوبند آئے اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت نے سلام اور دریافت خیریت کے بعد پوچھا:

''کیوں مولوی صاحب! اس عرصے میں آپ نے کتنی تصنیف کی؟ کتنے فتوے لکھے؟ کتنے وعظ کہے؟''۔

یہ سن کر وہ صاحب رو پڑے اور کہا کہ حضرت حساب وکتاب کے نقطۂ نظر سے تو آپ کی بات سمجھ میں نہ آتی تھی لیکن تجربے سے سمجھ میں آگئی، واقعہ یہ ہے کہ جتنا کام دارالعلوم میں عدیم الفرصتی کے باوجود ہوجاتا تھا وہاں فرصت کے باوجود اتنا نہ ہوا۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج،اص ۲۳۶)

تدریس اور ثواب:

حضرت مولانا سہول صاحب عثمانی، حضرت شیخ الہند کے ممتاز شاگردوں اور دارالعلوم کے ان مقبول اساتذہ میں سے تھے جن کو بیک وقت حدیث اور فقہ دونوں میں اللہ تعالی نے کمال عطا فرمایا تھا۔ایک مرتبہ انہوں نے حضرت شیخ الہند سے سوال کیا کہ حضرت! ہم دینی علوم پڑھاتے ہیں،اوران پر تنخواہ بھی لیتے ہیں،تو کیا ایسی تدریس پر کچھ ثواب ملے گا؟ حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ مولوی صاحب! ثواب کی بات کرتے ہو،اس تدریس میں جو کچھ کوتاہیاں ہم سے ہوئی ہیں اگران پر مواخذہ نہ ہوتو اسی کو غنیمت سمجھو۔

مفتی شفیع صاحب تشریحاً فرماتے ہیں کہ حضرت کا مقصد یہ نہ تھا کہ تنخواہ لینے کے بعد ثواب کی کوئی امید نہیں، کیوں کہ اگر نیت بخیر ہوتو ان شاء اللہ اس میں ثواب کی امید ہے،لیکن یہ اس وقت ہے کہ جب کہ تنخواہ کا حق پورا پورا ادا کیا ہو،اور اگر مقررہ وقت سے کم پڑھایا، غیر حاضریاں کیں اور پڑھانے کے لئے جس محنت اور مطالعہ کی ضرورت ہے اس میں کوتاہی کی تو تنخواہ کا حلال ہونا بھی مشکوک ہے۔حضرت شیخ الہند نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ۱۔ص ۲۳۷)

کج دماغ لوگ:

ایک مرتبہ مشرقی پاکستان کے بڑے دینی مدرسہ کا جلسہ تھا،جس کے مہتمم صاحب سے حضرت والد صاحب (مفتی شفیع صاحب) کے دیرینہ مراسم تھے،اس جلسے میں انہوں نے اس وقت کے سربراہ مملکت کو بھی مدعو کیا تھا، اتفاق سے اس وقت سربراہ مملکت ایک ایسے صاحب تھے جن سے والد صاحب کو دینی معاملات میں کسی خیر کی توقع نہ تھی،اس لئے آپ نے طے کیا ہوا تھا کہ مجھے ان صاحب سے ملاقات نہیں کرنی ہے، جب جلسے کا دن آیا تو صدر صاحب کی آمد ہوئی تو حضرت والد صاحب نے مدرسہ کے مہتمم صاحب سے فرمایا کہ میں ان صاحب سے نہ ملنا چاہتا ہوں نہ یہ پسند کرتا ہوں کہ ان سے میرا سامنا ہو،اس لئے آپ مجھے کوئی ایسا کمرہ دیدیجئے جہاں میں سو جاؤں،انہوں نے ایک کمرہ حضرت والد صاحب کے لئے مخصوص کردیا،اور آپ وہاں سو گئے، جب صدر صاحب تشریف لائے اور انہیں مدرسہ کا معائنہ کرایا گیا تو معائنہ کے دوران مہتمم

صاحب انہیں اس کمرے پر بھی لائے اور اندر اشارہ کر کے فرمایا کہ اس میں مفتی محمد شفیع صاحب سو رہے ہیں۔

صدر صاحب کے جانے بعد جب مہتمم صاحب نے حضرت والد صاحب سے اس واقعے کا تذکرہ فرمایا تو آپ نے کہا کہ اگرچہ میں نے آپ سے یہ درخواست نہیں کی تھی کہ آپ انہیں میری اس انداز سے موجودگی جتائیں لیکن یہ اچھا ہوا، انہیں معلوم تو ہو کہ ملک میں ایسے ''کج دماغ لوگ'' بھی موجود ہیں۔(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ا۔ص ۴۳۱)

ہمیں بھی تو کسی نے بگاڑا ہی ہے:

ایک نوجوان حضرت حافظ ضامن شہید صاحب کی خدمت میں آتا تھا، حضرت کی برکت سے اس کی حالت کچھ بدلنے لگی، اس کے باپ نے حافظ صاحب سے شکایت کی کہ جب سے لڑکا آپ کے پاس آنے لگا ہے بگڑ گیا ہے، حافظ صاحب نے جوش میں فرمایا کہ ہم کو تو بگاڑنا ہی آتا ہے، ہمیں بھی تو کسی نے بگاڑا ہے، ہم کسی کو بلاتے تھوڑا ہی ہیں، جس کو سنورنا ہو وہ ہمارے پاس نہ آوے، ہمیں تو بگاڑنا ہی آتا ہے۔(ارواح ثلاثہ۔ص ۱۶۴)

شان علم و استغنا:

مولوی حبیب الرحمان صاحب دیوبندی نے فرمایا کہ منشی حمید الدین صاحب فرماتے تھے کہ حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ ایک بزرگ سے ملنے کے لئے ریاست رامپور تشریف لے گئے، ساتھ مولانا احمد حسن صاحب اور منشی حمید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہما تھے، ریل نہ تھی، مراد آباد سے اس طرح چلے کہ خود حضرت پاپیادہ ہو لئے، منشی صاحب کی بندوق اپنے کندھے پر رکھ لی، اور بجبر منشی حمید الدین کو سواری پر بیٹھا دیا، جس نے پوچھا کہ کون ہیں؟ فرما دیتے کہ منشی حمید الدین رئیس سنبھل ہیں، گویا اپنے کو ایک ملازم کی حیثیت سے ظاہر کیا، اس لئے تا کہ خفیہ پہونچیں، جب رامپور پہونچے تو وہاں وارد و صادر کا نام، پورا پتہ وغیرہ داخلہ شہر کے وقت لکھا جاتا تھا، حضرت نے اپنا نام (تاریخی نام) خورشید حسن بتایا اور لکھا دیا، اور ایک نہایت ہی غیر معروف سرائے میں مقیم ہوئے، اس میں بھی ایک کمرہ چھت پر لیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ ''تحذیر الناس'' کے خلاف اہل بدعات میں ایک شور برپا تھا، مولانا کی تکفیریں تک ہو رہی تھیں، حضرت کی غرض اس اخفا سے یہی تھی کہ

میرے علانیہ پہونچنے سے اس بارہ میں جھگڑے اور بحثیں نہ کھڑی ہوجائیں، لیکن مرادآباد کے حضرات نے جب سنا کہ مولانا رامپور تشریف لے جارہے ہیں، اور خفیہ جارہے ہیں، تو انہوں نے کہا کہ غضب ہوگیا، مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی اور وہاں کے تمام اہل معقول یہ اڑائیں گے کہ چھپ کر نکل گئے، اس لئے اہل مرادآباد نے ایک شخص کو رامپور روانہ کردیا، اور اس نے پہونچتے ہی حضرت کی تشریف آوری اور جائے قیام کی عام شہرت دیدی، تمام رامپور میں یہ خبر پھیل گئی، مولانا ارشاد حسین صاحب مشہور معقولی جو حضرت شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد یعنی مولانا کے استاذ بھائی تھے، گو بعض مسائل میں مختلف تھے، ملنے آئے، ایسے ہی ایک مولوی عبدالعلی صاحب منطقی بھی ملنے آئے، اور مولوی ارشاد حسین صاحب نے قیام گاہ کے زینے پر چڑھتے ہوئے اپنے تلامذہ اور دوسرے علما سے کہا کہ اگر رامپور کی عزت رکھنا چاہتے ہو تو اس شخص کو مت چھیڑنا، بہرحال خبر پھیل چلی تھی، لوگ جوق در جوق ملنے کے لئے آنے لگے، اور جب شہرت ہوہی گئی تو حضرت مولانا بھی احباب سے ملنے کے لئے شہر تشریف لے گئے، ایک موقع پر جب کہ حضرت کسی سے مل کر تشریف لے جارہے تھے، پیچھے مولانا احمد حسن صاحب تھے کہ مولوی عبدالحق صاحب کے چند شاگردوں نے مولانا احمد حسن کو تحذیرالناس کے بارے میں چھیڑنا شروع کیا، مولوی احمد حسن صاحب حضرت کے لحاظ وادب کی وجہ سے دب کر اور پست آواز میں جواب دیتے تھے، اس مکالمہ کا احساس حضرت کو ہوا تو ان طلبہ سے فرمایا کہ بھائی! یہ ظاہر ہے کہ اگر یہ (مولوی احمد حسن) عاجز ہوئے تو میں ان کی مدد کروں گا، اور اگر تم عاجز ہوئے تو تمہارے استاذ تمہاری مدد کریں گے، پھر یہ کیوں نہ ہو کہ تم اپنے استاذ کو لے آؤ اور میری ان سے گفتگو ہوجائے۔ بہرحال راستہ ختم ہوا، اہل شہر نے وعظ کی درخواست کی، حضرت نے منظور فرمالی، شب کو مجلس وعظ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، شہر کے امرا ورؤساء، علما، عمائد شہر، طلبہ، غرض کہ ہر طبقہ کے لوگ بھر گئے تھے، ایک میلہ سا لگ گیا، حضرت مولانا نے تقریر فرمائی، بس اس دن شاید بچے اور عورتیں گھروں میں رہ گئی ہوں گی، ورنہ کل شہر مجلس وعظ میں آگیا تھا، اور اس آیت کا وعظ فرمایا "**اذا وقعت الواقعة، ليس لوقعتها كاذبة**"۔ اور اس آیت کے تحت فلسفہ کے ان تمام مسائل کا جن پر منطقیوں کو ناز تھا، رد فرمادیا، اور اس آیت سے "**جزء لا يتجزى**" کا اثبات، قیامت کا ثبوت، حدوث عالم وغیرہ

امور مہمہ ثابت فرمائے، اور ایک غیر معمولی جلال اور جوش شان سے بیان فرمایا، یہ جوش کی شان اس وقت پیدا ہوئی تھی جب کہ ان طلبہ نے مولوی احمد حسن صاحب سے چھیڑ چھاڑ شروع کی تھی، مولانا مملوک العلی صاحب (استاذ حضرت نانوتوی) نے اقلیدس کا ایک ترجمہ کیا تھا، جس پر مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی نے رکیک الفاظ میں اعتراض کئے تھے، ان سب کا جواب بھی اس تقریر میں ارشاد فرمایا، اور نہایت جوش میں فرمایا کہ یہ کیا بات ہے کہ لوگ گھر میں بیٹھ کر اعتراض کرتے ہیں؟ اگر کچھ حوصلہ ہے تو میدان میں آجائیں، مگر ہرگز یہ توقع لے کر نہ آئیں کہ وہ قاسم سے عہدہ برآ ہوسکیں گے، پھر فرمایا کہ میں کچھ نہیں ہوں، مگر میں نے جن کی جوتیاں سیدھی کی ہیں وہ سب کچھ تھے۔ غرض کہ مسائل مناطقہ وفلاسفہ کا نہایت زبردست رد اس وعظ میں فرمایا، شہر کے تمام مشاہیر سوائے مولوی عبدالحق خیر آبادی کے اس وعظ میں موجود تھے مگر بولنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔

(ارواح ثلاثہ۔ ص ۲۰۷)

استغناء:

اس کے بعد نواب کلب علی خان نے اپنے خاص سکریٹری اور وزیر عثمان کو حضرت کی خدمت میں بھیجا کہ حضرت کا میں مشتاق ہوں، مجھ سے مل لیں، حضرت نے تو اول اعذار شروع کئے کہ میں غریب دیہات کا رہنے والا ہوں، آداب امرا سے غیر واقف، لیکن وزیر نے اپنی نہایت شستہ اور سجل تقریر میں عرض کیا کہ حضرت نواب صاحب تو خود حضرت کا ادب کریں گے، حضرت تمام آداب سے مستثنی رہیں گے، تب آخر میں مولانا نے ارشاد فرمایا کہ پھر نواب صاحب ہی تو میری ملاقات کے مشتاق ہیں، میں تو ان کی ملاقات کا مشتاق نہیں ہوں، اگر ان کو اشتیاق ہے تو خود مجھ سے ملنے آئیں، ان کے پیروں میں تو مہندی نہیں لگی ہے، بہر حال نہ جانا تھا، نہ گئے، اور امرا کے مقابلہ میں حضرت کا یہی طرز عمل رہا ہے۔ نواب محمود علی خان صاحب رئیس چھتاری ساری عمر اسی تمنا میں رہے کہ کسی طرح مل لوں، مگر حضرت نے اتنا موقع ہی نہ دیا، اگر حضرت کے علی گڑھ آنے کی خبر سن کر وہ علی گڑھ آئے تو مولانا جھٹ خورجہ تشریف لے گئے، جو خورجہ گئے تو حضرت میرٹھ آئے، اسی طرح بغیر نواب صاحب کی درخواست مانے رامپور سے واپس تشریف لائے۔

(ارواح ثلاثہ۔ ص ۲۰۹)

☆☆☆☆☆☆

تعلیمی انہماک وتحمل شدائد

تعلیمی انہماک:

حضرت مفتی شفیع صاحب نے ایک بار دارالعلوم کراچی کے طلبہ کونصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''رات کومیری والدہ میرا انتظار کرتی تھیں کہ کھانا گرم کرکے دیں،ان کے انتظار میں مجھے تکلیف ہوتی تھی، بڑی منت سماجت سے اس پر راضی کیا کہ میرا کھانا ایک جگہ رکھ دیا کریں، سردیوں کی رات میں شوربہ اوپر سے بالکل جم جاتا اور نیچے صرف پانی رہ جاتا، میں وہی کھا کر سوجاتا''۔(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج۱۔ص۹۲)

بےخودی:

ایک مرتبہ حضرت نانوتوی کے مخصوص شاگرد ومرید اور مدرسہ عبدالرب دہلی کے بانی حضرت مولانا عبدالعلی صاحب دارالعلوم تشریف لائے،معزز مہمان اور دوسرے اساتذہ کرام کے ساتھ دارالعلوم کے اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب کھڑے تھے،قریب ہی سے والد صاحب بغل میں کتابیں دبائے گزرنے لگے،تومہتمم صاحب نے بلایااور معزز مہمان سے فرمایا:

''یہ دارالعلوم کا ایسا طالب علم ہے کہ اسے اپنی کتابوں کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں ہے، نہ اپنے کپڑوں کی خبر ہے،نہ جان کی، کتاب کا کوئی سوال پوچھوتو محققانہ جواب دے گا''۔(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج۱۔ص۹۳)

الٰہی یہ لوگ.....:

ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب (علامہ انورشاہ کشمیری) سخت بیمار تھے،اور علالت طول

پکڑ گئی، ایک صبح فجر کے وقت یہ افواہ اڑی کہ حضرت کا وصال ہو گیا، خدام پر بجلی سی گر گئی، اور نماز فجر کے بعد فوراً ہم سب حضرت کے مکان کی طرف لپکے، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب بھی ساتھ میں تھے، گھر پہونچ کر معلوم ہوا کہ بحمد للہ خبر غلط تھی، البتہ تکلیف کی شدت برقرار ہے، ہم سب لوگ حضرت کی عیادت کے لئے کمرے میں پہونچے تو دیکھا کہ حضرت نماز کی چوکی پر بیٹھے ہیں، سامنے تکیے پر ایک کتاب رکھی ہے، اور اندھیرے کی وجہ سے حضرت جھک کر مطالعہ کر رہے ہیں، خدام کو یہ منظر دیکھ کر حیرت کے ساتھ تشویش بھی ہوئی کہ ایسی علالت میں مطالعہ کے لئے اتنی محنت برداشت کرنا مرض میں مزید اضافے کا موجب ہوگا، چنانچہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی نے ہمت کر کے ناز کے ساتھ عرض کیا کہ:

''حضرت یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اول تو وہ کون سی بحث رہ گئی ہے جو حضرت کے مطالعہ میں نہ آچکی ہو؟ اور اگر بالفرض کوئی بحث ایسی ہو تو اس کی فوری ضرورت کیا پیش آگئی کہ اسے چند روز مؤخر نہیں کیا جا سکتا؟ اور اگر بالفرض فوری ضرورت کا مسئلہ ہے تو ہم خدام کہاں مر گئے ہیں، آپ کسی کو بھی حکم فرما دیتے، وہ مسئلہ دیکھ کر عرض کر دیتا، لیکن اس اندھیرے میں ایسے وقت آپ جو محنت اٹھا رہے ہیں، وہ ہم خدام کے لئے ناقابل برداشت ہے''۔

اس کے جواب میں حضرت شاہ صاحب کچھ دیر تو انتہائی معصومیت اور بے چارگی کے انداز میں مولانا شبیر احمد صاحب کی طرف دیکھتے رہے پھر فرمایا:

''بھائی ٹھیک کہتے ہو، لیکن یہ کتاب بھی تو ایک روگ ہے اس روگ کا کیا کروں؟''۔

حضرت شاہ صاحب دن رات مطالعہ اور علمی مشاغل میں اس درجہ منہمک رہتے تھے کہ دنیا آپ کو چھو کر نہ گزری تھی، دنیوی بکھیڑوں میں الجھنا حضرت شاہ صاحب کی استطاعت سے باہر تھا، دارالعلوم کے اصحاب انتظام اور شاگردوں کو چونکہ اس بات کا علم تھا، اس لئے وہ حضرت کے گھریلوں کام دھندوں کو خود ہی نمٹانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

ایک روز حضرت مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی شخص نے آکر اطلاع دی کہ حضرت آپ کے مکان کی چھت گر پڑی ہے، اطلاع دینے والے نے اس انداز سے خبر دی تھی کہ اس خبر کو سنتے ہی اچھل پڑیں گے، لیکن حضرت اطمینان سے بیٹھے رہے، پھر انتہائی معصومیت کے ساتھ فرمایا

’’تو بھائی میں کیا کروں؟ جا کر کہو مولانا حبیب الرحمان صاحب (مہتمم دارالعلوم) سے، چنانچہ حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب کو اطلاع دی گئی اور انہوں نے کمرے کی مرمت وغیرہ کرادی۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ا۔ص ۲۵۲)

رات بھر کام کرتے رہے:

قادیانیوں کے خلاف مقدمہ بہاول پور میں حضرت (علامہ انور) شاہ صاحب کا جو بیان ہوا، اس میں آپ نے علوم ومعارف کے دریا بہادیئے، اس بیان کے دوران حاضرین پر تو سکتہ طاری تھا ہیڈ جج صاحب کی کیفیت بھی یہ تھی کہ وہ عالم حیرت میں حضرت کے چہرے کو تک رہے تھے، عدالت کی طرف سے بیان قلم بند کرنے والے لوگوں نے کچھ دیر تو حضرت کا ساتھ دیا، لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جب حضرت شاہ صاحب اپنے اصلی رنگ پر آئے تو انہوں نے بھی قلم رکھ کر چہرے کو تکنا شروع کردیا، بیان ختم ہونے کے بعد جج صاحب نے کہا کہ بیان چونکہ قلم بند نہیں ہوسکا، اس لئے کل تحریری طور پر یہ بیان پیش کیا جائے۔

عدالت سے واپس ہونے کے بعد قیام گاہ پر یہ مسئلہ حضرت شاہ صاحب، حضرت مولانا مرتضٰی حسن صاحب اور دوسرے بزرگوں کے سامنے آیا، سوال یہ تھا کہ حضرت شاہ صاحب کی طرف سے یہ بیان کون لکھے؟ بالآخر قرعہ فال حضرت والد صاحب (مفتی شفیع صاحب) کے نام نکلا، خود حضرت شاہ صاحب نے آپ کو مامور فرمایا کہ بیان آپ لکھئے، حضرت والد صاحب نے جواب میں عرض کیا کہ:

’’حضرت! آپ کی طرف سے آپ کے شایان شان بیان لکھنا تو میرے بس کا نہیں، البتہ ضرورت پوری کرنے کے لئے تعمیل حکم کروں گا‘‘۔

حضرت نے فرمایا کہ ’’ہم دعا کریں گے، آپ اللہ کا نام لے کر شروع کردیجئے‘‘۔

حضرت والد صاحب فرماتے ہیں کہ دن کو تو لکھنے کا موقع نہیں ملا، رات کے وقت میں اپنے کمرے میں لکھنے کے لئے بیٹھا، اور ساری رات بیان لکھتا رہا، فجر کی اذان ہورہی تھی تو میں آخری سطور لکھ رہا تھا، عین اسی وقت برابر سے حضرت شاہ صاحب کے کمرے کا دروازہ کھلا، آپ اندر تشریف لائے اور پوچھا کہ کام کہاں تک پہونچا ہے؟ احقر نے جواباً عرض کیا کہ بحمد للہ ابھی

ابھی پورا ہو گیا ہے، اور جب حضرت نے بیان دیکھا اور آپ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے لئے میں تمام رات جاگتا رہا ہوں تو حضرت نے صمیم قلب سے اتنی دعائیں مجھے دیں کہ ان کی حلاوت آج تک محسوس ہوتی ہے، اور یہی دعائیں میرا بڑا سرمایہ ہیں۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر ج ا۔ص ۲۵۶)

الولد سر لابیہ:

مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

اس مقدس واقعہ کے ساتھ اپنے کسی قصے کا ذکر کرنا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانے اور خاک اور عالم پاک میں رشتہ جوڑنے کے مرادف ہے، لیکن ''بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است'' کے پیش نظر عرض ہے کہ:

۱۹۷۳ء کی تحریک ختم نبوت میں جس کی قیادت حضرت شاہ صاحب کے شاگرد رشید محدث عصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری قدس قرہ کررہے تھے، جب یہ مسئلہ قومی اسمبلی میں پیش ہوا، اور مرزا ناصر وغیرہ نے اپنے بیانات داخل کئے تو اسی قسم کے ایک بیان کی ترتیب کے لئے حضرت بنوری قدس سرہ نے احقر کو راولپنڈی بلایا، اس وقت حضرت والد صاحب علالت کی بنا پر صاحب فراش تھے، اور عموماً ہمارے لئے سفر کو پسند نہیں فرماتے تھے، لیکن اس کام کے لئے انہوں نے نہایت خوشی کے ساتھ اجازت دی۔ احقر چند گھنٹوں میں راولپنڈی پہونچا، اور حضرت بنوری قدس سرہ کی زیر ہدایت کام شروع کیا، بیان کا ایک حصہ احقر کو اور دوسرا حصہ حضرت مولانا سمیع الدین صاحب کو مرتب کرنا تھا، وقت چونکہ کم تھا، اور بیان مفصل تیار کرنا تھا، اس لئے ایک ہفتہ ہم لوگ دن رات کام میں لگے رہے، اور اتفاق سے ایک رات میں پل بھر کے لئے نہیں سویا، حضرت بنوری قدس سرہ کو اس کا علم ہوا تو احقر کو بہت دعائیں دیں، اور اگلے روز حضرت والد صاحب کو فون کر کے فرمایا کہ حضرت! مقدمہ بہاول پور کی یاد تازہ ہو رہی ہے، حضرت شاہ صاحب نے آپ کو بلایا تھا اور میں نے تقی میاں کو بلایا ہے، آپ ایک رات بیان کی ترتیب میں جاگتے رہے تھے، آج رات یہ بھی مطلق نہیں سوئے، اس صوری مشابہت پر میں اللہ تعالی کا جتنا بھی شکر ادا کروں، کم ہے، اللہ تعالی ان بزرگوں کی برکت سے اس مشابہت کو حقیقی بنا دے اور اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ آمین (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ا۔ص ۲۵۷۔ حاشیہ)

ذوق مطالعہ:

مفتی شفیع عثمانی صاحب نے فرمایا کہ:

حضرت شاہ صاحب (علامہ انور شاہ صاحب) کے فیض صحبت کی بنا پر ہم لوگوں کو بھی مطالعہ کتب کی ایک دھن سی لگ گئی تھی، فراغت کے بعد تقریباً ایک سال تو میں نے اس طرح گزارا کہ چند اسباق پڑھانے کے بعد کتب بینی کے سوا کوئی کام نہ تھا، دوپہر کو دار العلوم دیوبند کے کتب خانے میں داخل ہوتا، ناظم کتب خانہ بعض اوقات باہر سے تالا لگا کر چلے جاتے اور میں اندر کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج۔ ص ۲۶۰)

فرماتے تھے کہ دار العلوم دیوبند کے کتب خانے میں کوئی کتاب ایسی نہ تھی جو میری نظر سے نہ گزری ہو، اگر کسی کتاب کو میں نے (مفتی شفیع صاحب) پورا نہیں پڑھا تو کم از کم اس کی ورق گردانی ضرور کی تھی، یہاں تک کہ تمام علوم وفنون کی الماریاں ختم ہوگئیں تو میں نے ان الماریوں کا رخ کیا جنہیں کبھی کوئی شخص ہاتھ نہیں لگاتا تھا، یہ اشتات (متفرقات) کی الماریاں تھیں، اور جن کتابوں کو کسی خاص علم وفن سے وابستہ کرنا ناظم کتب خانہ کو مشکل معلوم ہوتا تھا، وہ ان الماریوں میں رکھ دی جاتی تھیں، ان کتابوں میں چونکہ موضوع کے لحاظ سے کوئی ترتیب نہ تھی، اس لئے اس جنگل میں داخل ہونا لوگ بے سود سمجھتے تھے کہ یہاں سے کوئی گوہر مطلوب حاصل کرنا ''تریاق از عراق'' سے کم نہ تھا، لیکن جب ساری الماری ختم ہوگئیں تو میں نے اشتات کے اس جنگل کو بھی کھنگالا، اور اس کے نتیجے میں ایسی ایسی کتابوں تک میری رسائی ہوئی جو گوشۂ گمنامی میں ہونے کے باعث قابل استفادہ نہ رہی تھیں۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ۱۔ ص ۳۳۷)

حفظ قرآن:

حضرت تھانوی نے فرمایا کہ حضرت مولانا قاسم صاحب جہاز میں روز ایک پارہ حفظ کر کے سناتے تھے، اور آہستہ آہستہ یاد کرتے تھے، کسی کو پتہ بھی نہ چلا، یہ حصرت مولانا کی کرامت ہے، ایک شخص نے عرض کیا کہ مولانا خلیل احمد صاحب علیہ الرحمہ نے رمضان شریف میں آدھا قرآن شریف حفظ کر لیا تھا، تبسم سے فرمایا کہ چونکہ وہ مولانا سے آدھے تھے، اس لئے کرامت آدھی ہوگئی۔ (ارواح ثلاثہ۔ ص ۲۱۲)

طلب علم میں انہماک:

مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے ہیں کہ میں اپنے مکانِ مملوک میں جو چیلوں کے کوچہ میں ہے، رہنے لگا تھا، مولوی صاحب (یعنی حضرت نانوتوی) بھی میرے پاس آرہے، کوٹھے پر ایک جھلنگا پڑا ہوا تھا، اسی پر پڑھتے رہتے، روٹی کبھی پکوا لیتے تھے اور کئی کئی وقت اسی کو کھاتے رہتے، میرے پاس آدمی روٹی پکانے والا نوکر تھا، اس کو کہہ رکھا تھا کہ جب مولوی صاحب کھانا کھاویں تو سالن دیدیا کرو، مگر بدقت کبھی اس کے اصرار پر لیتے تھے، ورنہ وہی روکھا سوکھا ٹکڑا چبا کر پڑے رہتے۔ (ارواح ثلاثہ۔۲۱۵)

طالب علمی کی مشقت:

حضرت مولانا محمد یاسین صاحب (والد ماجد مفتی شفیع صاحب) نے طالب علمی کا پورا زمانہ عسرت اور تنگ دستی میں بسر کیا، ایک دن آپ گرمی کی دوپہر میں دارالعلوم کے اسباق سے تھک تھکا کر چھٹی کے وقت گھر پہونچے تو والدہ نے آبدیدہ ہوکر اپنے لائق فرزند سے کہا کہ: بیٹا! آج تو گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے، البتہ ہماری زمین میں گندم کی فصل تیار کھڑی ہے، اگر تم اس میں سے کچھ گندم کاٹ کر لاؤ تو میں ان کو صاف کر کے آٹا پیس کر روٹی پکا دوں گی، سعادت مند بیٹا محنت اور بھوک سے درماندہ اسی گرمی کی دوپہر میں اپنی زمین کی طرف چل دیا، اور وہاں سے جس قدر بوجھ اٹھا سکتا تھا، اتنے گندم کاٹ کر لے آیا، والدہ نے ان کو کوٹ چھان کر پیس کر آٹا بنایا، اور روٹی پکائی، اس طرح ظہر تک بھوک کا کچھ سامان ہوا، ظہر کے بعد اپنے اسباق کے لئے چلے گئے، ماں، باپ اور بیٹے نے اسی فقر وفاقہ میں وقت گزارا مگر تعلیم میں فرق نہیں آنے دیا۔

(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ا۔ص ۸۲)

شاہ اسماعیل صاحب کی ذکاوت:

مولانا ذوالفقا علی دیوبندی (والد ماجد حضرت شیخ الہند) کی روایت ہے کہ شاہ اسماعیل صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب سے ''الافق المبین'' پڑھتے تھے، (اہل علم جانتے ہیں یہ کس درجہ دقیق کتاب ہے) اور اس طور پر پڑھتے تھے کہ دو دو چار چار ورق پڑھتے، کہیں شاہ اسماعیل صاحب کچھ پوچھ لیتے، کہیں شاہ عبدالقادر صاحب کچھ بتادیتے، ورنہ یونہی پڑھتے جاتے۔ اس زمانہ میں

مولوی فضل امام صاحب خیرآبادی (والد ماجد مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی) صدر امین ہوکر دہلی آئے ہوئے تھے، ایک دن وہ بھی بیٹھے ہوئے تھے، اور سبق ہورہا تھا، وہ اس حیرت انگیز سبق کو دیکھ کر متعجب ہورہے تھے، اتفاقاً شاہ صاحب اثناء سبق میں کسی ضرورت سے اٹھے تو انہوں نے کہا کہ صاحبزادے! کیوں مصنف کی روح کو تکلیف دیتے ہو؟ وہ بپاسِ ادب چپ ہورہے، لیکن شاہ صاحب آگئے، اور انہوں نے سن لیا، فرمایا کہ مولوی صاحب اس لڑکے سے کچھ ہوچھئے تو اس کا حال معلوم ہو، پہلے تو مولوی فضل امام نے گریز کیا، لیکن آخر انہوں نے ایک مسئلہ الافق المبین کا پوچھا، مولانا اسماعیل صاحب نے نہایت شائستگی سے جواب دیا، پھر انہوں نے اس کا رد کیا، پھر انہوں نے جواب دیا، اس ردوقدح کی نوبت یہاں تک پہونچی کہ مولوی صاحب مولانا اسماعیل صاحب کی پیچیدہ تقریر کا غور کرکے جواب دینے لگے، اس وقت خاموش ہوئے۔ (کاروان ایمان عزیمت۔ص ۱۸)

نازک خیالیاں:

ایک ولایتی طالب علم خیالی پڑھنے کی غرض سے ہندوستان آیا، یہاں اس نے پوچھا کہ کون سب سے زیادہ ذہین اور ذکی ہے؟ معلوم ہوا کہ مولانا اسماعیل صاحب ہیں، ان کے پاس آیا اور استدعا کی، بیشتر انہوں نے فرصت نہ ہونے کا حیلہ کیا، آخرالامر جب اس نے زیادہ مجبور کیا تو فرمایا: اچھا فرصت کے وقت۔ اس نے بغل سے نکال کر ایک کتاب دی، انہوں پوچھا یہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ خیالی کا "حاشیہ عبدالحکیم" ہے، آپ نے کہا کہ یہ کیوں یہاں چھوڑے جاتے ہو؟ اس نے کہا کہ بے عبدالحکیم کے خیالی حل نہیں ہوتی، اس پر مولانا نے فرمایا کہ بے چارہ عبدالحکیم کیا ہے؟ جو میرے خیالوں میں باتیں آتی ہیں وہ عبدالحکیم کے خیالوں سے بدرجہا بہتر ہیں، اس نے کتاب تو اٹھائی لیکن بہت ہی بددل ہوا کہ جب ان کی یہ کیفیت ہے کہ عبدالحکیم کو کچھ نہیں سمجھتے تو خیالی کو خاک سمجھتے ہوں گے، لیکن چونکہ صرف خیالی ہی کی غرض سے اس نے اتنی مسافت طے کی تھی، اس لئے ٹھہر گیا، اور وقت مقررہ پر آیا، جب سبق شروع ہوا تو اس کو معلوم ہوا کہ واقعی ان کی نازک خیالیوں کے سامنے عبدالحکیم کوئی چیز نہیں ہے۔ (کاروان ایمان وعزیمت۔ص ۱۹)

معقولات میں ملکہ:

مولانا رشید احمد گنگوہی فرماتے تھے کہ:

''مولانا رشیدالدین خان صاحب (جو شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے، اور بوجہ اپنی ذکاوت واستعداد کامل کے رشید المتکلمین کے نام سے یاد کئے جاتے تھے) ایک دفعہ درس دیتے ہوئے طلبہ سے فرمانے لگے کہ مولانا اسماعیل صاحب کو دینیات کے ساتھ شغف ہے، باقی معقولات کی طرف کچھ توجہ نہیں ہے۔ مطلب یہ تھا کہ مولانا کو معقولات میں کچھ زیادہ دستگاہ حاصل نہیں ہے، اتفاقاً مولانا شہید کو ایک دن بخار آ گیا، اور مولانا رشیدالدین خان صاحب عیادت کو تشریف لے گئے، مولانا شہید فرمانے لگے کہ مولانا آج بخار میں جو دماغ پریشان تھا، اسی پریشانی وانتشار کی حالت میں فلاسفہ کے فلاں فلاں مسئلے کی طرف ذہن منتقل ہو گیا، اور ان مسائل پر میرے دل میں یہ اعتراضات پیدا ہوئے، مولانا رشیدالدین خان صاحب بالکل ساکت رہے، واپس ہونے پر ان کے تلامذہ نے کہا کہ آپ تو فرماتے تھے کہ مولانا اسماعیل کو معقولات کی طرف کچھ توجہ نہیں، فرمایا: ''بے شک میں نے کہا تھا مگر اب میری رائے یہ ہے کہ ارسطو اور افلاطون بھی قبر سے نکل کر آ جائیں تو مولانا کے بیان کردہ اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے''۔

(کاروان ایمان وعزیمت۔ص۲۰)

☆☆☆☆☆☆

شفقت وخیر خواہی

امت مسلمہ کے لئے سوز دل:

مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشا دارالعلوم میں شیخ الہند تشریف فرما تھے، علما کا بڑا مجمع سامنے تھا، اس وقت فرمایا کہ ''ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں، یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا کہ اس استاذ العلما درویش نے اتنے سالوں علما کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق سیکھے ہیں وہ کیا ہیں؟۔ فرمایا کہ:

''میں نے جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں؟ تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے، ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لئے میں وہیں سے یہ عزم کر کے آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے، بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قائم کئے جائیں، بڑوں کو عوامی درس کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے، اور قرآنی تعلیم پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے''۔

نباض امت نے ملت مرحومہ کے مرض کی جو تشخیص اور تجویز فرمائی تھی، باقی ایام زندگی میں ضعف وعلالت اور ہجوم مشاغل کے باوجود اس کے لئے سعی پیہم فرمائی، بذات خود درس قرآن شروع کرایا، جس میں تمام علماء شہر اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے علما بھی شریک ہوتے تھے، اور عوام بھی، اس ناکارہ کو اس درس میں شرکت کا شرف حاصل رہا ہے، مگر اس واقعے کے بعد حضرت کی عمر ہی گنتی کے چند ایام تھی۔

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ا۔ ص ۲۲۹)

شاگرد کا پاس ولحاظ:

تحریک خلافت کے معاملہ میں حضرت شیخ الہند قدس سرہ اور آپ کے مایہ ناز شاگرد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان رائے کا اختلاف تھا، جو معروف ومشہور ہے، حضرت تھانوی اس قسم کی تحریکات کو چونکہ مسلمانوں کے لئے مفید نہ سمجھتے تھے، اس لئے اس سے علیحدہ رہے، لیکن استاذ وشاگرد دونوں کو اپنے موقف پر پوری طرح ثابت قدم ہونے کے باوجود اس بات کا پورا یقین تھا کہ یہ رائے کا دیانت دارانہ اختلاف ہے، چنانچہ ایک مرتبہ تحریک کے بعض کارکنوں نے تھانہ بھون میں جلسہ کرنے کا ارادہ کیا اور حضرت شیخ الہند سے اس کی صدارت کی درخواست کی، حضرت شیخ الہند نے سختی سے انکار کردیا، اور فرمایا کہ یہ سب مجھ سے نہیں ہوسکتا، اگر میں تھانہ بھون میں جلسہ کروں گا تو مولوی اشرف علی کے لئے بڑی تکلیف کا سامان ہوگا ان کو یہ بھی گوارا نہ ہوگا کہ میں تھانہ بھون میں کوئی خطاب کروں اور وہ اس میں موجود نہ ہوں، اور اگر شرکت کریں تو یہ ان کے دیانت دارانہ موقف کے خلاف ہوگا، اس لئے یہ کام نہ کروں گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، حضرت تحریک کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف خطوں میں تشریف لے گئے لیکن تھانہ بھون میں جلسہ نہیں کیا۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ا۔ ص ۲۳۱)

طالب علم کی دلداری:

مولانا قاری محمد طیب صاحب کے خسر مولانا محمود صاحب رامپور ضلع سہارن پور کے رئیس گھرانے کے فرد تھے، یہ خاندان حضرت گنگوہی اور بزرگان دیوبند سے وابستہ تھا، جب مولانا محمود صاحب کو تحصیل علم کے لئے دیوبند بھیجا گیا تو ان کا قیام حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمان صاحب کی مسجد کے ایک حجرے میں ہوا، دارالعلوم سے حضرت شیخ الہند کے مکان کو جانے والے راستے پر دارالعلوم کے قریب ہی یہ مسجد واقع ہے، حسب عادت حضرت شیخ الہند دارالعلوم سے سبق پڑھا کر اپنے مکان کو تشریف لے جارہے تھے کہ اس مسجد کے دروازے پر مولانا محمود رامپوری کو کھڑا دیکھا، حال پوچھا تو معلوم ہوا کہ اسی مسجد کے ایک حجرے میں قیام ہے، حجرہ کے اندر جا کر دیکھا تو زمین پر بستر بچھا ہوا تھا، خیال آیا کہ رئیس زادہ ہیں، فرش پر سونے کی عادت نہ ہوگی، ان سے کچھ نہیں کہا اور اپنے گھر سے ایک چارپائی خود اٹھا، راستہ، گلی، کوچہ اور بازار طے کرتے ہوئے

اس مسجد کے قریب پہونچے تو دیکھا کہ مولانا محمود صاحب مذکور، دروازہ سے نکل رہے ہیں، اب یہ خیال دامن گیر ہوا کہ مجھے بوجھ لاتے ہوئے دیکھ کر انہیں سخت شرمندگی ہوگی، تو اپنے بزرگانہ فعل کو یہ کہہ کر مٹایا کہ ''لومیاں محمود! اپنی چارپائی اٹھاؤ، میں بھی شیخ زادہ ہوں، کسی کا نوکر نہیں ہوں''۔ یہ کہتے ہوئے واپس تشریف لے گئے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ا۔ ص ۲۳۳)

یہ مقام بلند:

ایک روز والد صاحب (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب) اور یہ ناکارہ بعد مغرب حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب کے در دولت پر حاضر ہوئے، فرمانے لگے: آم چوسو گے؟ والد صاحب نے عرض کیا کہ آم اور پھر حضرت کے عطا فرمودہ نور علی نور، ضرور عطا ہوں، میاں صاحب اٹھے، ایک ٹوکرا آم لاکر رکھے، اور ایک خالی ٹوکری گٹھلی اور چھلکوں کے لئے سامنے لاکر رکھ دی، ہم آم چوس کر فارغ ہوئے تو والد صاحب نے گٹھلی اور چھلکوں سے بھری ہوئی ٹوکری اٹھا کر باہر پھینکنے کے لئے چلے، پوچھا یہ ٹوکری لے کر کہاں چلے؟ عرض کیا کہ چھلکے باہر پھینکنے کے لئے جارہا ہوں، ارشاد ہوا پھینکنے آتے ہیں یا نہیں؟ والد صاحب نے عرض کیا کہ حضرت! یہ چھلکے پھینکنا کون سا خصوصی فن ہے جس کو سیکھنا ضروری ہے؟ فرمایا ہاں، تم اس فن سے واقف نہیں ہو، لاؤ مجھے دو، خود ٹوکری اٹھا کر پہلے گٹھلی چھلکوں سے علیحدہ کی، اس کے بعد باہر تشریف لائے اور سڑک کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر متعین جگہوں پر رکھ دیئے اور ایک خاص جگہ گٹھلیاں ڈال دیں۔

والد صاحب کے استفسار پر ارشاد ہوا کہ ہمارے مکان کے قرب وجوار میں تمام غربا و مساکین رہتے ہیں، زیادہ تر وہی لوگ ہیں جن کو نان جویں بھی بمشکل میسر آتی ہے، اگر وہ پھلوں کے یکجائی چھلکے دیکھیں گے تو ان کو اپنی غربت کا شدت سے احساس ہوگا، اور بے مائیگی کی وجہ سے حسرت ہوگی، اور اس ایذا دہی کا باعث میں بنوں گا، اس لئے متفرق کر کے ڈالتا ہوں اور وہ بھی ایسے مقامات پر جہاں جانوروں کے گلے گزرتے ہیں، یہ چھلکے ان کے کام آجاتے ہیں، اور گٹھلیاں ایسی جگہ رکھی ہے جہاں بچے کھیلتے ہیں، بچے ان کو بھون کر کھا لیتے ہیں، یہ چھلکے اور گٹھلیاں بھی بہر حال نعمت ہیں، ان کو ضائع کرنا مناسب نہیں۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہنے کی ہے کہ میاں صاحب خود تو شاید ہی کوئی آم چکھ لیتے ہوں

عموماً مہمانوں کے لئے ہوتے تھے، اور محلے کے غریب بچوں کو بلا بلا کر کھلانے میں استعمال ہوتے تھے، اس کے باوجود چھلکے اور گٹھلیوں کو یکجا ڈھیر کر دینے سے گریز فرماتے تھے کہ غریبوں کی حسرت کا سبب نہ بن جائیں۔ بعض فقہا نے بازار کے کھانے سے اس لئے پرہیز فرمایا ہے کہ ان پر غریبوں کی نظریں پڑتی ہیں، اور ناداری کے سبب وہ ان کی حسرت کا سبب بنتی ہے۔

دیکھئے ان اللہ والوں کی نظر دنیا کے کاموں میں کیسی دقیق ہوتی ہے، اور ہر چیز کا حق کس کس طرح ادا کرتے ہیں۔ (ارواح ثلاثہ۔ ص ۳۴۵)

پڑوس کی رعایت:

اعزا و اقربا، احباب اہل محلّہ کے حقوق و جذبات کی جس قدر رعایت کرتے ہوئے اس مرد خدا (حضرت میاں جی مولانا سید اصغر حسین صاحب) کو دیکھا اس کی مثال ملنی مشکل ہے، میاں صاحب کا اکثر مکان کچا تھا، جس پر ہر سال کہگل ہونا ضروری تھی، اگر نہ کی جاتی تو مکان منہدم ہونے کا خطرہ تھا، ہر سال برسات سے پہلے اس پر کہگل کرانے کا معمول تھا، اور اس وقت گھر کا سارا سامان باہر نکالنا پڑتا تھا، ایسے ہی ایک موقع پر والد صاحب (مفتی شفیع صاحب) نے عرض کیا کہ حضرت! ہر سال آپ کو یہ تکلیف ہوتی ہے، اور ہر سال کا خرچ بھی جو اس پر ہوتا ہے وہ جوڑا جائے تو پانچ سال میں اتنا ہو جائے گا کہ اس سے پختہ اینٹوں کا مکان بن جائے۔ اخلاق کریمانہ سے کسی کی بات کاٹنے کا وہاں دستور ہی نہ تھا، بڑی دلداری اور حوصلہ افزائی کے ساتھ فرمایا کہ ماشاء اللہ آپ نے کیسی عقل کی بات فرمائی، میرا بھی اندازہ یہی ہے، پانچ سال میں جتنا خرچ اس پر ہو جاتا ہے اتنے خرچ میں پختہ اینٹوں کا مکان بنا کر اس غم سے نجات ہو سکتی ہے، ہم بڈھے ہو گئے، اتنی عقل نہ آئی کہ ایک دفعہ ایسا کر لیتے، یہ کہہ کر خاموش ہو گئے، اس کی جو اصل حقیقت تھی اس کا اظہار اس طرح فرمایا کہ میرے پڑوس میں جتنے مکان سب غریبوں کے ہیں اور کچے ہیں، ایسی حالت میں میاں صاحب کیا اچھا لگتا کہ اپنا مکان پختہ بنا کر بیٹھ جاتا، پڑوسیوں کو حسرت ہوتی۔

اس وقت راز کھلا کہ یہ حضرت کس مقام بلند پر ہیں، ان کے اعمال افعال کا اندازہ لگانا دشوار ہے کہ ان میں کیسے کیسے اسرار پوشیدہ ہوتے ہیں، پڑوسیوں اور غریبوں کی رعایت، ان کی

خدمت جو حضرت میاں صاحب کی فطرت بنی ہوئی تھی، دوسروں کا اس کی طرف دھیان جانا بھی آسان نہ تھا۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام
پس سخن کوتاہ باید والسلام

میں نے دیکھا کہ اس کے بعد بھی ہمیشہ سالانہ یہ تکلیف برداشت کرنے کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ پڑوسیوں نے اپنے مکانات پختہ بنالئے، تب حضرت میاں صاحب نے بھی اپنے مکان کو پختہ بنوایا۔ (ارواح ثلاثہ۔ص ۳۴۶)

خیر خواہی کی ایک اور نادر مثال:

ایک مشہور عالم دین بزرگ سے بعض سیاسی مسائل میں حضرت میاں جی (سید اصغر حسین صاحب) کو شدید اختلاف تھا، جس کا اظہار ہمیشہ برملا فرماتے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی شان میں اگر کبھی کسی سے کوئی نامناسب کلمہ نکل جاتا تو بڑی سختی کے ساتھ تنبیہ فرماتے، اختلاف بھی '' اختلاف امتی رحمة'' کی تشریح پر تھا، اختلاف کے حدود سے سرمو تجاوز ان کی فطرت ہی نہ تھی۔

انہیں مختلف الخیال بزرگ نے ایک دفعہ امساک باراں کی شدت دیکھ کر نماز استسقاء پڑھنے کا اعلان کیا، میاں صاحب کو غالباً کشف کے ذریعے معلوم ہو چکا تھا کہ ان ایام میں بارش نہیں ہوگی، لیکن اس کے باوجود والد صاحب (مفتی محمد شفیع صاحب) سے فرمایا کہ میاں بارش تو ہونی نہیں، البتہ نماز کا ثواب حاصل کرنے کے لئے چلنا ضروری ہے۔

چنانچہ والد صاحب نے ان کی معیت میں نماز استسقاء ادا کی، بارش کو نہ ہونا تھا، نہ ہوئی، ان بزرگ نے دوسرے روز کے لئے بھی نماز کا اعلان فرما دیا، تو اس دن بھی وہی پہلے دن والی بات فرما کر نماز ادا کرنے کے لئے پہونچ گئے، اور بغیر بارش ہوئے واپس آ گئے، تیسرے روز کے لئے پھر نماز کا اعلان ہوا تو میاں صاحب تیسرے روز بھی نماز کے لئے میدان میں پہونچ گئے اور خود ان بزرگ سے کہا کہ اگر اجازت ہو تو آج نماز میں پڑھا دوں۔

ہر شخص حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ میاں صاحب کبھی نماز پنج وقتہ لوگوں کے اصرار پر بھی

نہیں پڑھاتے، آج انہوں نے خود نماز پڑھانے کی پیش کش کیسے کی؟ بہر کیف نماز استسقاء میاں صاحب کی امامت میں شروع ہوئی، میاں صاحب کے عقیدت مندوں کے دل میں بار بار خیال پیدا ہو رہا تھا کہ آج بارش ضرور ہو جائے گی، شاید میاں صاحب نے کشف کے ذریعہ معلوم کر کے یہ تبدیلی کی ہوگی، لیکن آج بھی دھوپ اسی شدت کے ساتھ چمکتی رہی اور بادل کا دور دور بھی نام و نشان نہ تھا، مجبور ہو کر پورا مجمع شکستہ دل مغموم واپس ہوا۔

والد صاحب نے اس خلاف عادت پر استفسار کیا کہ آپ تو کبھی نماز پنج گانہ میں بھی امامت نہیں فرماتے، آج یہ کیا ماجرا تھا؟ فرمایا کہ میرا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ جو عالم دین دو روز سے نماز پڑھا رہے ہیں لوگوں کو ان پر ہی بدگمانی نہ ہو، اس لئے میں نے سوچا کہ میں بھی اس شریک ہو جاؤں، کیوں کہ مجھے اندازہ تھا کہ بارش اس وقت ہونا مقدر نہیں، کسی عالم یا مقدس ہستی کا اس میں کیا قصور ہے؟ اب اگر بدنامی ہونی ہے تو تنہا ایک عالم کی نہ ہوگی۔ (ارواح ثلاثہ۔ ص ۳۴۷)

عجیب تجارت:

حضرت والد صاحب (مفتی محمد شفیع صاحب) نے دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا سا تجارتی کتب خانہ بھی قائم فرمایا تھا، اس میں جہاں کثرت عیال کے ساتھ مدرسہ کی تنخواہ کے ناکافی ہونے کو دخل تھا وہاں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اپنے لکھے ہوئی رسائل کی اشاعت آسان ہو جائے، لیکن تجارت ایک مستقل فن ہے، ابتدا میں حضرت والد صاحب کو اس کا تجربہ نہیں تھا، چنانچہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں دہلی گیا، تو وہاں کسی کتب خانے میں ایک نئ حمائل شریف شائع ہوئی تھی، میں اس کے نسخے بڑی تعداد میں خرید کر دیوبند لایا، خیال یہ تھا کہ یہ نسخے مجھے خاصے کم ہدیے پر مل گئے ہیں، حضرت میاں صاحب نے یہ سن کر احقر کی تعریف فرمائی، اور ساتھ ہی فرمائش کی کہ یہ تمام نسخے کچھ نفع رکھ کر مجھ کو ہدیہ کر دو، چنانچہ میں نے حضرت میاں صاحب کے حکم کی تعمیل کی اور تمام نسخے ان کو دیدیئے، اور حضرت نے ان کا ہدیہ بھی احقر کو جلد ہی عطا فرما دیا، میں مطمئن تھا کہ میں نے بہت اچھا معاملہ کیا ہے، جسے حضرت میاں صاحب جیسے پختہ کار بزرگ نے بھی پسند فرمایا ہے، بات آئی گئی، ہوگئی، لیکن عرصۂ دراز کے بعد ایک روز میں حضرت میاں صاحب کے کتب خانے میں پہونچا تو دیکھا کہ اسی حمائل شریف کے تمام نسخے ایک

جگہ جوں کے توں رکھے ہیں، اور ایسا معلوم ہوا کہ شاید ان میں سے کوئی نسخہ بھی فروخت نہیں ہوا، مجھے بڑا تعجب ہوا اور میں نے حضرت میاں صاحب سے ان کے بارے میں پوچھا تو اس وقت راز کھلا کہ حضرت میاں صاحب کس مقام سے سوچتے ہیں۔ فرمایا کہ:

''آج آپ کو بتاتا ہوں کہ جو حمائل شریف آپ خرید لائے تھے اس میں اغلاط بہت زیادہ تھیں، اور آپ نے اس کے دام بھی زیادہ دیئے تھے، مجھے معلوم تھا کہ ان کا تجارتی بنیاد پر نکلنا مشکل ہے، لیکن اگر میں اس وقت آپ سے اس کا ذکر کرتا تو آپ کی ہمت شکنی ہوتی، میں نے وہ تمام نسخے اس لئے آپ سے خرید لئے تھے''۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ا۔ ص ۲۶۷)

شفقت کی انتہا:

مفتی شفیع صاحب کی وفات سے دس روز پہلے جو رمضان کا مہینہ ختم ہوا، اس میں وقتاً فوقتاً آپ کی طبیعت بگڑنے لگتی، دل کی تکلیف بار بار ہونے لگی تھی، جب یہ رمضان المبارک ختم ہوگیا تو ایک دن حسرت کے ساتھ فرمانے لگے کہ:

''اس رمضان میں جب میری طبیعت بار بار خراب ہوتی تو بعض اوقات خیال ہوتا کہ شاید اللہ تعالیٰ اس مبارک مہینے میں موت کی سعادت نصیب فرمادیں، لیکن میرا بھی عجیب حال ہے اس خیال کے باوجود میں اس بات کی تمنا اور دعا نہ کرسکا کہ میرا انتقال رمضان میں ہو، کیوں کہ مجھے خیال یہ تھا کہ اگر یہ واقعہ رمضان میں پیش آیا تو ''اوپر والوں'' کو (یعنی تجہیز و تکفین کے منتظمین اور اس میں شرکت کرنے والوں کو) بہت تکلیف ہوگی''۔

میں حضرت کی زبان سے یہ جملے سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ان کی پرواز فکر ہمارے تخیل و تصور کی ہر سرحد سے کتنی بلند ہے؟۔ اللہ اکبر (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ا۔ ص ۴۶۵)

مخالفین پر شفقت:

بھٹو حکومت نے بریلوی مکتب فکر کے ایک مفتی صاحب کو گرفتار کرلیا تھا، اسی زمانہ میں کسی سائل نے دارالعلوم کراچی میں ایک استفتا بھیجا، یہاں سے جو جواب دیا گیا اس کو اس نے شائع کردیا، اس جواب میں مفتی موصوف کے جواب کے کچھ حصے کی موافقت تھی، دارالعلوم کے اس شائع شدہ جواب کو بنیاد بنا کر بریلوی حضرات نے کوشش کی اور اپنے مفتی صاحب کو چھڑا لیا،

جس پر بعض لوگ دارالعلوم کراچی کے دارالافتا میں کام کرنے والے فتوی نویس مولوی صاحب کو ملامت کرنے لگے کہ تمہارے فتوے سے بریلوی مفتی چھوٹ گیا، گویا اچھا نہ ہوا، حضرت مفتی شفیع صاحب علیہ الرحمہ بحیثیت امت کے سوچا کرتے تھے، آپ کو ان لوگوں کی ملامت کا پتہ چلا تو فرمایا کہ اچھا ہوا، ہمارے دارالافتا کے فتوی کی وجہ سے فلاں مفتی صاحب رہا ہو گئے، کیوں کہ حکومت نے ان کو اس لئے گرفتار نہیں کیا تھا کہ وہ بریلوی مفتی ہیں، بلکہ اس لئے گرفتار کیا تھا کہ وہ مفتی ہیں، اوران کا فتوی حکومت کی منشا کے خلاف پڑ گیا تھا، اگر آج ان کو گرفتار کیا ہے تو کل ہماری باری بھی آسکتی ہے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ۲۔ص ۹۲۴)

امت پر شفقت:

حضرت مفتی شفیع صاحب فرمایا کرتے تھے کہ:

''آج کل لوگوں میں فکر آخرت نہیں ہے، جو کام کرنا طے کر چکے ہیں اس کو ضرور کریں گے، نہ فتوی معلوم کر کے باز آتے ہیں نہ خود مسئلہ جان کر گناہ چھوڑتے ہیں، اس لئے مسائل مجتہد فیہا میں مفتی حضرات متعدد اقوال سے جواز کے پہلو پر فتوی دیں تو عوام کے حق میں بہتر ہے، کیوں کہ جواز معلوم کر کے عمل کریں گے تو گناہ گار نہ ہوں گے، اور دین سے اپنا لگاؤ سمجھیں گے، اوراگر ان کو ناجائز کا فتوی دیدیا تب بھی وہی کریں گے جو طے کر چکے ہیں، البتہ اس صورت میں گناہ جانتے ہوئے شریعت کے باغی ہو کر عمل کریں گے، جو ان کے دین وایمان کے لئے نہایت مضر ہوگا۔ (یہ بات انہیں مسائل وامور سے متعلق ہے جن کے بارے میں کتاب وسنت میں کوئی نص نہیں ہے، جو قرآن وحدیث کے بیان کردہ اصول کے اعتبار سے ممنوع نہیں ہیں، اور جو متفق علیہ ممنوع نہ ہوں)۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ۲۔ص ۹۲۵)

شفقت کا انداز:

ایک دفعہ عرض کیا کہ حضرت مرکزی حکومت اپنے ملازمین کو آمد ورفت کی سہولت کی خاطر سائیکل خریدنے کے لئے ایک سوبیس روپئے قرض دیتی ہے، اور بارہ مساوی قسطوں میں واپس لیتی ہے، لیکن اس میں قباحت یہ ہے کہ اس قرض کا سود بھی دینا پڑتا ہے، رقم کی ضرورت بھی شدید ہے، اب حضرت کا جو حکم ہو، یہ سن کر حضرت (مفتی شفیع صاحب) اٹھے اور اندر جا کر ایک سو

بیس روپئے لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دیئے اور فرمایا کہ دس روپئے ماہانہ قسط سے لوٹا دینا۔
اس قرض کے دوران ایک قسط کے وقت تنگ دستی ایسی ہوگئی کہ دس روپئے کی گنجائش نہیں تھی، لیکن شرمندگی سے بچنے اور وعدہ پورا کرنے کی خاطر بہزار دقت خدمت میں حاضر ہوکر قسط پیش کی، اور جب حضرت نے قبول فرمالی تو پھر آہستہ سے اپنی حالت بھی بیان کردی، حضرت نے مسکراتے ہوئے روپئے واپس فرمادیئے، اور خوش ہوکر فرمایا کہ آپ نے بالکل صحیح طریقہ اختیار کیا، آدمی کو چاہئے کہ وعدہ پورا کرے اور بعد میں اپنی حاجت کا اظہار کردے، لیکن ایسا کبھی نہ کرے کہ قسط ہی غائب کردے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ۲۔ص ۹۳۳)

دوہری شفقت:

ایک دفعہ ہم کسی کام کے سلسلے میں صبح سے بڑی دیر تک گھومتے رہے، کوئی گیارہ بجے کے قریب فریزر روڈ (حالیہ شاہراہ لیاقت) پر جب نظامی دواخانہ کے قریب پہونچے تو حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ اچھا اب آپ جائیں، اب آپ کا دفتر یہاں سے قریب ہے، سلام کرکے دونوں جدا ہوئے، چند ہی قدم فاصلہ ہوا تھا کہ حضرت نے مجھے آواز دی، میں بھی حضرت کو صدر کی جانب جاتے دیکھ ہی رہا تھا، جلدی جلدی آگے بڑھا، حضرت بھی میری جانب تشریف لارہے تھے حضرت نے اپنی جیب سے رقم نکالی اور میرے ہاتھ میں تھمادی اور فرمایا کہ اس کو قبول کرلیجئے، اس کے بعد اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔
اس واقعہ کا پس منظر یہ تھا کہ صبح سے تمام سفر کے دوران بس کے ٹکٹ میں نے ہی لئے تھے، حضرت میری مالی حالت سے واقف تھے، اس وقت تو اس خیال سے کہ منع کرنے پر اس کا دل دکھے گا، خاموش رہے لیکن اختتام سفر پر کافی رقم سے نواز کر عمر بھر کے لئے نقش کردیا، خدمت کا موقع بھی دیا، اور پھر اپنے کرم سے سرفراز بھی فرمادیا۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ۲۔ص ۹۳۳)

وکالت کا پیشہ:

مولانا محمد یوسف بنوری بعض اوقات مجھے وکالت ترک کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ وکالت چھوڑ کر اپنا پورا وقت تصنیف وتالیف کے کام میں صرف کروں، ایک دن میں نے یہ پروگرام بنایا کہ صبح آٹھ بجے مولانا بنوری کے وہاں جاکر پھر وہیں سے مفتی (شفیع) صاحب کے

پاس چلا جاؤں گا، مولانا بنوری نے اس روز بھی وہ تذکرہ چھیڑا اور میرے اخراجات وغیرہ معلوم کیئے، میں وہاں سے اٹھ کر جب مفتی صاحب کی خدمت میں پہونچا تو چونکہ بات بالکل تازہ تھی، اس لئے میں نے مفتی صاحب سے مولانا بنوری کی گفتگو کا تذکرہ کیا، مفتی صاحب نے فرمایا کہ مولانا محمد اشرف علی تھانوی نے ایک رسالہ ''مناصب الحرام'' کے بارے میں لکھا ہے، مل جائے تو پڑھ لینا، ویسے بھائی! وکالت کے پیشے سے نفرت کرنے کی ضرورت نہیں، اور نہ اس سے دل برداشتہ ہونے کی، بلکہ اگر کوئی غریب آدمی آئے جو تمہاری فیس نہ دے سکے تو اس کی مدد کرنا کار ثواب ہے، کیوں کہ آج کل تو ایسا گورکھ دھندا ہے کہ بغیر وکیل کے کام ہی نہیں چلتا، البتہ مقدمہ لیتے وقت سچ اور جھوٹ، حق اور ناحق کے درمیان امتیاز کرلیا کرو، دونوں فریقوں میں سے ایک فریق سچا ہوگا، دعا کیا کرو کہ سچا فریق تمہارے پاس آئے، پھر اس کی مدد کرو، فیس ہی کیوں نہ لو مگر نیت کا ثواب ملے گا کہ ایک مظلوم کی مدد کر رہے ہو، پھر فرمایا کہ اگر کوئی لغزش ہو جائے تو اللہ سے استغفار کرلیا کرو، اور نعم البدل کی دعا مانگتے رہوں، جب اللہ چاہیں گے اور کوئی بہتر ذریعۂ معاش پیدا فرمادیں گے، لیکن معاش کے متبادل انتظام کے بغیر پیشۂ وکالت ترک کرنے کی ضرورت نہیں کہ تنگی میں مبتلا ہو جاؤ۔ الحمدللہ حضرت کی تقریر سے دل پر جو گھبراہٹ طاری تھی، دور ہوگئی۔

(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ۲۔ ص ۹۹۶)

امر بالمعروف کا حکیمانہ انداز:

ایک بار مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کا جلال آباد یا شاملی سے گزر ہوا، ایک مسجد ویران پڑی تھی، وہاں نماز کے لئے تشریف لا کر پانی کھینچا، وضو کیا، مسجد میں جھاڑو دی، بعد میں ایک شخص سے پوچھا کہ یہاں کوئی نمازی نہیں ہے؟ اس نے کہا جی! سامنے خان صاحب کا مکان ہے جو شرابی اور رنڈی باز ہیں، اگر وہ نماز پڑھنے لگیں تو یہاں اور بھی دو چار نمازی ہو جائیں، آپ ان خاں صاحب کے پاس تشریف لے گئے، تو رنڈی پاس بیٹھی ہوئی تھی، اور نشہ میں مست تھے، آپ نے خاں صاحب سے فرمایا کہ بھائی خان صاحب! اگر تم نماز پڑھ لیا کرو تو دو چار آدمی اور جمع ہو جایا کریں، اور مسجد آباد ہو جائے گی، خاں صاحب نے کہا کہ میرے سے وضو نہیں ہوتی، اور نہ یہ دو بری عادتیں چھوٹتی ہیں، آپ نے فرمایا کہ بے وضو ہی پڑھ لیا کرو، اور شراب بھی پی لیا کرو، اس پر

اس نے عہد کیا کہ میں بغیر وضو پڑھ لیا کروں گا، آپ وہاں سے تشریف لے گئے، اور کچھ فاصلہ پر نماز پڑھی اور سجدہ میں خوب روئے، ایک شخص نے دریافت کیا کہ حضرت آپ سے دو باتیں ایسی سرزد ہوئیں جو کبھی نہیں ہوئیں، اول یہ کہ آپ نے شراب اور زنا کی اجازت دیدی، دوسرے یہ کہ آپ سجدہ میں بہت روئے، فرمایا کہ سجدہ میں جناب باری تعالی سے التجا کی تھی کہ اے رب العزت! کھڑا تو میں نے کر دیا اب تیرے ہاتھ میں دل ہے۔

ان خاں صاحب کا یہ حال ہوا کہ جب رنڈیاں پاس سے چلی گئیں تو ظہر کا وقت تھا، اپنا عہد یاد آیا، پھر خیال آیا کہ آج پہلا روز ہے، لاؤ غسل کرلیں، کل سے بغیر وضو پڑھ لیا کریں گے، غسل کیا، پاک کپڑے پہنے اور نماز پڑھی، بعد نماز باغ میں چلے گئے، عصر اور مغرب باغ میں اسی وضو سے پڑھی، بعد مغرب گھر پہونچے، طوائفیں موجود تھیں، اول کھانا کھانے گھر میں گئے، بیوی پر جو نظر پڑی تو فریفتہ ہوگئے، ان کی شادی کو سات سال ہوگئے تھے اور آج تک نہ بیوی کے پاس گئے تھے اور نہ اس کی صورت دیکھی تھی، فوراً باہر آئے، رنڈی سے کہا کہ آئندہ میرے مکان پر نہ آنا اور خادم سے کہا کہ بستر گھر میں بھیج دو، سنا ہے کہ ان خاں صاحب کی پچیس سال تک کبھی تہجد قضا نہیں ہوئی۔ (ارواح ثلاثہ)

ایسے ہی ایک مرتبہ گڑھی پختہ تشریف لے گئے، ایک خاں صاحب سے نماز کے لئے کہا تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے ڈاڑھی چڑھانے کی عادت ہے اور وضو سے یہ اتر جاتی ہے، آپ نے فرمایا: بغیر وضو پڑھ لیا کرو، خاں صاحب نے کچھ روز بغیر وضو نماز پڑھی، پھر خیال آیا کہ ایک مولوی کے کہنے سے تو نے بغیر وضو نماز پڑھنی شروع کر دی، اور اللہ، رسول کے حکم سے باوضو نماز نہیں پڑھی جاتی؟ اس کے بعد ہمیشہ باوضو پڑھنے لگے۔ (ارواح ثلاثہ۔ص ۱۵۸)

شفقت عام:

ایک دفعہ مولانا مظفر حسین صاحب رامپور (ضلع سہارن پور کا ایک قصبہ) تشریف لے گئے، ایک عورت حاضر خدمت ہوئی اور عرض کیا کہ میرا خاوند خرچ نہیں بھیجتا، آپ نے اس کا پتہ دریافت کیا اور وہاں سے فیروز پور تشریف لے گئے اور اس کے خاوند کو تلاش کر کے ہدایت کی کہ آئندہ ہمیشہ وقت پر خرچ بھیجا کرے۔ (ارواح ثلاثہ۔ص ۱۶۱)

بے انتہا محبت:

مولانا حبیب الرحمان صاحب دیوبندی نے فرمایا کہ مولانا محمود حسن صاحب مرحوم حضرت نانوتوی کے اخلاق مربیانہ اور شفقت ورحمت کی توصیف کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ بس حضرت کے اخلاق کا اندازہ اس مثال سے ہوسکتا ہے کہ مثلاً میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں، جو بہت تمناؤں کے بعد پیدا ہوا ہوں، ظاہر ہے کہ مجھ سے کتنا انس ہوگا، اچانک میں گرفتار ہوکر دائم الحبس کر دیا جاؤں کہ پھر میری واپسی اور ملاقات کی کوئی توقع ماں باپ کو نہ رہے، ظاہر ہے کہ ان پر کس درجہ غم والم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے کہ گویا قبل از مرگ ہی مر جائیں گے، اور پھر میں اچانک رہا ہوکر آؤں اور ایک دم ماں باپ کے سامنے پہونچ جاؤں تو بتلاؤ کہ ان کی اس وقت خوشی و مسرت کا کیا اندازہ ہوسکتا ہے؟ بس یوں سمجھو کہ اگر میں دن میں دس مرتبہ بھی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر سلام کرتا تو مجھے دیکھ کر ہر مرتبہ اتنا ہی خوش ہوتے جتنا کہ میرے ماں باپ اس وقت خاص میں خوش ہوسکتے ہیں۔ (ارواح ثلاثہ۔ص۱۹۴)

غریب کی دعوت:

مولانا احمد حسن صاحب نے فرمایا کہ مولانا قاسم صاحب کی ایک نورباف نے دعوت کی اتفاق سے اس روز بارش ہوگئی، اور وہ بے چارہ وقت پر بلانے نہ آسکا، تو مولانا محمد قاسم صاحب خود اس کے یہاں تشریف لے گئے، اس نے عرض کیا کہ حضرت! چونکہ آج بارش ہوگئی تھی، اس لئے میں دعوت کا انتظام نہ کرسکا، مولانا نے فرمایا کہ انتظام کیا ہوتا؟ تمہارے یہاں کچھ پکا بھی ہے؟ اس نے کہا جی ہاں، وہ تو موجود ہے، فرمایا کہ بس وہ ہی کھالیں گے، چنانچہ جو کچھ معمولی کھانا ساگ وغیرہ اس کے یہاں تیار تھا وہ مولانا تناول فرما کر تشریف لے آئے اور فرمایا: بس جی تمہاری دعوت ہوگئی۔ (ارواح ثلاثہ۔۲۱۷)

چھوٹوں کا خیال:

حضرت تھانوی نے فرمایا کہ دیوبند کے بڑے جلسہ کے زمانے میں ایک شخص نے مدرسہ میں گھوڑا دیا تھا، مولانا محمود حسن صاحب نے اس کو ایک مقام پر بھیج دیا کہ اس کو فروخت کردیں، اس مقام سے ایک شخص گھوڑے کے متعلق ایک خط لایا تھا، اس زمانہ میں جلسہ کا اہتمام

ہورہا تھا، مہتمم صاحب نے خط کا جواب دے کر اس کو رخصت کردیا، مولانا دیوبندی نے مہتمم صاحب سے پوچھا کہ اس خط لانے والے کو کھانا بھی کھلایا تھا، مہتمم صاحب نے کہا کہ حضرت کھانا تو ہجوم اشغال میں نہیں کھلایا، پیسے دیدیئے ہیں کہ کچھ لے کر کھالے گا، فرمایا کافی نہیں، غریب آدمی پیسے نہیں خرچ کرتا، گھر کو باندھ کر لے جاتا ہے، اور لوگوں سے پوچھا کہ وہ شخص کس راستہ سے گیا ہے؟ پتہ لگا کہ فلاں سڑک کو گیا ہے، مولانا ادھر ہی تشریف لے گئے اور اس کو واپس کر کے کھانا کھلا کر پھر رخصت کیا۔ (ارواح ثلاثہ۔ص۳۰۳)

طلبہ کی قدر و منزلت:

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ’’تذکرۃ الخلیل‘‘ میں لکھتے ہیں کہ:

’’ایک مرتبہ میں مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں حاضر تھا کہ ایک طالب علم کی آپ کے پاس محرر مطبخ کے متعلق شکایت آئی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ طلبہ کو کھانا تقسیم کررہے تھے، اس طالب علم کو جلی روٹی ملی، جس کے لینے سے اس نے انکار کیا، محرر مطبخ نے سختی سے جواب دیا کہ اب خنے بہک گئے کہ جلی اور موٹی سوجھنے لگی، لینا ہو تو لو ورنہ جاؤ، مجھ سے نہیں ہوسکتا کہ اس کو اپنے حصہ میں لگالوں، یا جو روٹی جلے اس کا تاوان دیا کروں۔ حضرت (مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری) یہ خبر سنتے ہی مطبخ میں آئے اور غصہ کی وجہ سے آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا، میں ساتھ تھا، اور دیکھ رہا تھا کہ حضرت کے بدن اور آواز دونوں میں رعشہ ہے، محرر مطبخ سے آپ نے واقعہ پوچھا، اور جب انہوں نے خود اس توقع پر صحیح صحیح بیان کردیا کہ طلبہ کا نظام قائم رکھنے کے لئے محرر کی طرفداری کی جائے تو اس وقت آپ فرمایا کہ منشی جی! سنو مدرسہ انہیں پردیسی بے وطن مسکین طلبہ کے دم سے قائم ہے، اور تم اور میں انہیں کے طفیل روٹیاں کھارہے ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو نہ مطبخ کی ضرورت ہے نہ تمہاری حاجت، مدرسین بھی فارغ اور مدرسہ بھی خالی، یہ مسکین سہی محتاج سہی، مگر مجھے اور تمہیں دونوں کو روٹیاں دے رہے ہیں، مجھے صرف یہ بتادو کہ تمہیں ترش کلام کرنے کا حق کیا تھا؟ اور تم کون تھے یہ کہنے والے کہ ’’خنے بہک‘‘ گئے ہیں، ان کا باپ بنا ہوا ابھی زندہ ہوں، تم کو تو مطبخ سے جز و تنخواہ بنا کر دو خوراک ملتی ہے، آخر کیا وجہ تھی کہ جلی ہوئی روٹی تم اپنی خوراک میں نہ لگا سکے؟ اور مہمان رسول کو مجبور کیا کہ یا تو یہی جلی ہوئی کھائے ورنہ فاقہ کرے، اب تو اپنی خوراک اس کے

حوالے کردو، اور آئندہ سے خوب کان کھول کر سن لو کہ کسی طالب علم کے ساتھ کچھ بھی تیز یا ترش برتاؤ کیا تو کان پکڑ کر مطبخ سے نکال دوں گا، ہاں کسی طالب علم سے کوئی غلطی ہو تو مجھ سے کہو، میں تحقیق کے بعد جو سزا مناسب سمجھوں گا، دوں گا، مگر دوسرے کو نہ دیکھ سکوں گا کہ وہ انہیں ترچھی نظروں سے بھی دیکھے، چونکہ پہلی غلطی ہے اس لئے اس وقت تنبیہ پر اکتفا کرتا ہوں، آئندہ اس کا پورا لحاظ رکھا جائے۔ (ارواح ثلاثہ۔ص ۳۱۱)

کند ذہن پر شفقت:

ایک مرتبہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کے یہاں درس ہو رہا تھا کہ کسی مقام پر عطارہ کا لفظ آیا، چونکہ قرأت کرنے والا لفظ کے معنی سمجھے ہوئے اور مادۂ اشتقاق جانے ہوئے تھا، اس لئے بے تکان پڑھتا چلا گیا، برابر میں ایک طالب علم ولایتی علاقہ سرحد کا رہنے والا... بیٹھا ہوا تھا، جو اس لفظ کے معنی نہ سمجھا، اس نے بے چارے قرأت کنندہ ہم جماعت طالب علم کو زور کہنی ماری اور کہا، ٹھہرو، ہم نہیں سمجھا، اور حضرت کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کہ ''عطارہ معنی چہ؟'' آپ نے فرمایا ''زوجہ عطر فروشندہ''۔ حضرت کی زبان سے جواب ختم ہونا تھا کہ قاری نے پھر قرأت شروع کر دی، بے چارہ ولایتی اب بھی نہیں سمجھا، دوبارہ پھر کہنی ماری اور حضرت سے دریافت کیا ''مولانا! عطارہ معنی چہ؟ ہم نہیں سمجھا'' آپ نے فرمایا ''عطر فروش کی بیوی'' پھر قاری نے قرأت شروع کی، تیسری مرتبہ ولایتی نے پھر کہنی ماری اور تیز نظر سے دیکھ کر کہا ''ٹھہرو، ہم نہیں سمجھا عطارہ کا معنی'' اس مرتبہ امام ربانی نے اونچی آواز سے جواب دیا ''عطر بیچنے والا کا جورو'' اس وقت ولایتی خوش ہوا اور کہا ''ہاں سمجھا، ہاں بھائی چلو''۔ (تذکرۃ الرشید۔ج ا۔ص ۹۰)

بچوں پر شفقت:

حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) کو گوارا نہ تھا کہ بچوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ سختی کا برتاؤ کیا جائے، اگر کسی صغیر سن بچہ کے پٹنے یا کراہنے کی آواز آپ کے کان میں پڑتی تو آپ بے چین ہو جاتے، اور کبھی باپ کے اپنے لڑکے کو زیادہ مارنے کی شکایت آپ سنتے تو آپ کو صدمہ ہوتا، اور مناسب الفاظ میں باپ کو نصیحت فرماتے۔

مولوی محمد اسماعیل صاحب گنگوہی نے اپنے لڑکے محمد جلیل کو ایک مرتبہ مارا، ان کی

پھوپھی نے حضرت سے جا شکایت کی، اگلے دن مولوی اسماعیل صاحب حاضر ہوئے تو حضرت نے فرمایا: مولوی اسماعیل ادھر آؤ، مولوی اسماعیل صاحب ہنسنے لگے، کیوں کہ سمجھ گئے تھے کہ کل لڑکے کے مارنے کی چغلی کھائی گئی ہے، حضرت نے فرمایا ہنستے کیا ہو؟ ادھر آؤ، اور مولوی یحییٰ تم بھی آؤ، (مولوی یحییٰ بھی اپنے صاحبزادہ زکریا کو بہت مارتے تھے) اس کے بعد چارپائی پر بیٹھ کر فرمایا کہ مولوی یحییٰ! میں تم سے مسئلہ پوچھتا ہوں کہ لڑکے کو کس قدر مارنا چاہئے؟ نصیحت کے لئے اتنا ہی کافی تھا، اب مولوی یحییٰ صاحب جواب دیں تو کیا دیں؟ حضرت نے کئی مرتبہ اس فقرہ کو دہرایا، آخر فرمایا کہ مولوی اسماعیل تم عہد کرو کہ جلیل کے مارنے میں سختی نے کروں گا، اگر عہد نہیں کرتے تو میں جلیل کو گوالیار نہ جانے دوں گا، میں اس کو خود پڑھاؤں گا، کیوں کہ یہ میرا دو وجہ سے عزیز ہے، اول تمہاری وجہ سے کہ تم میرے عزیز ہو، اور دوسرے بھائی عبدالمجید کا نواسہ ہے، آخر مولوی اسماعیل نے وعدہ کیا کہ حضرت ان شاء اللہ اب ایسا نہ ہوگا۔ صاحبزادہ حکیم مولانا مسعود احمد صاحب بھی اس وقت حاضر تھے، کہنے لگے کہ حضرت میں بھی تو سعید کو مارتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ تمہارا مارنا بھی سعید کو، مجھے معلوم ہے، لڑکے کو اس قدر نہ مارنا چاہئے، ایک دو طمانچہ مارنے کا مضائقہ نہیں۔ (تذکرۃ الرشید۔ ج ٢۔ ص ٤٠)

اصلاح بین المسلمین:

محسن خان بیان کرتے ہیں رمضان المبارک کے دن تھے، آپ (سید احمد شہید) نے ایک روز فرمایا کہ آج روزہ ٹھنڈے کنویں پر کھولیں گے، جو تکیے سے ایک کوس کے فاصلے پر تھا، سب تیار رہیں، جب روانگی کا سامان اور افطاری کی تیاری ہوگئی تو رائے بریلی سے اطلاع آئی کہ فلاں فلاں مسلمانوں کے درمیان جنگ درپیش ہے، اور عجب نہیں کہ تلوار و بندوق کی نوبت آجائے آپ نے یہ سن کر محسن خان، شیخ لطافت، معمور خان، ابراہیم خان، امام خان وغیرہ دس آدمیوں سے فرمایا کہ ہمیں معلوم ہے کہ تم کو اس وقت پیاس کی شدت ہوگی، اور اب یہ شدت بڑھتی ہی جائے گی لیکن کیا کیا جائے کہ بغیر ان مشقتوں کے برداشت کئے ہوئے مراتب کمال تک پہونچنا میسر نہیں آتا، چونکہ دو مسلمانوں کے درمیان کشت وخون کی نوبت آگئی ہے، تم دوڑ کر جاؤ، اور فریقین کے درمیان اپنے کو ڈال دو، اور کہو کہ جو دوسرے کے قتل کے درپے ہے وہ پہلے ہم کو قتل کردے،

چونکہ رمضان کے دن ہیں اور آپ روزے سے ہیں، اس لئے آپ اس اکبر الکبائر کے مرتکب ان شاء اللہ ہرگز نہ ہوں گے، کل سید صاحب کے پاس چل کر اپنے جھگڑے کا تصفیہ کرا لیجئے گا، آپ نے محسن خان سے فرمایا کہ چونکہ تمہارے ماموں کا مکان قریب ہے، وہیں افطار کر کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس آجانا۔

وہ سب دوڑتے ہوئے گئے، محسن خان ایک فریق کی طرف دوڑے اور شیخ لطافت نے دوسرے فریق کا رخ کیا، اور آٹھوں فریقین کے درمیان کھڑے ہوگئے اور دونوں کو مصالحت پر راضی کیا، افطار کے وقت محسن خان کے ماموں کے گھر سے افطاری آئی، افطار اور نماز مغرب کے بعد سب تکیے واپس ہوئے، اس کے بعد قضیہ بھی طے ہوگیا۔ (سیرت سید احمد شہید ج ۲ ص ۴۸۷)

بھلا میں تنہا کھالوں؟:

مقام میجنی میں ایک روز شام تک غلے کا انتظام نہ ہوسکا، باورچیوں نے آپ (سید احمد شہید) کے لئے آدھ سیر کے بقدر کھانا تیار کرلیا، جب آپ کو اس کی اطلاع دی گئی کہ آپ کے لئے کھانا تیار ہے، تو فرمایا:

''استغفر اللہ! بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں تنہا کھانا کھالوں؟ اور لشکر فاقے سے رہے''
مخلصین نے عرض کیا کہ یہ آدھ سیر کھانا جو تیار ہے سارے لشکر کے لئے تو کافی نہیں ہے، اسے ہم کس کو کھلائیں؟ فرمایا: جس کا جی چاہے کھالے لیکن مجھ کو یہ گوارا نہیں کہ میں تنہا کھالوں اور تمام مسلمان فاقے سے رہیں، غرض وہ کھانا اسی طرح رکھا رہا، ایک پہر رات گزرنے کے بعد غلے کا انتظام کرنے والے خبر لائے کہ لشکر کے لئے غلہ آرہا ہے، مولوی عبدالوہاب صاحب، قاسمِ غلہ نے عرض کیا کہ کھانا تیار ہے، آپ نوش فرمالیں، فرمایا: یہ کھانا تمام لشکر کے لئے کافی ہوجائے گا؟ مولوی صاحب نے عرض کیا، ضرورت بھر کے لئے کافی ہوجائے گا، اس کے بعد آپ نے کھانا تناول فرمایا۔ (سیرت سید احمد شہید۔ ج ۲۔ ص ۴۹۰)

شفقت علی المخلوق کا نادر نمونہ:

صاحبِ ''ذکر جلی'' ایک قصہ مولوی محمد علی رامپوری کی زبانی تحریر کرتے ہیں کہ ایک روز مولوی اسماعیل شہید صاحب، مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ کے دروازہ پر کھڑے

تھے، آپ نے دیکھا کہ بہت سی جوان اور خوبصورت عورتیں رتھوں اور بہلیوں میں سوار ہوکر بلا پردہ کہیں جارہی ہیں، مولوی صاحب نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون عورتیں ہیں؟ ایک شخص نے کہا یہ سب کسبیاں ہیں، فلانی کسی بڑی کسبی کے گھر کچھ تقریب ہے وہاں جارہی ہیں، مولوی صاحب نے دریافت کیا کہ کیا یہ مسلمان ہیں؟ اس شخص نے کہا، ہاں مسلمان ہیں، تب مولانا نے فرمایا: تب ہماری بہنیں ہیں، کیا خداوند تعالیٰ ہم سے نہیں پوچھے گا کہ اس قدر مسلمان عورتیں بدکاری وناکاری میں گرفتار تھیں اور تم نے انہیں نصیحت نہیں کی، اس واسطے اب تو میں ان کے مکان پر جاکر نصیحت کروں گا، آپ کے رفیقوں نے کہا کہ آپ کے وہاں تشریف لے جانے سے مخالفین بدنام کریں گے کہ کنچڑا اڈے میں آپ بھی جانے لگے، آپ نے فرمایا کہ اسماعیل کو اس بات کی پرواہ نہیں ہے، جب اللہ ورسول کا حکم سنانے لگا تو ہر ایک سناوے گا، اس واسطے کہ سب کلمہ گو مومنین کا حق برابر ہے، اول آپ نے اپنے دل سے کہا کہ اے! اگر تیرے بدن کی بوٹیاں کاٹ کر چیلوں کو کھلائیں یا تیرے جسم کو ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر کھنچوائیں، تو اس وقت بھی اللہ کی بات بولتا رہے گا، دل نے کہا کہ ہاں، جب تک میرے اندر سانس ہے، خدا کی بات کہنے سے کسی عذاب اور عقوبت سے باز نہ آؤں گا۔

جب شام ہوئی مولانا نے درویشوں سا بھیس بدل کر اس کسبی کے مکان پر پہونچے، جہاں سب کسبیاں جمع ہوکر کچھ گا بجارہی تھیں، آپ نے وہاں جاکر دروازہ کھٹکھٹایا، اور کہا آؤ اللہ والیوں! آؤ اللہ والیوں! اس وقت ان چھوکریوں نے دروازہ پر آکر پوچھا، کون ہو؟ آپ نے جواب دیا کہ فقیر ہے، کچھ صدا سنائے گا، اور تماشہ دکھائے گا، وہ سمجھیں کہ کوئی فقیر تماشہ گر ہے، دروازہ کھول کر اندر بلالیا، آپ نے اندر جاکر بہت نرمی سے پوچھا کہ بڑی صاحبہ کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا کہ اوپر بالاخانہ میں مع اپنے مہمانوں کے جشن کررہی ہیں، مولانا صاحب اوپر تشریف لے گئے، اور دیکھا کہ بڑی صاحبہ بڑے تزک اور شان سے مع اپنے مہمانوں کے کرسیوں پر بیٹھی ہیں، چاروں طرف شمع دان روشن ہے، چونکہ مولانا صاحب نامی گرامی اور مشہور شخص ایک بڑے گھرانے کے صاحبزادے تھے، باوجود بھیس بدلنے کے بھی وہ آپ کو پہچان گئی، اور اپنی اپنی کرسیوں پر سے اٹھ کر مؤدب کھڑی ہوگئیں، اور پوچھا کہ حضرت آپ نے آنے کی کیوں تکلیف فرمائی؟ آپ نے

فرمایا: گھبراؤں نہیں، میں کچھ صدا سنانے آیا ہوں، تم سب جمع ہوکر اپنی اپنی جگہ آرام سے بیٹھ جاؤ، چونکہ ان کی ہدایت کا وقت آ گیا تھا، سب ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھ گئیں، مولوی صاحب نے حمائل کھول کر ایسی خوش الحانی سے قرآن پڑھا کہ اس کو سن کر لوٹ پوٹ ہوگئیں، پھر آپ نے ان آیتوں کے معانی بیان کر کے ہر ایک دنیاوی چیز کی بے ثباتی کا اس طرح ذکر کیا کہ یہاں نہ حسن وجوانی کو قیام ہے، نہ مال وزندگانی کو، یہاں ہر چیز فانی اور زوال پذیر ہے، یہ بیان ایسی شرح وبسط اور فصاحت وبلاغت سے ہوا کہ ہر ایک نے رونا شروع کر دیا، اس کے بعد مولانا نے موت اور جاں کنی کی سختیاں اور اس وقت کی بے کسی اور وحشت اور اس عالم کی مفارقت کا افسوس ایسے پر درد طور پر بیان کیا کہ ساری عورتیں ہوش باختہ ہوگئیں، پھر اس کے بعد قبر کی تنہائی اور منکر نکیر کا سوال اور وہاں کے عذاب کا بیان اس زور سے کیا کہ قیامت کے دن بدکاروں کے گروہ کو حاضر کیا جائے گا، اور جو کوئی اس فعل بدکاری کا سبب اور وسیلہ یا موجد ومعاون ہوا ہے، وہی اس دن اس گروہ کا پیشرو ہوگا، جب بروز قیامت تم فرداً فرداً بجرم بدکاری گرفتار کر کے حاضر کی جاؤ گی تو ہر زانیہ کے ساتھ سیکڑوں اور ہزاروں زانی اور بدکار بھی بلائے جائیں گے، جن کی زنا کاری کا تم باعث اور وسیلہ ہوئیں، اور تمہارے ہی ناز وادا نے انہیں اس آفت میں پھنسایا، تو خیال کرو کہ اس حالت میں جب سیکڑوں اور ہزاروں زانی وبدکار تمہارے پیچھے ہوں گے، اللہ رب العزت کے سامنے تمہارا کیا حال ہوگا؟۔

یہ بیان بھی ایسا گرم ہوا کہ کسبیوں کی ہچکیاں بندھ گئیں، تب آپ نے توبہ سے ان خستہ حالوں کے دلوں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے توبہ کی فضیلت بیان کرنی شروع کی، اور کہا کہ توبہ سے سب گناہ معاف ہوجاتے ہیں، اس بیان وعدۂ عفو اور شرح غفاریٔ غفور رحیم سے ان بے دلوں کو کچھ ہوش آیا، معاً اس کے بعد آپ نے نکاح کی فضیلت بیان کرنی شروع کی، اور آخر میں فرمایا کہ جس کا دل جس سے چاہے نکاح کرے اور اپنے افعال ماضیہ سے تائب ہوجائے، ''**التائب من الذنب کمن لا ذنب له**''، یعنی آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہوجاتا ہے گویا اس نے گناہ ہی نہیں کیا۔

جب یہ وعظ ہو رہا تھا، اس کی شہرت تمام شہر میں ہوکر ہزاروں خلقت اس کے سننے کو

وہاں جمع ہوگئی تھی، راستے بند ہوگئے تھے، آس پاس کے کوٹھے اور بالا خانے خلقت سے بھر گئے تھے، اس دل پذیر وعظ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس قدر جوان عورتیں قابل نکاح اس مجمع میں موجود تھیں، انہوں نے توبہ کر کے نکاح کرلیا اور جو بوڑھی سن رسیدہ نائکہ وغیرہ تھیں، انہوں نے محنت مزدوری سے گزران کرنی شروع کردی۔ (کاروان ایمان وعزیمت۔ص ۲۵)

انوکھی مہربانی:

مولانا سید محمد عرفان علیہ الرحمہ حضرت سید احمد شہید قدس سرہ کے نواسہ ہیں، ایک بڑی بی جن کی آمد ورفت ان کے یہاں تھی، اور آپ ان کی امداد فرماتے تھے، گھر کے کچھ برتن چرا کے لے گئیں، گھر والوں نے آپ کو ملامت کی اور ان کو برا بھلا کہنا شروع کیا، آپ ان کے گھر تشریف لے گئے اور روپیہ دے کر معذرت کی کہ ہم سے خدمت کرنے میں کوتاہی ہوئی، یہ رقم قبول کیجئے اور برتن واپس کردیجئے تاکہ آپ کی بدنامی نہ ہو۔ (کاروان ایمان وعزیمت۔ص ۱۶۶)

خدمت کا جذبہ:

آپ (سید احمد شہید) جوان ہو چکے تھے، والد کا انتقال ہو چکا تھا، حالات کا اقتضا تھا کہ آپ ذمہ دارانہ زندگی میں قدم رکھیں، اور تحصیل معاش کی فکر کریں، آپ کی عمر ۱۷/۱۸ سال کی تھی کہ ۱۲۱۸ھ یا ۱۲۱۹ھ میں اپنے سات عزیزوں کے ساتھ لکھنؤ چلے لکھنؤ رائے بریلی سے ۴۹ر میل ہے، سواری صرف ایک ہی تھی، اور باری باری اس پر سوار ہوتے تھے، لیکن آپ کی باری آتی تو آپ سوار نہ ہوتے بلکہ منت سماجت کر کے دوسروں کو سوار کرادیتے، ہر ایک کے سر اس کا سامان تھا جب آدھی منزل طے ہوگئی تو سب رفقاء سفر تھک گئے، اور مزدور کی جستجو ہوئی لیکن مزدور نہ مل سکا، سید صاحب جو اس موقع کی تلاش میں رہتے تھے، اپنے ساتھیوں سے بڑے عجز وانکسار سے کہا ''اس خاکسار کی ایک عرض ہے، اگر آپ سب اسے قبول کرنے کا وعدہ فرمائیں تو عرض کروں، لوگ مطلب نہیں سمجھے اور کہا بڑی خوشی سے، آپ نے فرمایا، نہیں، پختہ وعدہ کیجئے، سب نے پختہ وعدہ کیا، آپ نے کہا کہ سارا سامان ایک کمبل میں باندھ کر میرے سر پر رکھ دیجئے، میں ان شاء اللہ پہونچا دوں گا''۔ چونکہ لوگ زبان دے چکے تھے، مجبور ہو کر انہوں نے ایسا ہی کیا اور آپ ایسے خوش ہوئے جیسے کوئی بڑی دولت ملی ہو، اور فرمایا: ''عمر بھر آپ کا یہ احسان نہیں بھولوں گا'' اور ہنستے بولتے لکھنؤ پہونچ گئے۔ (سیرت سید احمد شہید۔ج ا۔ص ۱۱۴)

کمزوروں پر رحم:

مولوی سید محمد علی صاحب، صاحبِ مخزن احمدی کہتے ہیں کہ ایک رات سید احمد شہید مجھے الگ لے گئے، اور خصوصیت کے ساتھ سمجھایا اور کہا کہ کل یا پرسوں ہم دہلی جائیں گے، ہماری خواہش ہے کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں، میں نے کہا کہ آپ کے پاس سوائے ان کپڑوں کے جو بدن پر ہیں، کوئی سامان نہیں، آپ ہی ایسی بے سروسامانی کی حالت میں سفر کی ہمت رکھتے ہیں، میں کم ہمت ایسے سفر کی طاقت نہیں رکھتا، اس طرح دو تین دن گزر گئے، اور لشکر کا کوچ ہو گیا، دو پہر کو ہم لوگ منزل پر پہونچے اور سب ہمراہی ایک جگہ اکٹھے ہوئے تو معلوم ہوا کہ سید صاحب نہیں ہیں، جہاں جہاں احتمال تھا، شام تک تلاش کیا، لیکن پتہ نہ چلا، چونکہ یہ سفر محمدی کے جنگل میں تھا، اور وہ جنگل نہایت خطرناک اور درندوں، شیر بھیڑیے، ریچھ اور ہاتھی کے لئے مشہور تھا، اور ہر منزل پر ایک دو آدمی ان کا شکار ہو جاتے تھے، اس لئے ہم سب کو فکر ہوئی کہ نصیب دشمناں کوئی حادثہ تو نہیں پیش آیا، رفتہ رفتہ اس کا یقین آ گیا، تین دن رات ہم لوگ اسی رنج میں والم میں مبتلا رہے، چوتھے روز محمدی کی طرف سے لشکر کا ایک آدمی آیا، اس نے کہا کہ ایک میاں صاحب اس حلیہ کے جو صرف حضرت ہی کا ہو سکتا تھا، مجھے راستہ میں دکھائی دیئے، ان کے سر پر راب کا گھڑا تھا، اور پیچھے ایک سپاہی تھا، میں نے کہا، میاں سپاہی! یہ صاحبزادے تو شریف معلوم ہوتے ہیں، کیا ماجرا ہے؟ اس نے یہ عجیب قصہ سنایا کہ جب میں اپنے مکان سے چلا تو ایک بوڑھے کے سوا کوئی مزدور نہ ملا، وہ بوڑھا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ تھا لیکن اس پر کئی فاقے ہو چکے تھے، اس نے اس امید سے کہ پیٹ بھرنے کی مزدوری مل جائے گی، بوجھ لے لیا اور گرتا پڑتا بہزار خرابی میرے ساتھ چلا، تھوڑی دیر کے بعد یہ صاحب ملے اور مزدور کی یہ حالت دیکھ کر ان کے آنسو نکل گئے اور مجھ سے کہا: بندۂ خدا! کچھ خدا کا خوف کر، کیوں اس بے چارے سے بے گار کر رہا ہے؟ میں نے کہا میں نے اس پر زبردستی نہیں کی ہے، بلکہ اس کو مزدور کیا ہے، آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نہ کہا کہ دو روز سے فاقہ تھا، میں نے کہا کہ مزدوری کر لوں، شاید پیٹ بھرنے کا سامان ہو جائے، آپ نے مجھ سے کہا، اگر مزدوری تمہارے پاس ہو تو اس کو دیدو، ورنہ خدا کے غضب سے ڈرو، میں اسی وقت پیسے نکال کر دیدیئے، آپ نے کہا کہ اب تھوڑی دیر اس درخت کے نیچے بیٹھ کر دم لے لو، میں بیٹھ

گیا، آپ نے کہا: اب اس مزدور کو رخصت کر دو، اور مجھے مزدور سمجھو، تمہارا بڑا احسان ہوگا، میں نے کہا کہ صاحبزادے نیکی اور شرافت اور سمجھ داری تمہاری شکل سے ٹپکتی ہے، مگر اس وقت تم بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو، اس جنگل میں تو رستم کا بھی جگر شق ہوتا ہے، خود صحیح سلامت پہونچ جانا ہی بڑی بات ہے، اس بوجھ کے ساتھ منزل پکڑنا بہت دشوار ہے، آپ نے فرمایا کہ اگر تم میرے ساتھ سلوک کروگے تو ساری عمر تمہارا احسان نہ بھولوں گا، میں نے مجبور ہوکر گھڑا سر پر رکھ دیا، اور آپ نہایت اطمینان کے ساتھ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے چلے آئے۔

یہ سن کر عزیزوں کو اطمینان ہوا کہ خدا کا شکر ہے، خیریت سے ہیں۔ (سیرت سید احمد شہید۔ ج ا۔ ص ۱۱۷)

☆☆☆☆☆☆

صبر ورضا

زخمی نوجوان:

سید موسی ۱۸/۱۷ کے سال جوان تھے،ان کے والد سید احمد علی صاحب جس دن پھولڑے کی لڑائی میں شہید ہوئے اس دن سے سید موسی کی طبیعت مغموم رہنے لگی،کبھی کبھی اپنے دوستوں سے کہتے کہ اگر میرا کبھی کسی لڑائی میں جانے کا اتفاق ہوا تو ان شاء اللہ بیچ کھیت میں مجھے دیکھنا،یعنی لڑکر شہید ہوجاؤں گا،ان کے اس حال کی اطلاع سید صاحب کو بھی تھی،وہ رسالدار عبدالحمید خان کے سواروں میں تھے،جب تورو سے مایار کی طرف لشکر چلا تو آپ نے ان سے کہا کہ تم اپنا گھوڑا اور کسی کو دیدو،اور تم ہمارے ساتھ پیادوں میں رہو،انہوں نے عرض کیا،آپ مجھ کو یونہی رہنے دیجئے،جب درانیوں کا ہلہ آیا،آپ گھوڑے کی باگ اٹھا کر اس میں گھس گئے،اور خوب تلواروں سے لوگوں کو مارا،اور زخمی کیا،اور آپ بھی زخمی ہوئے،مگر لڑتے رہے،جب زخموں کے مارے دونوں ہاتھ بیکار ہوگئے اور کئی زخم سر میں لگے اس وقت بیتاب ہوکر گھوڑے سے گرے۔

خادی خان قندھاری کہتے ہیں کہ میں دور سے سنا کہ کوئی زخمی پڑا ہوا ''اللہ اللہ'' کہہ رہا ہے،میں نزدیک گیا تو پہچانا کہ یہ تو سید ہیں،سر کے زخموں سے جو خون بہہ رہا تھا اس سے ان کی آنکھیں بند تھیں،میں نے کہا کہ......میں آپ کو اٹھا کر لے چلوں،انہوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اور فتح کس کی ہوئی؟ میں نے کہا کہ میں خادی خان ہوں،اور فتح سید بادشاہ کی ہوئی،یہ سن کر انہوں نے کہا ''الحمدللہ'' اور قدرے...سے ہوگئے،اور مجھ سے کہا کہ مجھ کو لے چلو،میں اپنی پشت پر سوار کر کے اٹھالایا،سید صاحب نے ان کو بے چین دیکھ کر فرمایا کہ ان کو مایار کی مسجد کے حجرے میں پہونچاؤ،آپ نے بعض رفیقوں کو ان کی خدمت کے لئے ساتھ کر دیا۔

مولوی سید جعفر علی لکھتے ہیں کہ سید صاحب ان کو دیکھنے تشریف لائے،آپ نے فرمایا

کہ یہ بچہ مردانہ نکلا اور مالک حقیقی کا حق خوب ادا کیا، پھر ان سے خطاب کر کے فرمایا کہ الحمدللہ تمہارے ہاتھ پاؤں اللہ کے راستے میں کام آئے اور تمہاری کوششیں مشکور ہوئیں، اگر تم کسی کو دیکھو کہ خوش رفتار گھوڑے پر سوار ہے اور اس کو ایڑ لگاتا ہے اور دوڑاتا ہے تو تم کبھی اس کی حسرت نہ کرنا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں سلامت ہوتے تو ہم بھی اسی طرح شہہ سواری کرتے، اس لئے کہ تمہارے ہاتھ پاؤں اللہ تعالی کے یہاں قبول ہوگئے، بڑے مبارک ہیں وہ ہاتھ پاؤں جو رضائے مولا کے راستے میں کام آئیں، اور اس پر قربان ہوجائیں، اور کبھی کسی شخص کو دیکھو کہ وہ پٹہ باز استاذوں کی طرح تلوار سے کھیلتا ہے تو کبھی یہ غم مت کرنا کہ ہم بھی تندرست ہوتے تو سپہ گری کا کمال دکھاتے، اس لئے کہ تمہارے ان ہاتھ پاؤں کا بڑا مرتبہ ہے کہ اللہ کے راستے میں انہوں نے زخم کھائے، جو ہاتھ پاؤں سالم ہیں ان سے گناہ کا اندیشہ ہے، لیکن تمہارے ہاتھ پاؤں کا ثواب اللہ تعالی کے یہاں جمع ہے، سیدنا علی مرتضی کے بھائی حضرت جعفر طیار کے دونوں بازو اللہ کے راستے میں کٹ گئے، اللہ تعالی نے ان کو جنت الفردوس میں ذوالجناحین کے لقب سے سرفراز فرمایا اور زمرد کے دو بازو ان کو عطا فرمائے۔

سید موسی نے عرض کیا کہ حضرت! میں ہزار زبان سے اللہ تعالی کا شکر کرتا ہوں، اور اس حال پر راضی وشاکر ہوں، میرے دل میں اللہ تعالی کی طرف سے قطعاً کوئی شکایت نہیں آتی، اس لئے اسی کام کے لئے آپ کی ہمرکابی میں یہاں آیا تھا، الحمدللہ کہ اپنی ہستی کو اس افضل ترین عبادت میں مٹادیا، اللہ تعالی قبول فرمائے۔ (سیرت سید احمد شہید۔ ج ۲۔ ص ۲۶۱)

ایک زخمی کی استقامت:

مولوی سید جعفر علی لکھتے ہیں کہ شیخ محمد اسحاق گورکھپوری نے جب مجاہدین کے سواروں کو شکست کھاتے ہوئے دیکھا تو اگرچہ وہ پیادوں میں تھے، لیکن وہ سواروں کی طرف دوڑے، ایک سوار نے ان کے سینے پر تیر سے حملہ کیا، انہوں نے اس کے وار سے بچنے کے لئے اپنے سینے کو دائیں طرف جھکا دیا، نیزہ بائیں شانے پر لگا، انہوں زور کیا تو تیر کی ڈنڈی ٹوٹ گئی، اور اس کی انی شانے کی ہڈی میں پیوست ہوگئی، انہوں نے اسی حالت میں اس وار کرنے والے پر تلوار سے حملہ کیا، اتنے میں دوسرے سوار اس درانی کی مدد کے لئے آگئے، ان میں سے ایک نے ان کے سر پر

تلوار ماری، دوسرے نے ان کے دائیں ہاتھ پر وار کیا، جس سے ان کی کئی انگلیاں کٹ گئیں، تیسرے نے ان کے بائیں شانے پر جہاں نیزے کا زخم تھا ضرب لگائی، یہ ضرب کاری تھی، اس کے علاوہ اور بھی زخم آئے، ان کی رفل اس دن ٹھیک سے کام نہیں کر رہی تھی، انہوں نے اس حالت میں رفل تو سعدی خان غازی کے حوالے کی اور تلوار دوسرے غازی کو، جو بے سروسامان تھا، اور صرف تبر لئے ہوئے تھا، انہوں نے دونوں کو سخت تاکید کی کہ یہ اللہ کا مال ہے تم کو امین جان کر تمہارے حوالے کیا ہے، یہ ضائع نہ ہونے پائے، ان کے دونوں ہاتھ بیکار ہو گئے تھے، اس لئے وہ مایار کی طرف روانہ ہوئے، راستے میں میاں جی محی الدین ملے، جو زخمی پڑے ہوئے تھے، انہوں نے ان کو دائیں ہاتھ سے تھام کر جس کی انگلیاں زخمی تھیں، ان کو لے کر چلنا شروع کیا، تھوڑی دور چل کر ان کو غش آ گیا اور زمین پر گر گئے، یہ خاکسار (مولوی سید جعفر علی) پاس گزرا تو سب سے پہلے انہوں نے دریافت کیا کہ لشکر اسلام کو فتح ہوئی یا نہیں؟ میں نے جب ان کو فتح کی بشارت سنائی تو وہ شگفتہ اور مسرور ہو گئے، اور فرمایا کہ آؤ بھائی! تم سے گلے مل لوں، جب معانقہ سے فارغ ہوئے تو کہنے لگے کہ حدیث میں آیا ہے کہ شہدا کو سکرات موت کی تکلیف نہیں ہوتی، بس صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ چیونٹی نے کاٹ لیا ہے، چنانچہ دیکھ رہا ہوں کہ مجھے اتنے زخم آئے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ کانٹا چبھا ہے۔ (سیرت سید احمد شہید۔ ج ۲۔ ص ۲۶۳)

☆☆☆☆☆☆

ضبط وتحمل

بے نظیر تحمل:

حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب کو اللہ تعالی نے مثالی ضبط وتحمل عطا فرمایا تھا، دارالعلوم دیوبند کی زمین سے متصل کسی دیوبند کے رئیس کی زمین تھی، اس کا کچھ حصہ دارالعلوم کے لئے خرید لیا گیا تھا، اس رئیس کے انتقال کے بعد اس ایک وارث نے ایک روز دارالعلوم کے صحن میں پہونچ کر اس زمین کی حق داری کا دعوی کیا اور حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب کو خطاب کر کے بآواز بلند برا بھلا کہنا شروع کیا، اس کا انداز گفتگو اس قدر اشتعال انگیز تھا کہ مولانا کے بعض خدام کو فطری طور پر اشتعال ہوا اور انہوں نے اس کو اسی زبان میں جواب دینے کا ارادہ کیا، لیکن مولانا نے ان کو روکا اور ان صاحب سے فرمایا کہ شیخ صاحب! آپ فضول ناراض ہوتے ہیں، ذرا اندر تشریف لائیے، اطمینان سے باتیں کریں گے، مگر وہ صاحب بدستور غیظ وغضب کا اظہار کرتے رہے۔

مولانا نے کچھ دیر کے بعد فرمایا: اندر چل کر بیٹھئے تو سہی، وہاں بات کریں گے، اور پھر انہیں زبردستی دفتر اہتمام میں لے گئے، ان کی خاطر تواضع کی اور جب ذرا ٹھنڈے ہو گئے تو مولانا اپنی جگہ سے اٹھے، ایک الماری کھولی، اس میں کچھ کاغذات لے کر آئے اور ان صاحب کے سامنے پھیلا دیئے کہ دیکھئے یہ زمین آپ کے مورث نے فلاں تاریخ کو دارالعلوم کے ہاتھ فروخت کر دی تھی اور اس کی رجسٹری بھی ہو چکی ہے، ان صاحب نے کاغذات دیکھے تو شرمندہ ہوئے اور مولانا نے جس صبر وضبط اور تحمل کا مظاہرہ فرمایا اس سے بے حد متأثر ہو کر گئے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ۱۔ ص ۲۷۵)

شجاعت:

ایک مرتبہ دارالعلوم کی انتظامیہ کے خلاف ایک شدید طوفان کھڑا ہوا، جس میں بعض لوگ حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب کی جان تک کے دشمن ہوگئے، ان حالات میں بھی مولانا کھلی چھت پرتن تنہا سوتے تھے۔

میں نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت! ایسے حالات میں آپ کا اس طرح سونا مناسب نہیں معلوم ہوتا، آپ کم ازکم کمرے کے اندر ہی سوجایا کریں لیکن مولانا نے بڑی بے نیازی سے فرمایا:

''ارے میاں! میں تو اس باپ (یعنی سید عثمان غنی) کا بیٹا ہوں جس کے جنازے کو چار اٹھانے والے بھی میسر نہ آئے اور جسے رات کے اندھیرے میں بقیع کی نذر کیا گیا، لہٰذا مجھے اس کی کیا پرواہ ہوسکتی ہے''۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ۱۔ ص ۲۷۶)

نگاہِ دوررس:

ایک مرتبہ مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی مرادآباد جلسہ میں تشریف لے گئے، لوگوں نے وعظ کے لئے اصرار کیا، مولانا نے عذر فرمایا کہ مجھے عادت نہیں ہے، مگر لوگوں نے نہ مانا، آخر مولانا کھڑے ہوگئے، اور ''**فقیه واحد اشد علی الشیطان من الف عابد**'' پڑھی، اور اس کا ترجمہ یہ کیا کہ ''ایک عالم شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ بھاری ہے''۔ وہاں ایک عالم تھے وہ کھڑے ہوئے، اور کہا کہ یہ ترجمہ غلط ہے، اور جس کو ترجمہ بھی صحیح نہ کرنا آوے، تو اس کو وعظ کہنا جائز نہیں، بس مولانا خود فوراً بیٹھ گئے، اور ذرا بھی تغیر نہ آیا، فرمایا کہ میں تو پہلے ہی کہتا تھا، کہ مجھے وعظ کہنے کی لیاقت نہیں، مگر ان لوگوں نے نہ مانا، خیر اب میرے پاس عذر کی دلیل بھی ہوگئی، یعنی آپ کی شہادت، پھر حضرت مولانا نے ان بزرگ سے بطرز استفہام پوچھا کہ غلطی کیا ہے؟ تاکہ آئندہ بچوں۔ انہوں نے فرمایا کہ ''اشد'' کا ترجمہ ''اثقل'' (بھاری) نہیں آتا، بلکہ ''اضر'' (یعنی مضر اور نقصان دہ) آتا ہے، مولانا نے فی الفور فرمایا حدیث وحی میں ہے کہ ''**یاتینی مثل صلصلة الجرس وهو اشد علی**'' کبھی وحی میرے پاس گھنٹی کی آواز کی طرح مسلسل آتی ہے، اور وہ میرے اوپر زیادہ بھاری ہوتی ہے، کیا یہاں بھی ''اشد'' کے معنی ''اضر'' کے ہیں؟ وہ دم

بخود رہ گئے۔(تذکرہ شیخ الہندص ۱۳۱ ۵)

بے نظیر تحمل:

ایک دن طلبہ نے حضرت شیخ الہند سے فرمائش کی کہ حضرت! تیرنا سکھلا دیجئے، چنانچہ جمعہ کے دن سویرے طلبہ کو ہمراہ لیکر دیوبند سے باہر تالاب پر گئے، اور ہر ایک کو تیرنا سکھایا، ایک پنجابی طالب علم نے کہا، حضرت! لائیے میں آپ کی کمر مل دوں، یہ کہہ کر اس نے کمر ملنا شروع کردی۔ حضرت شیخ الہند کا جسم بہت نرم تھا، طالب علم نے سمجھا کہ میل بہت ہے، اس لئے فوراً ریت اٹھا کر ملنا شروع کردیا، جس کی وجہ سے کھال چھل گئی، مگر حضرت نے اف نہ کی۔ جب واپس ہوئے تو راستے میں ایک بیل کو دیکھا جس کی کمر سے خون جاری تھا، پنجابی طالب علم نے کہا کہ کسی ظالم نے اس کو کتنی بری طرح مارا ہے، حضرت نے فرمایا، جی ہاں، کسی پنجابی نے اس کی کمر ملی ہوگی۔(تذکرۂ شیخ الہند۔ص ۱۶۸)

اگر میں کافر ہوں.....:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کا واقعہ ہے کہ ایک بار سفر میں وعظ سے پہلے انہیں کسی کا خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ ہم سنا ہے کہ آپ کافر ہیں اور جلاہے ہیں، اور یہ کہ اگر آپ نے یہاں وعظ میں کوئی اختلافی مسئلہ چھیڑا تو آپ کی خیر نہیں۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اس خط پر مشتعل ہونے کے بجائے وعظ کے آغاز میں لوگوں کو وہ خط پڑھ کر سنایا اور اس کے بعد فرمایا کہ اس خط میں تین باتیں کہی گئی ہیں، پہلی بات تو یہ کہ میں کافر ہوں، اس کا جواب تو یہ ہے کہ میں آپ کے سامنے کلمہ پڑھتا ہوں، ”**اشھد ان لاالٰہ الااللہ و اشھد ان محمداً رسول اللہ**“۔ اب اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ میں کافر ہوں یا نہیں، آپ کو معلوم ہے کہ اس کلمہ کی بدولت ستر برس کا کافر مسلمان ہوجاتا ہے، لہٰذا اگر بالفرض خدانخواستہ میں کبھی کافر تھا بھی تو اس کلمے کے بعد مسلمان ہوگیا، لہٰذا اس بحث کی ضرورت نہیں۔

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ میں جلاہا ہوں، اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں کوئی نکاح کا پیغام لے کر نہیں آیا ہوں، جس کے لئے اس تحقیق کی ضرورت ہو، اگر بالفرض میں جلاہا ہوں مگر دین کی صحیح بات بتاتا ہوں تو محض جلاہا ہونے کی وجہ سے اسے رد نہیں کرنا چاہئے، ویسے اگر کسی کو

واقعی میرے نسب کی تحقیق مقصود ہو تو تھانہ بھون کے لوگوں سے خط لکھ کر تحقیق کر لے۔

تیسری بات یہ کہی گئی کہ میں وعظ میں کوئی اختلافی مسئلہ بیان نہ کروں، سو اس کا جواب یہ ہے کہ میں یہاں وعظ کہنے کے لئے خود نہیں آیا ہوں مجھے اس مقصد کے لئے بلایا گیا ہے، اگر اس مجمع میں سے کوئی ایک صاحب بھی اٹھ کر مجھے وعظ کہنے سے منع فرما دیں گے تو میں وعظ نہیں کہوں گا اور وعظ میں میری عادت اختلافی مسائل کو موضوع بنانے کی نہیں ہے، لیکن اثناء وعظ کوئی اختلافی مسئلہ آجاتا ہے اور اس کی وضاحت ضروری ہوتی ہے تو پھر اس کے بیان سے رکتا بھی نہیں، یہی عمل اس وقت بھی ہوگا، اب اگر آپ بات سننا چاہیں تو میں شروع کروں ورنہ رک جاؤں۔

اس اندازِ کلام کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی ایک شخص نے بھی وعظ میں رکاوٹ نہ ڈالی اور پھر جب وعظ شروع ہوتا تو اتفاق سے اختلافی مسائل بھی وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے اور بہت سے مخالفین اتنے متأثر ہوئے کہ ہم خیال بن گئے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ۱۔ ص ۴۲۰)

خادم کے ساتھ برتاؤ:

حکیم الامت حضرت تھانوی کے ایک خادم نیاز صاحب تھے، ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے حضرت کی خدمت میں شکایت کی کہ انہوں نے بلا وجہ کچھ لوگوں سے سخت کلامی کی ہے، تھوڑی ہی دیر میں نیاز صاحب آگئے تو حضرت نے ان سے قدرے تلخ انداز میں کہا: کیوں نیاز میاں! تم ہر وقت لوگوں سے کیوں لڑتے پھرتے ہو؟ اس کے جواب میں ان کے منہ سے نکل گیا۔

''حضرت اللہ سے ڈرو، جھوٹ نہ بولو''۔

اندازہ لگایئے! اگر آج کسی بڑے سے بڑے بااخلاق شخص یا عالم کے سامنے کوئی اس کا ملازم یہ جملہ کہے تو اس کا غصہ کس انتہا پر پہونچے گا؟ لیکن یہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ تھے کہ اپنے ملازم کی زبان سے ''اللہ سے ڈرو'' کا جملہ سنتے ہی سارا غصہ کافور ہوگیا، اور فوراً گردن جھکا کر ''استغفر اللہ، استغفر اللہ'' کہتے ہوئے دوسری طرف تشریف لے گئے، درحقیقت عین غصے کی حالت میں ملازم سے یہ جملہ سن کر حضرت کو تنبہ ہوا کہ میں نے صرف ایک طرف کی بات سن کر ملازم کو ڈانٹنا شروع کر دیا ہے حالانکہ پہلے اس کی بات بھی سننی چاہئے تھی، اس تنبہ کے ساتھ آپ کا طرز عمل بدل گیا۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی نے فرمایا کہ نیاز صاحب ویسے بڑے باادب تھے حضرت سے بے پناہ عقیدت ومحبت کا تعلق رکھتے تھے، ان سے ایسی بے ادبی کا جملہ جان بوجھ کر نہیں نکلا تھا، بلکہ غالباً وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ جن لوگوں نے آپ سے شکایت کی ہے وہ اللہ سے ڈریں، جھوٹ نہ بولیں، لیکن شدت جذبات کی بدحواسی میں ان کے منہ سے یہ جملہ حضرت ہی کے لئے نکل گیا۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ۱۔ ص ۴۴۸)

رضا بالقضا:

حضرت مفتی شفیع صاحب نے اپنا واقعہ سنایا کہ:

''میں نے دیوبند میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کو اطلاع دی کہ فلاں گاڑی سے تھانہ بھون پہونچوں گا، اتفاق سے دیوبند والی گاڑی لیٹ ہوگئی، اور سہارن پور دیر سے پہونچی، تھانہ بھون والی گاڑی چلی گئی، مفتی صاحب جب سہارن پور پہونچے تو معلوم ہوا کہ تھانہ بھون والی گاڑی اپنے وقت پر روانہ ہوگئی ہے، حضرت نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ اب بھاگ دوڑ بیکار ہے، سکون سے اسٹیشن کی مسجد میں جا کر لیٹ گیا کہ شام کی گاڑی سے چلا جاؤں گا لیکن ایک ہندو بھی تھا، اسے گاڑی سے کسی ضروری کام سے جانا تھا، اسے جب یہ معلوم ہوا کہ گاڑی نکل گئی ہے تو غصہ سے لائن پر بیٹھ گیا، سر پر دھوپ، گرمی کا موسم، پسینہ سے شرابور، شام تک وہیں بیٹھا رہا کہ گاڑی کیوں گئی؟۔

یہ واقعہ بیان کر کے فرمایا کہ میں نے دیکھا تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ یہ تقدیر کا قائل نہیں ہے ورنہ اتنا پریشان نہ ہوتا، میں تقدیر کا قائل تھا، جہاں تک تدبیر کام کرسکتی تھی میں نے کوشش کی لیکن غیر اختیاری امر میں مجبور تھا، میں آرام سے اللہ کی مشیت پر خوش اور وہ اپنی تدبیر کی ناکامی پر پریشان تھا لہٰذا دونوں شام کی گاڑی سے روانہ ہوئے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ۲۔ ص ۱۱۰۲)

عجز وانکسار:

امیر شاہ خان صاحب نے فرمایا کہ ایک پنجابی ڈاکٹر مکہ معظّمہ گیا تھا، حافظ ......کی بیوی سے ان کا نکاح ہوگیا تھا، اس نکاح میں کچھ باتیں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی طبیعت کے خلاف بھی ہوئی تھیں، اور یہ ڈاکٹر بھی کچھ اچھا آدمی نہ تھا، چنانچہ اس کو میں مکہ سے جانے سے پہلے جانتا تھا، اس ڈاکٹر نے ایک مرتبہ گستاخانہ طور پر حضرت حاجی صاحب سے کہا کہ مجھے تو آپ کے

اندر کوئی کمال نظر نہیں آتا، رہی آپ کی شہرت تو یہ مولوی رشید احمد صاحب اور مولوی قاسم صاحب کی وجہ سے ہوئی، پھر مجھے حیرت ہے کہ مولوی رشید احمد صاحب اور مولوی قاسم صاحب آپ سے کس طرح بیعت ہو گئے؟ اللہ رے نفوس قدسیہ! کہ اس کو سن کر ذرا تغیر نہ ہوا، مسکرا کر فرمایا کہ ہاں بھائی، بات تو بہت ٹھیک کہتے ہو، مجھے خود بھی حیرت ہے کہ یہ حضرات میرے کیوں معتقد ہو گئے ہیں؟ اور لوگ مجھے کیوں مانتے ہیں؟۔ (ارواح ثلاثہ۔ص ۱۳۷)

شاہانہ تحمل:

خاں صاحب نے فرمایا کہ مجھ سے مولوی محمد اسماعیل صاحب کاندھلوی نے بیان فرمایا کہ حضرت سید احمد شہید صاحب کے لوگوں میں ایک صاحب سید امیر علی تھے، جو نہایت متقی اور پرہیزگار تھے، یہ صاحب نواب وزیرالدولہ کے مقرب تھے اور اہل حاجت کی سفارشیں بہت کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ انہوں نے نواب صاحب سے کوئی سفارش کی اور نواب صاحب نے وعدہ فرمالیا، مگر کسی وجہ سے اس کا ایفا نہ ہوسکا، اس پر سید امیر علی شاہ کو غصہ آیا اور سر دربار نواب صاحب کو تھپڑ ماردیا، نواب صاحب کا ظرف دیکھئے کہ کچھ نہیں کہا اور خاموش ہو گئے، اس کے بعد جو سید صاحب کے عزیز واقارب ریاست میں موجود تھے، نواب صاحب ان کے پاس گئے اور ان سے سید امیر علی کا واقعہ بیان کیا اور کہا کہ مجھے اس واقعہ سے ذرا ملال نہیں ہوا، انہوں نے تھپڑ مارا ہے، اگر وہ میرے جوتے مار لیتے تب بھی مجھے ملال نہ ہوتا، مگر ان سے ذرا اتنا کہہ دیا جائے کہ حق تعالی نے ریاست کا کام میرے سپرد فرمایا ہے، اور اس میں وقار قائم رہنے کی ضرورت ہے اور سر دربار ایسا کرنے سے سیاست میں خلل آتا ہے، اس لئے وہ دربار میں اس کا لحاظ رکھیں، اور تنہائی میں انہیں اختیار رہے، چاہے وہ مجھے جوتے مار لیں۔ (ارواح ثلاثہ۔ص ۲۹۰)

نزاع سے گریز:

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ نے عرصۂ دراز تک غیر آباد رہنے کے بعد شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی خانقاہ آباد فرمائی اور اس کے حجرہ میں درس وتدریس کا سلسلہ بھی قائم فرمادیا، پھر ضرورت کے باعث اس میں ایک سہ دری بھی حجرہ کے سامنے تعمیر کرادی، تو شیخ کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے پیرزادوں میں بے چینی پھیلنے لگی، اور بات کا تبنگڑ بنانے لگے،

کمیٹیاں کیں، جلسے کئے، گھر کے بیٹھکوں میں بیٹھ بیٹھ کر مشورے ہوئے کہ آج مولوی رشید احمد نے سہ دری بنوائی ہے، کل کو کچھ اور عمارت بنوا کر اپنی ملکیت کا دعوی کر دیں گے، چلو ان کو اس مکان سے بے دخل کریں اور جو کچھ لاگت اس تعمیر میں لگی ہے، وہ ان کو دے کر قبضہ چھڑائیں، چنانچہ ایک بڑا مجمع پیرزادوں کا آپ کے پاس آیا اور حرف مطلب زبان پر لایا۔

عام طور سے جیسا کہ دستور ہے کہ یوں سمجھ رہے تھے کہ قبضہ چھوٹنا آسان نہیں ہے، مولانا سے مخالفت بھی ہوگی، لٹھ بھی چلیں گے، دو چار سر بھی پھوٹیں گے، اور خدا جانے کیا کیا کچھ وقوع میں آئے گا، اس لئے جلسہ کا جلسہ اور جتھے کا جتھہ حاضر خدمت ہوا۔

حضرت مولانا کو کچھ خبر نہ تھی کہ مجمع نے یہ تکلیف کیوں اٹھائی؟ اور کس غرض سے آئے؟ آخر ان سے ایک شخص آگے بڑھ کر یوں کہنے لگا کہ مولوی صاحب! ان لوگوں کا منشا یہ ہے کہ آپ اس جگہ کو چھوڑ دیں، اور جو لاگت خرچ ہوئی ہے وہ لے لیویں، اس وقت آپ کو آنے والوں کا عندیہ معلوم ہوا اور آپ نے نہایت سادگی کے ساتھ جواب دیا کہ بہت اچھا، اتنی سی بات کے لئے مجمع کے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر کسی ادنی آدمی اور اپنے یہاں کے نائی، دھوبی سے بھی یہ پیغام کہلا بھیجتے تب بھی مجھ کو چھوڑ دینے میں تأمل نہ ہوتا، یہ فرما کر آپ نے تیس چالیس روپیہ جو کچھ بھی مکان کی لاگت میں جیب خاص سے خرچ کئے تھے، لے لئے، البتہ جو روپیہ چندہ سے اس میں صرف ہوتا تھا، وہ نہ لیا اور اسی وقت طلبہ سے فرمایا کہ بستر، کپڑے اور لکھنے پڑھنے کا سامان کتابیں وغیرہ سب نکال لو اور حجرے خالی کر دو۔

بعد میں ان پیرزادوں نے بہت معافی مانگی اور دوبارہ تشریف آوری کی درخواست کی جو حضرت نے قبول فرمالی۔ (تذکرۃ الرشید۔ ج ۱۔ص ۹۷)

ایثار و بے نفسی:

سید صاحب کے لشکر میں مولوی عبدالوہاب صاحب ایک فرشتہ خصلت بزرگ آٹا تقسیم کرنے کا کام کرتے تھے، ایک روز آٹا تقسیم کر رہے تھے، میر امام علی عظیم آبادی آٹا لینے کو آئے، وہ نووارد تھے، اور بڑے قوی اور جسیم تھے، آٹا وار سے تقسیم ہوتا، جو پہلے آتا، وہ پہلے پاتا، جو پیچھے آتا، وہ پیچھے پاتا، وہ پہلے مانگنے لگے، مولوی صاحب نے کہا کہ تمہارا ابھی وار آتا ہے، ٹھہر جاؤ، وہ

جلدی کرنے لگے، انہوں نے نہ مانا، آخر میر امام علی نے مولوی صاحب کو دھکہ دیا اور وہ گر پڑے، وہاں قندھاری بھی آٹا لینے کو بیٹھے تھے، ان کو برا معلوم ہوا اور سب مل کر میر امام علی کو مارنے پر تیار ہوئے، مولوی صاحب نے قندھاریوں کو روکا، اور کہا کہ وہ ہمارا بھائی ہے، دھکا دیا تو ہم کو دیا، تم سے کیا مطلب؟ وہ سب نادم ہوکر چپ ہورہے، مولوی صاحب نے ان کو آٹا دیا، وہ اپنے ڈیرے کو گئے، لوگوں نے سید صاحب سے جا کر یہ قصہ بیان کیا، جب اس دن مولوی صاحب رات کو حضرت کے پاس گئے تو آپ نے پوچھا کہ مولوی صاحب! آج میر امام علی نے تم سے کیا قصہ کیا؟ انہوں نے کہا، میرے نزدیک انہوں نے کچھ نہیں کیا، وہ تو بڑے نیک بخت آدمی ہیں، وہ آٹا لینے کو آئے، مجھ سے مانگا، ان کا وارنہ تھا، انہوں نے جلدی کی، اس میں ان کا دھکا میرے لگ گیا، بس اتنی بات تھی، سید صاحب یہ بات سن کر خاموش رہے، کسی نے یہ بات میر امام علی کو پہونچائی کہ مولوی عبدالوہاب صاحب نے تمہارے متعلق سید صاحب سے ایسی گفتگو کی ہے، وہ اپنی حرکت پر بہت نادم ہوئے اور اسی وقت سید صاحب کے سامنے آکر مولوی عبدالوہاب سے اپنی خطا معاف کرائی اور مصافحہ کیا۔ (سیرت سید احمد شہید۔ ج ۲۔ ص ۹۴)

قصاص کا ایک مقدمہ:

لشکر مجاہدین میں غازی پور کے رہنے والے لاہوری نام کے ایک شخص تھے جو قاضی مدنی بنگالی کے گھوڑے کی خدمت کرتے تھے، شکل وصورت میں اگرچہ کم رو اور حقیر تھے مگر صالحیت اور خوش اخلاقی میں بے نظیر تھے، ایک شخص عنایت اللہ نام کے ’منڈیا ہو‘ کے رہنے والے جماعت خاص میں تھے، سید صاحب کے پلنگ کے قریب رہا کرتے تھے، آپ کے پرانے رفیقوں میں تھے، آپ کے ساتھ بیت اللہ شریف کو بھی گئے تھے، اور آپ ان سے بہت محبت فرماتے تھے، یہ عنایت اللہ ایک روز لاہوری کے ڈیرے پر گئے، لاہوری اس وقت ڈیرے پر نہیں تھے، گھوڑے کے دانے بھگونے کا ایک طاش وہاں رکھا تھا، عنایت اللہ وہ طاش آٹا گوندھنے کے لئے اپنے ڈیرے پر اٹھالائے، لاہوری اپنے ڈیرے پر آئے اور دانہ بھگونے کے لئے طاش تلاش کیا تو نہ پایا لوگوں سے پوچھا، کسی نے کہا کہ تمہارا طاش عنایت اللہ لے گئے ہیں، وہ عنایت اللہ کے پاس گئے اور کہا کہ تم ہمارا طاش بلا پوچھے اٹھالائے، ہم کو دانہ بھگونا ہے، ہمارا طاش ہم کو دو، اس وقت خشک آٹا

گوندھنے کے واسطے طاش میں نکال رکھا تھا، عنایت اللہ کے مزاج میں ذرا تندی تھی، لاہوری سے کہنے لگے کہ تمہارا طاش کیسا؟ طاش سرکاری ہے، ہم اپنا کام کر کے دیں گے۔

لاہوری نے کہا کہ بے شک طاش سرکاری ہے، مگر قاضی مدنی کی تحویل میں ہے، اور انہوں نے ہمارے سپرد کیا ہے اور تم ہماری اجازت کے بغیر لائے ہو، اس پر الٹے گرم ہوتے ہو، ہمارا حرج ہوتا ہے، ہم اپنا طاش لے جائیں گے، عنایت اللہ نے کہا کہ بھلا دیکھیں، تم کیوں کر لے جاؤ گے؟ لاہوری نے طاش کا آٹا عنایت اللہ کے کپڑے پر رکھ دیا، اور طاش لے کر اپنے ڈیرے پر چلے، عنایت اللہ نے اٹھ کر دو گھونسے لاہوری کے پہلو میں مارے اور طاش چھین لیا، لاہوری بے تاب ہو کر گر پڑے اور نالہ وفریاد کرنے لگے، لوگوں نے ان کو اٹھایا اور پانی پلایا۔

یہ قصہ سید صاحب کے خاص برج کے نیچے ہوا، کسی نے آپ کو اطلاع کی کہ لاہوری کو عنایت اللہ نے مارا ہے، یہ بات سن کر آپ برج کی چھت سے سیڑھی پر آئے، اور لاہوری اور عنایت اللہ کو بلایا، حال پوچھا، لاہوری نے پورا ماجرا سنایا، آپ نے عنایت اللہ سے پوچھا کہ یہ قصہ یوں ہی پیش آیا؟ یا اس میں کچھ فرق ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ واقعہ یوں ہی ہے، یہ سن کر آپ کمال ناخوش اور خفا ہوئے اور عنایت اللہ سے کہا کہ تم اپنے دل میں یوں جانتے ہو گے کہ ہم سید صاحب کے پرانے رفیق اور ان کی پلنگ کے پاس رہتے ہیں، تم کو یہ خیال نہیں کہ ہم یہاں اللہ کے واسطے آئے ہیں، اور کام ایسے نکمے کرتے ہو، تم سوچتے ہو کہ لاہوری قاضی مدنی کا سائیس اور کم رو وحقیر ہے، یہی جان کر تم نے اس کو مارا، یہ تم نے بڑی زیادتی کی اور حرکت بے جا کی، ہمارے نزدیک تم اور لاہوری بلکہ سب برابر ہیں، کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہے، سب لوگ خدا کے واسطے آئے ہیں۔

اس کے بعد آپ نے حافظ صابر اور شرف الدین بنگالی سے فرمایا کہ ان دونوں کو قاضی حبان صاحب کے پاس لے جاؤ، عنایت اللہ کی زیادتی ہے، ان سے کہنا کہ اس معاملہ میں کسی کی رورعایت نہ کریں، شرع شریف کے موافق فیصلہ کر دیں۔

جب آپ نے سب کے سامنے یوں فرمایا تو پھلت والے لوگ جن کی جماعت میں عنایت اللہ تھے، آپس میں کہنے لگے کہ اب لاہوری کو کسی طرح راضی کرنا چاہئے، اگر وہ راضی ہو کر

معاف کردے تو بہتر ہے، یہ بلا ٹل جائے گی، ورنہ عنایت اللہ پر ضرور تعزیر آئے گی، انہیں میں سے دو تین شخصوں نے لاہوری کو سمجھایا کہ بھائی صاحب! اب عنایت اللہ کی یہ زیادتی تم پر ہوگئی، اور انہوں نے بہت برا کیا، مگر وہ تمہارے بھائی ہیں، بہتر یہی ہے کہ اس کا قصور معاف کردو، اور خوشامد کے طور پر کچھ دینے پر راضی ہوگئے، مگر لاہوری نے کسی طرح نہ مانا، اور کہا کہ بھائیو! اب تو جو کچھ سید صاحب نے فرمایا، میں اس پر راضی ہوں، وہاں چل کر جو کچھ ہوگا، ہو رہے گا، یہاں اس معاملہ میں مجھ سے نہ بولو، وہ مجبور ہوکر چپ ہو رہے، اور حافظ صابر وشرف الدین ان دونوں کو قاضی حبان کے پاس لے گئے۔

قاضی صاحب بستی کی مسجد میں تھے، اس وقت گھڑی ڈیڑھ گھڑی دن باقی ہوگا، قاضی صاحب نے پوچھا، بھائیو! اس وقت سب مل کر کہاں آئے ہو؟ حافظ صابر وشرف الدین نے ان دونوں کا حال بیان کیا کہ اس طور سے لڑائی ہوئی اور جو سید صاحب نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا، وہ بھی عرض کردیا، قاضی صاحب نے لاہوری سے معاملہ پوچھا، انہوں نے شروع سے جو گزرا تھا، بیان کیا، پھر عنایت اللہ سے پوچھا، انہوں نے ویسا ہی کہا، جیسا لاہوری نے کہا تھا، قاضی صاحب نے فرمایا کہ ''اب تو اس وقت شام ہوگئی ہے، اس وقت جاؤ، کل نماز اشراق کے بعد آنا، ہم تمہارا فیصلہ کردیں گے''۔ وہ اپنے اپنے ڈیرے پر آگئے۔

نماز مغرب کے بعد شیخ عبدالرحمان رائے بریلی والے قاضی صاحب کے پاس گئے، وہ ان کے بڑے دوست تھے، انہوں نے کہا، قاضی صاحب! کوئی تدبیر آپ ایسی کریں کہ لاہوری راضی ہوجائے، اور عنایت اللہ ذلت سے بچ جائے، اس امر میں زیادتی ضرور عنایت اللہ کی ہے، اور جو لاہوری کسی طرح نہ مانے تو پھر مجبوری ہے، پھر جو حکم شرع شریف کا ہو، وہ آپ جاری کردیں قاضی صاحب نے فرمایا: شیخ صاحب! آپ بہت اچھا فرماتے ہیں، ہم اول لاہوری کو سمجھائیں گے، حتی الامکان اس میں کمی نہ کریں گے، اگر اس نے مان لیا تو بہتر ہے، نہیں تو حکم خدا ورسول کے موافق انصاف کیا جائے گا۔

اگلے روز دو تین گھڑی دن چڑھے حافظ صابر اور شرف الدین، لاہوری اور عنایت اللہ کو لے کر قاضی صاحب کے پاس آگئے، انہوں نے عنایت اللہ اور لاہوری کو سامنے بیٹھایا، اور پہلے

عنایت اللہ کی طرف مخاطب ہوکر خوب ملامت کی کہ تم نے بہت برا کیا اور تم سزا کے قابل ہو، پھر لاہوری کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ بھائی صاحب! تم بہت نیک بخت ہو اور بے شر آدمی ہو، اور تم سب صاحبان ہندوستان سے اپنا اپنا گھر بار چھوڑ کر محض جہاد فی سبیل اللہ کے واسطے آئے ہو کہ اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہو اور آخرت میں ثواب ملے، اور دنیا کا کارخانہ تو چند روز کے واسطے خواب و خیال کی طرح ہے، سو بات یہ ہے کہ عنایت اللہ تمہارا بھائی ہے، اور اس سے شامت نفس کے سبب یہ قصور ہو گیا، جو اس نے تم کو مارا، اگر اس کا قصور معاف کردو اور دونوں مل جاؤ تو بہت خوب بات ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا اجر پاؤ گے، اور جو تم اس کا عوض لوگے تو برابر ہو جاؤ گے، جو معاف کرنے میں ثواب ہے، وہ نہ ملے گا، معاف کرنا بھی خدا اور رسول کا حکم ہے، اور عوض لینا بھی، مگر معاف کرنے میں ثواب اور عوض لینے میں اپنے نفس کی خوشی ہے۔

یہ بات سن کر لاہوری نے کہا: قاضی صاحب! اگر ہم عنایت اللہ کو معاف کردیں تو ثواب پاویں گے، اور جو اپنا عوض لے لیں تو برابر ہو جاویں گے، بھلا کسی طرح کا گناہ تو نہیں ہے؟ انہوں نے کہا: کچھ گناہ نہیں ہے، دونوں حکم خدا اور رسول کے ہیں، جو چاہو منظور کرو، لاہوری نے کہا: میں اپنا حق چاہتا ہوں، قاضی صاحب نے کچھ دیر سکوت کر کے فرمایا کہ ”بھائی لاہوری حق تو تمہارا یہی ہے کہ تم بھی عنایت اللہ کے اسی جگہ دو گھونسے مارلو، اور عنایت اللہ کو لاہوری کے سامنے کھڑا کردیا کہ اپنا عوض لے لو، لاہوری نے کہا کہ حق ہمارا یہی ہے کہ ہم بھی اسی جگہ دو گھونسے ماریں، قاضی صاحب نے کہا: ہاں، بے شک، یہی بات ہے۔

اس وقت جو لوگ موجود تھے سب کی امید منقطع ہوگئی، اور یقین ہو گیا کہ لاہوری بے عوض لئے نہ چھوڑے گا، لاہوری نے کہا: بھائیو! جو سب حاضر ہو گواہ رہو کہ قاضی صاحب نے ہم کو ہمارا عوض دلایا، اور ہم لے سکتے ہیں، مگر ہم نے محض اللہ تعالیٰ کے رضا مندی کے لئے چھوڑ دیا، اور عنایت اللہ کو اپنی چھاتی سے لگالیا، اور مصافحہ کیا، تمام لوگ جو وہاں تھے، لاہوری کو آفریں کرنے لگے، اور شاباشی دینے لگے کہ تم نے بڑے مردوں اور دینداروں کا کام کیا۔

یہ خبر سید صاحب کو ہوئی تو انہوں نے لاہوری کو بلایا اور اپنے پاس بٹھایا اور فرمایا کہ ”تم نے یہ کام بڑے دیندار مردوں کا کیا کہ اپنے بھائی کا قصور معاف کردیا اور عوض نہ لیا، اس کا اجر اللہ

تعالیٰ تم کو آخرت میں دے گا، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو یہی توفیق نیک عطا کرے''، اور لاہوری کے لئے آپ نے دعا کی۔ (سیرت سید احمد شہید۔ ج ۲۔ ص ۱۵۷)

عفو و حلم:

پیر داد خان باشندہ لوہانی پور کی گائے حضرت سید احمد شہید کے خربوزے کے کھیت میں چلی گئی، اور بہت نقصان کیا، چوکیداروں نے اس گائے کو دوڑا کر پیر داد خان کے گھر پہونچا دیا، گائے دوڑنے کی وجہ سے بہت سست ہوگئی، پیر داد خان نے بہت غصہ کیا اور آپ کے پاس آ کر بیٹھ گئے، چند شرفاء وہاں موجود تھے، اس وقت ایک بہت خوش رنگ اور عمدہ خربوزہ، جو فصل کا پہلا پھل تھا اور تین آم جو موسم کے ابتدائی پھل تھے، رکھے ہوئے تھے، آپ نے بڑی مہربانی اور شفقت کے ساتھ ان میں سے ایک آم میاں شیخ امان اللہ رائے بریلی کو، جو ایک بزرگ آدمی تھے، عطا فرمایا، اور دوسرا آم دوسرے صاحب کو دیا، اور خربوزہ پیر داد خان کو عنایت فرمایا، ان دونوں بزرگوں نے تو تبرکاً وہ پھل لے لئے، لیکن پیر داد خان نے وہ خربوزہ وہیں آپ کے سامنے ڈال دیا اور کہا کہ میں نہیں لیتا، میاں شیخ امان اللہ کہنے لگے کہ یہ حضرت کا عطیہ ہے اور تمہارے لئے موجب برکت ہے، اس کو واپس نہیں کرنا چاہئے، وہ زیادہ غصے میں آ کر کہنے لگے کہ ہمارے لئے موجب برکت نہیں ہے، موجب حرکت ہے، اور برا بھلا کہنا شروع کر دیا، اور بے ادبی و گستاخی میں حد سے بڑھ گئے، آپ نے بڑی عاجزی اور انکساری سے معذرت کی اور فرمایا کہ میں فصل رکھانے والوں کو تنبیہ کروں گا، انہوں نے بہت برا کیا کہ تمہارے جانور کو تکلیف دی، اگر وہ جانور مر جاتا تو اس کے عوض میں اس سے اچھا جانور دیتے، اتنا رنج نہ کرو، سید عبدالرحمان جو اس قصے کے راوی ہیں، فرمایا کہ میں ایک کام سے بازار گیا ہوا تھا، واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ غلام رسول خان جو آپ کے گھوڑوں کی دیکھ بھال پر مقرر تھے، اور ذی عزت آدمی تھے، غصے کے مارے رو رہے ہیں، میں نے پوچھا خان صاحب خیریت ہے؟ انہوں نے کہا: عجیب قصہ ہے، اس بدتمیز آدمی نے حضرت کی شان میں گستاخی کی اور غیر مہذب الفاظ زبان سے نکالے، اور حد سے بڑھ گیا، میں نے چاہا کہ اس کو ڈانٹ دوں، اور اس کو بدتمیزی سے باز رکھوں، حضرت تو انتہا درجے کے بردبار ہیں، انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا اور فرمایا کہ یہاں سے چلے جاؤ، میں آپ کے حکم کی تعمیل میں باہر آ گیا، میاں

امان اللہ نے پیرداد خان کو بہت سمجھایا کہ اس طرح کی بے تمیزی اور بدکلامی شرفا کی شان کے خلاف ہے، پیرداد خان اپنے گھر چلے گئے، سید علم الہدی اور سید فخر الدین جو آپ کے بھائی بند تھے غصہ سے بھرے ہوئے آئے، اور کہا کہ ہم اس بدتمیز کی مرمت کریں گے، آپ نے فرمایا: خاموش رہو، ایسا نہیں چاہئے، نہیں تو اس کی جمعہ و جماعت ترک ہو جائے گی، صبر کرو۔

سید عبدالرحمان کہتے ہیں میں بھی غصے سے بے قابو ہو گیا، میں نے بھی آکر عرض کیا کہ یہ نالائق ایسی بدتمیزی کر کے یہاں سے سلامت چلا گیا، افسوس کہ میں موجود نہ تھا، آپ نے ان کو بھی ملامت کی اور کہا کہ تم بچے ہو، تم کیا جانو؟ اگر اس سے جمعہ و جماعت فوت ہو جائے گی تو اس کے حق میں بڑی قباحت ہو جائے گی، اس کے بعد آپ تیار ہوئے کہ میں خود معذرت کے لئے خان صاحب کے پاس جاؤں گا۔ آپ کا معمول تھا کہ بڑی بہن سے ملنے کے لئے قلعے تشریف لے جایا کرتے تھے، آپ گھوڑے پر سوار ہوئے اور لوگ آپ کے ساتھ چلے، بہن سے مل کر آپ لوہانی پور خان صاحب کے دروازے پر آئے، وہ آپ کی سواری دیکھ کر گھر میں گھس گئے، آپ گھوڑے سے اتر کر دروازہ پر بیٹھ گئے، اور فرمایا کہ آج خان صاحب سے خطا معاف کرائے بغیر نہیں جاؤں گا، خان صاحب گھر سے باہر نہیں آتے تھے، یہاں تک کہ گاؤں کے رؤسا و اشراف جمع ہو گئے، ان کو بڑی ملامت کی، اور ان کا ہاتھ پکڑ کر سید صاحب کے پاس کھینچ لائے، آپ ان سے بغل گیر ہوئے اور ان سے معافی چاہی، اور فرمایا کہ اگر گائے مر جاتی تو ہم تمہیں اس سے اچھی دیتے، پھر آپ نے ان کی ایسی دلجوئی اور خاطر داری کی کہ ان کو راضی کر کے گھر واپس ہوئے۔

پیرداد خان کے چھوٹے بھائی نورداد خان آپ کی یہ عاجزی وانکساری اور بھائی کا یہ غرور وتکبر دیکھ کر بھائی سے جدا ہو گئے، اور گھر بار چھوڑ کر آپ کے ساتھ ہو گئے، یہاں تک کہ بالاکوٹ میں آپ کے ساتھ شربت شہادت نوش کیا۔ (سیرت سید احمد شہید۔ ج ۲۔ ص ۴۷۲)

حلم وعفو:

مولوی سید جعفر علی ایک دوسرا واقعہ سید عبدالرحمان اور سید زین العابدین کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ سفر حج میں آپ کے ساتھ مولوی نصیر الدین اور شیخ نجم الدین پھکبت ساکنان لکھنؤ کے بھائی امام الدین بھی ہمراہ تھے، آپ ان کی بڑی مراعات کرتے تھے، اور ان کو بھی ابتدا میں

آپ کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی ارادت مندی اور عقیدت تھی، لیکن مکہ معظّمہ پہونچ کر بعض کج طبیعت لوگوں کے اغوا سے آپ کی طرف سے طبیعت میں بے اعتقادی اور مخالفت پیدا ہوگئی، ایک روز آپ اپنی قیام گاہ پر تشریف رکھتے تھے کہ حاجی عبدالرحیم کے رفیق حاجی عمر جو بڑے صالح وسعید، عابد وزاہد، متقی بزرگ تھے، آپ کی ملاقات کو آئے، آپ نے ان کی بڑی عزت وتوقیر فرمائی اور فرمایا کہ "ان جیسے آدمیوں سے ملائکہ کو بھی لحاظ آتا ہے، اور ایسے ہی آدمی ہوتے ہیں جو فرشتوں پر فضیلت رکھتے ہیں"۔ یہ سن کر امام الدین کو غصہ آگیا اور انہوں نے برملا کہا کہ آپ جھوٹ کہتے ہیں آپ نے انتہائی ملائمت سے فرمایا کہ بھائی غلط نہیں ہے اللہ کے بندوں میں محض خاص الخاص بندے خواص ملائکہ پر شرف رکھتے ہیں، آپ جس قدر نرمی اور آہستگی کے ساتھ یہ فرماتے، امام الدین اسی قدر غصے اور ترشی کے ساتھ آپ کو جواب دیتے، اور بدتمیزی سے پیش آتے، رامپور کے ایک شخص حافظ نابینا جو سید صاحب سے بداعتقاد تھے، اور کبھی کبھی کہتے تھے کہ آپ سخت دنیادار ہیں پاس سے گزر رہے تھے، یہ منظر دیکھ کر اپنے دل میں پشیمان ہوئے اور آپ کے حلم وبردباری اور بزرگی کی قائل ہوگئے، اور دوسرے روز انہوں نے حطیم میں آپ سے بڑی معذرت کی اور اپنی غلطی سے تائب ہوکر بیعت کی، اور مخلصین صادقین کے گروہ میں شامل ہوگئے۔ (سیرت سید احمد شہید ج ۲۔ ص ۴۷۴)

دل دشمناں ہم نکردند تنگ:

مولوی سید جعفر علی بیان کرتے ہیں کہ سدو خاں درانی، سید محمد خان شہید کے ساتھ سمہ کی بعض جگہوں میں شریک تھا، فتح کے بعد جب لشکر نے مال غنیمت جمع کیا تو سونے چاندی کے کچھ زیورات، مروارید، دو ٹوٹی ہوئی بندوقیں اور ایک زنگ آلود تلوار اس کے ہاتھ بھی لگی، اس نے مجاہدین کی فہمائش کے باوجود یہ مال، مال غنیمت میں شامل نہ کیا، لوگوں نے کہا بھی کہ تقسیم شرعی سے پہلے مال غنیمت پر قبضہ کرلینے سے سزا دنیا میں مار اور آخرت میں نار ہے، لیکن اس نے کچھ پرواہ نہ کی، بلکہ سید صاحب کی شان میں گستاخانہ لفظ بھی کہے اور وہاں سے بھاگ کر سید صاحب کے پاس چلا گیا، بعض مخلصین نے عریضے کے ذریعے سید صاحب کو اطلاع بھی کردی، قلعہ امب کے برج پر آپ ایک جماعت کے ساتھ تشریف رکھتے تھے، دوپہر کو جب مجلس برخواست ہوئی تو

آپ نے سدو خان کو طلب کیا اور ارشاد ہوا ''تم مال غنیمت میں جو کچھ لے کر آئے ہو، یہاں لے آؤ''، اس نے سب زیورات تھیلی سے نکال کر سامنے رکھ دیئے، آپ نے زیورات کو ملاحظہ بھی نہیں فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یہ چیزیں عورتوں کے قابل ہیں، ہمارے لائق نہیں، جاؤ ان کو اپنے سے علیحدہ کرو اور فروخت کر ڈالو، ہتھیار کو دیکھ کر فرمایا کہ ہاں یہ مردوں کے ہتھیار ہیں، یہ مجاہدین کے کام کے ہیں، اس کے بعد سدو خان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ سدو خان! سچ کہنا، تم نے یہ کہا تھا کہ میں اپنی درانی قوم کے پاس سے بھاگ کر آیا ہوں، اگر اس سید کے سینے پر ایک نیزہ مار کر اس کو شہید کر کے واپس چلا جاؤں گا تو وہ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیں گے، اور میری بڑی قدر ہوگی، اگر یونہی خالی ہاتھ گیا تو کون میری بات پوچھے گا؟ سدو خان نے شرم سے سر جھکالیا اور کہنے لگا کہ لوگوں نے مجھے تنگ کیا تو میری زبان سے ایسے لفظ نکل گئے، میں خطاوار ہوں، آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں اپنے سے زیادہ بہادر اور جواں مرد نہیں سمجھتا کہ تم میرے مقابلے میں آسکو، لیکن ایسے لشکر میں جس کے سردار قاضی حبان تھے، تمہیں ایسا لفظ کہنا بہت ناروا تھا، اگر یہ بات قاضی صاحب کے کان میں پڑ جاتی تو تمہیں زندہ نہ چھوڑتے، یہ تم نے اچھا کیا کہ میرے پاس آگئے، یہاں جو جی میں آئے کہو، انتقام تو انتقام، مجھے اس کی پرواہ نہیں، لیکن سواروں کے لشکر میں کبھی نہ جانا، ورنہ ایسی باتوں سے تمہاری جان چلی جائے گی۔ (سیرت سید احمد شہید۔ ج ۲۔ ص ۴۷۷)

☆☆☆☆☆☆

احتیاط وتقوی

للٰہیت کے معنی:

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی جب کانپور میں مدرس تھے، انہوں نے مدرسہ کے جلسہ کے موقع پر اپنے استاذ حضرت شیخ الہند کو بھی مدعو کیا، کانپور میں بعض اہل علم معقولات کی مہارت میں مشہور تھے، اور کچھ بدعات کی طرف مائل تھے، ادھر علماء دیوبند کی توجہ چونکہ خالص دینی علوم کی طرف رہتی تھی، اس لئے یہ حضرات یوں سمجھتے تھے کہ علماء دیوبند کو معقولات میں کوئی درک نہیں، حضرت تھانوی اس وقت جوان تھے، ان کے دل میں حضرت شیخ الہند کے بلانے کا داعیہ اس لئے تھا کہ حضرت کی تقریر ہوگی تو کانپور کے علماء کو پتہ چلے گا کہ علماء دیوبند کا علمی مقام کیا ہے؟ اور وہ معقولات میں کیسی دستگاہ رکھتے ہیں، چنانچہ جلسہ منعقد ہوا، اور حضرت شیخ الہند کی تقریر شروع ہوئی، حسن اتفاق کہ تقریر کے دوران کوئی معقولی مسئلہ زیر بحث آ گیا، اس وقت تک وہ علماء جن کو حضرت تھانوی، حضرت شیخ الہند کی تقریر سنانا چاہتے تھے، جلسہ میں نہیں آئے تھے، جب حضرت کی تقریر شباب پر پہونچی اور معقولی مسئلہ کا انتہائی فاضلانہ بیان ہونے لگا، تو وہ علماء جن کا حضرت تھانوی کو انتظار تھا، تشریف لائے، حضرت تھانوی اس موقع پر بہت مسرور ہوئے، کہ اب ان حضرات کو حضرت شیخ الہند کے علمی مقام کا اندازہ ہوجائے گا، لیکن ہوا یہ کہ جونہی حضرت شیخ الہند نے ان علماء کو دیکھا تقریر کو مختصر کرکے فوراً ختم کردیا، اور بیٹھ گئے، حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی موجود تھے، انہوں نے یہ دیکھا تو تعجب سے کہا کہ حضرت! اب تو تقریر کا وقت آیا تھا، آپ بیٹھ کیوں گئے، حضرت شیخ الہند نے جواب دیا، ہاں دراصل یہی خیال مجھ کو بھی آ گیا تھا، مطلب یہ کہ اب تک تقریر نیک نیتی کے ساتھ خالص اللہ کے لئے ہورہی تھی، لیکن یہ خیال آنے کے بعد اپنا علم جتانے کے لئے ہوتی، اس لئے روک دیا۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ۱۔ص ۲۳۱)

واقفیت کے حقوق:

ایک صاحب پان کی ڈبیہ پالش کی ہوئی لائے تو حضرت والا مفتی محمد شفیع صاحب نے فرمایا: کیا پالش کی اجرت دیدی ہے؟ لانے والے نے عرض کیا کہ حضرت وہ جاننے والا تھا، اس لئے اس نے نہیں لی، اس پر حضرت نے فرمایا یہ جاننے کا حق صرف ایک ہی جانب ہے یا دونوں طرف سے ہے؟ تم بھی کبھی جاننے کا حق ادا کرتے ہو، یا وہی پٹتا رہے، کبھی آنے دو آنے کی چیز تم بھی تو دیدیا کرو کہ یہ میرا جاننے والا ہے۔(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج۲۔ص۸۸۶)

حقوق مدرسہ میں احتیاط:

حضرت مفتی شفیع صاحب قدس سرہ نے اپنا واقعہ سنایا کہ دارالعلوم دیوبند کی ملازمت کے آخری سالوں میں بعض عوارض کی وجہ سے امور مفوضہ کے ادا کرنے کے لئے پورا وقت نہ دے سکتا تھا، کچھ کوتاہی ہو جاتی تھی، اور تنخواہ مجھے پوری مل جاتی تھی، مگر مجھے اس کا شدت سے احساس تھا، دارالعلوم سے علیحدہ ہوا تو مجھے بڑی فکر ہوئی کہ مدرسہ کا حق میرے ذمہ ہے، اس کے ادا کرنے کی کیا صورت ہو؟ اس وقت میرے پاس زائد سرمایہ بھی نہ تھا جو مدرسہ میں داخل کر دیتا، ہاں ایک ذاتی کتب خانہ کافی مالیت کا تھا، وہ میں نے مدرسہ میں داخل کر دیا اور مدرسہ کے حق سے سبکدوش ہوا، اور اس کی مجھے بڑی خوشی ہوئی۔(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج۲۔ص۱۰۸۴)

احتیاط کی مثال:

مولانا رشید احمد گنگوہی فرماتے تھے کہ شاہ اسحاق صاحب کے شاگردوں میں تین شخص نہایت متقی تھے، اول درجہ کے مولوی مظفر حسین صاحب، دوسرے درجہ کے شاہ عبدالغنی صاحب، تیسرے درجہ کے نواب قطب الدین خان صاحب۔ اس کے بعد فرمایا کہ ایک مرتبہ نواب قطب الدین صاحب نے شاہ اسحاق صاحب، مولوی محمد یعقوب صاحب اور مولوی مظفر حسین صاحب اور چند دوسرے احباب کی دعوت کی، شاہ اسحاق صاحب نے منظور فرمالی، اور مولوی محمد یعقوب صاحب نے بھی، مگر مولوی مظفر صاحب نے منظور نہ فرمائی، اس سے نواب قطب الدین صاحب کو ملال ہوا، اور انہوں نے شاہ اسحاق صاحب سے شکایت کی کہ میں نے مولوی مظفر حسین صاحب کی بھی دعوت کی تھی مگر انہوں نے انکار کر دیا، شاہ صاحب نے مولوی مظفر حسین صاحب پر عتاب

فرمایا، اور فرمایا کہ ارے مظفر! تجھے تقوی کی بدہضمی ہوگئی ہے، کیا نواب قطب الدین کا کھانا حرام ہے، انہوں نے عرض کیا، حاشا وکلا، مجھے نواب صاحب پر اس قسم کی بدگمانی نہیں ہے، شاہ صاحب نے فرمایا کہ، پھر تو کیوں انکار کرتا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! نواب صاحب نے آپ کی بھی دعوت کی ہے اور مولوی محمد یعقوب کی بھی اور ان کے علاوہ اور آدمیوں کی، اور آپ کو پالکی میں لے جائیں گے، اس میں بھی ضرور صرف ہوگا، اور نواب صاحب گو بگڑ گئے ہیں، پھر بھی نواب زادہ ہیں، وہ دعوت میں ضرور نوابانہ تکلف کریں گے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ نواب صاحب مقروض بھی ہیں، پس یہ مقروض ہیں اور جتنا روپیہ وہ دعوت میں صرف کریں گے، وہ ان کی حاجت سے زائد بھی ہے تو یہ روپیہ وہ اپنے قرض میں کیوں نہیں دیتے؟ ایسی حالت میں ان کا کھانا کراہت سے خالی نہیں، یہ بات شاہ صاحب کے ذہن میں بھی آ گئی، اور فرمایا کہ میاں قطب الدین! اب ہم بھی تمہارے یہاں کھانا نہ کھائیں گے۔ (ارواح ثلاثہ۔ص ۱۵۴)

کہاں تک نظر ہے؟:

مولانا تھانوی نے فرمایا کہ مولانا مظفر حسین صاحب جب کسی سواری پر سوار ہوتے تو پہلے مالک کو سب چیزیں دکھلا دیا کرتے تھے، اگر بعد میں کوئی خط بھی لاتا تو فرماتے بھائی! میں نے سارا اسباب مالک کو دکھایا ہے اور یہ اس میں سے نہیں ہے، لہٰذا تم مالک سے اجازت لے لو۔

(ارواح ثلاثہ۔ص ۱۵۶)

تقوی کے ساتھ دلداری:

مولانا تھانوی نے فرمایا کہ مولانا مظفر حسین صاحب ایک مرتبہ دہلی سے بہلی میں سوار ہوکر اپنے وطن کاندھلہ کو تشریف لا رہے تھے، بزرگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر شخص سے اس کے مذاق کے موافق گفتگو کیا کرتے ہیں، اس بہلی والے سے بہلی کے متعلق کچھ پوچھنے لگے کہ بیلوں کو راتب کتنا دیتے ہو؟ اور کیا بچت ہو جاتی ہے؟ اس سلسلہ میں بہلوان کی زبان سے نکل گیا کہ یہ ایک رنڈی کی ہے، اور میں اس کا نوکر ہوں، بھلا مولانا رنڈی کی گاڑی میں کیسے بیٹھ سکتے تھے؟ اب مولانا کا دقیق تقوی دیکھئے، فوراً نہ اترے تا کہ اس کی دل شکنی نہ ہو، تقوی برتنا بھی ہر شخص کو نہیں آتا، ذرا دیر کے بعد بولے کہ بہلی روک لینا، مجھے پیشاب کی ضرورت ہے، اس نے بہلی روکی،

آپ نے اتر کر پیشاب کیا، اوراس کے ساتھ استنجا سکھاتے چلے، کہاں تک چلتے، آخر ڈھیلا پھینک دیا، اس نے کہا، بیٹھ جایئے، فرمایا ٹانگیں شل ہوگئی ہیں، ذرا دور پیدل چلوں گا، تھوڑی دور چل کر اس نے پھر عرض کی، پھر ٹال دیا، پھر کہا، پھر ٹال دیا، پھر وہ سمجھ گیا، اور کہا مولانا سمجھ گیا، یہ رنڈی کی گاڑی ہے، آپ اس میں نہیں بیٹھیں گے، پھر لے جانے سے فائدہ؟ حکم دیجئے، لوٹ جاؤں، فرمایا: ہاں بھائی بیٹھوں گا تو نہیں مگر تم کو کاندھلہ چلنا ہوگا، کیوں کہ ممکن ہے کہ کوئی اس کے پاس کرایہ کو آیا ہو اور اس نے انکار کر دیا ہو تو اس کا خواہ مخواہ نقصان ہوگا، (یہاں پر شبہہ ہے کہ جب کرایہ دینا ہی تھا تو پھر کاندھلہ تک خالی بہلی کیوں لائے؟ تو بات یہ ہے کہ بعض طبیعتیں بلا کار گزاری کے لینا گوارا نہیں کرتیں یا اس کے سوا کوئی اور وجہ ہو) لہٰذا آپ کاندھلہ تک ویسے ہی پیدل آئے اور ہر منزل پر بیلوں کو گڑ، گھی اور گھاس دانہ کا ویسا ہی انتظام کیا اور مکان پر آ کر اس کو کرایہ دے کر واپس کیا۔ (ارواح ثلاثہ۔۱۵۶)

تقوی کا نور:

امیر شاہ خان صاحب نے فرمایا کہ حاجی منیر خاں صاحب، خان پوری (یہ صاحب مولوی محمد یعقوب صاحب کے برادر خورد جناب مولوی اسحاق صاحب سے بیعت تھے) اور فیض محمد خان صاحب نواب دتاؤلی اور میاں جی محمدی صاحب (یہ میرے استاذ سید صاحب سے بیعت تھے اور اورنگ آباد کے رہنے والے تھے) اور نواب قطب الدین صاحب اور میاں رحیم داد صاحب خورجوی اور مولوی محمد یعقوب صاحب نانوتوی، یہ لوگ میں نے ایسے دیکھے جن کی ولایت کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہ تھی، بلکہ ان کے چہروں ہی سے دیکھنے والوں کو معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ حضرات اولیاء اللہ ہیں، اس پر میں ایک بات سناتا ہوں۔

مراد آباد کی شاہی مسجد میں ایک صاحب امام تھے، میری ان سے بہت ملاقات تھی، اور مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، قرآن بہت اچھا پڑھتے تھے، حج بھی بہت کئے تھے، مگر ہمارے بزرگوں کے ساتھ ان کو عقیدت نہ تھی بلکہ کچھ سوءِ عقیدت تھی، ایک مرتبہ کسی پنجابی کے یہاں مولوی محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کی دعوت تھی، دعوت میں مَیں بھی شریک تھا، اور امام صاحب بھی، اور ہم لوگ دروازہ کے پاس بیٹھے تھے، جب کھانے سے فراغت ہو چکی تو ہم دونوں باہر آ کر کھڑے

ہوگئے، تھوڑی دیر میں مولانا محمد یعقوب صاحب کسی سے باتیں کرتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے نکلے، امام صاحب نے جو مولانا کی صورت دیکھی تو آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور کہا کہ مجھے ان حضرات سے ناحق بداعتقادی تھی، ان کی نورانی صورت، ان کی ولایت پر خود شاہد ہے، ایسی نورانی صورت خدا کے خاص بندوں کے سوا دوسروں کی نہیں ہوسکتی، اور ان پر اس وقت ایک حالت طاری ہوئی، جس سے بے تاب ہوگئے اور ہائے ہائے کہتے ہوئے انہوں نے مولانا کے قدم پکڑ لئے اور بہت روئے۔ (ارواح ثلاثہ۔ص ۲۴۸)

امانت میں احتیاط:

خاں صاحب نے فرمایا کہ مولوی محمد منیر صاحب مدرسہ دیوبند کے مہتمم تھے، ایک مرتبہ وہ مدرسہ کے ڈھائی سو روپئے لے کر مدرسہ کی سالانہ کیفیت چھپوانے کے لئے دہلی آئے، اتفاق سے روپئے چوری ہوگئے، مولوی صاحب نے اس چوری کی کسی کو اطلاع نہیں کی اور مکان آکر اپنی کوئی زمین وغیرہ بیع کی اور ڈھائی سو لے کر دہلی پہونچے اور کیفیت چھپوا کر لے آئے، کچھ دنوں کے بعد اس کی اطلاع اہل مدرسہ کو ہوئی، انہوں نے مولانا گنگوہی کو واقعہ لکھا اور حکم شرعی دریافت کیا، وہاں سے جواب آیا کہ مولوی صاحب امین تھے، اور روپیہ بلا تعدی کے ضائع ہوا ہے، اس لئے ان پر ضمان (تاوان) نہیں، اہل مدرسہ نے مولوی محمد منیر صاحب سے درخواست کی کہ آپ روپیہ لے لیجئے، اور مولانا کا فتوی دکھلایا، مولوی صاحب نے فتوی دیکھ کر فرمایا کہ کیا میاں رشید احمد نے فقہ میرے ہی لئے پڑھی ہے؟ اور کیا یہ مسائل میرے ہی لئے ہیں؟ ذرا اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر تو دیکھیں، اگر ان کو ایسا واقعہ پیش آتا تو کیا وہ بھی روپیہ لے لیتے؟ جاؤ لے جاؤ، اس فتوی کو، میں ہرگز روپیہ نہ لوں گا۔ (ارواح ثلاثہ ۳۴۰)

ترک شریعت پر نفرت:

ایک مرتبہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ اشراق کی نماز سے فارغ ہوکر باہر تشریف لائے اور معمول کے خلاف چادر سے منہ ڈھانپ کر لیٹ رہے، ایک دن پہلے کرنال سے ایک برات گنگوہ آئی تھی، جس میں رقاصہ بھی تھی، اس برات میں آنے والے چند آدمی حضرت امام ربانی کے واقف کار بھی تھے، جو صبح کو سلام کے لئے حاضر آستانہ ہوئے، دیکھا تو

حضرت مولانا چادر سے منہ ڈھانپے لیٹے ہیں، دیر تک یہ لوگ بیٹھے رہے، مگر آپ نے منہ نہیں کھولا آخرایک صاحب بولے کہ حضرت ہم تو زیارت کے لئے حاضر ہوئے تھے، آپ نے منہ ڈھانپے ہوئے رنج اور غصہ کے ساتھ جواب دیا کہ میری زیارت میں کیا دھرا ہے؟ آخراس مجمع کے ایک سفید ریش شخص نے سمجھا کہ رقاصہ کا ساتھ لانا اس محرومیت کا سبب ہوا ہے، معذرت کے طور پر عرض کیا کہ حضرت! ہم تو رنڈی کو ساتھ نہیں لائے، بیٹی والوں کی حرکت ہے، آپ نے بے ساختہ ارشاد فرما کہ ''میاں! بیٹی والے کسی کے خدا تو ہیں نہیں کہ ان کا کہنا ماناہی جائے''۔

اس جواب سے حاضرین پر اس درجہ اثر ہوا کہ بہتیرے دل بھر آئے، آخر جب لوگ چلے گئے تو آپ نے چادر منہ ہٹائی اور اٹھ بیٹھے۔ (تذکرۃ الرشید۔ ج ۲۔ص ۸)

من کثر سواد قوم....:

آپ (حضرت گنگوہی) کے جد امجد حضرت عبدالقدوس گنگوہی علیہ الرحمہ کا عرس جس کے بند کرنے پر آپ قادر نہ تھے، اس درجہ آپ کو اذیت پہونچاتا تھا کہ صبر کرنا دشوار اور آپ کے لئے زبردست مجاہدہ تھا، اول اول آپ ان دنوں گنگوہ چھوڑ دیتے اور رامپور تشریف لے جایا کرتے تھے، مگر آخر میں ایذاءِ قلبی کے برداشت کرنے کی آپ کو قوت دی گئی، تو یہ زمانہ بھی آپ کو اپنی خانقاہ میں ہی رہ کر گزارنا پڑا، اس موسم میں آپ کو اپنے منتسبین کا آنا اس درجہ ناگوار گزرتا تھا کہ آپ اکثر ناراض ہوجاتے اور ترک تکلم فرمادیتے تھے، ایک بار جناب مولانا محمد صالح آپ کی زیارت کے شوق میں بے تاب ہوکر گھر سے نکل کھڑے ہوئے، اتفاق سے عرس کا زمانہ تھا، اگرچہ آنے والے خادم کو اس کا وہم بھی نہیں گزرا مگر امام ربانی قدس سرہ اپنے شیدائیت سنت سے دل کے ہاتھوں مجبور تھے، آپ سے نہ ہوسکا کہ ان کی مزاج پرسی کریں، یا محبت و مدارات سے پیش آئیں، آپ نے بجز سلام کا جواب دینے کے ان سے یہ بھی نہ پوچھا کہ روٹی کھائی یا نہیں؟ اور کب آئے ہو؟ یا کیوں آئے ہو؟ مولوی محمد صالح کو دو دن اسی طرح گزر گئے، حضرت کا رخ پھرا ہوا دیکھنا جس درجہ ان کو شاق گزر رہا تھا اس کو انہیں کے دل سے پوچھنا چاہئے، ہر چند اس کی وجہ سوچتے مگر کچھ سمجھ میں نہ آئی، حاضر خدمت ہوتے اور خاموش بیٹھ کر رنجیدہ و محزون واپس آجاتے، آخراس حالت کی تاب نہ لاکر حاضر خدمت ہوئے اور روکر عرض کیا کہ حضرت! مجھ سے کیا قصور

ہوا؟ جس کی یہ سزا مل رہی ہے، میں تو اس کا متحمل نہیں ہو سکتا، اللہ کے واسطے معاف فرما دیجئے، اس وقت ان کا ہاتھ حضرت نے اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا کہ میرا قصور نہیں کیا جس کو میں معاف کردوں، خدا کی خطا کی ہے، اس سے معافی چاہو، اس وقت انہوں نے سمجھا کہ عرس کے ایام میں میرا گنگوہ آنا آپ کو ناگوار گزرا، چنانچہ معذرت کے طور پر عرض کیا کہ حضرت! خدا شاہد ہے، مجھے عرس وغیرہ سے ساتھ ابتدا ہی سے شوق نہیں، واللہ نہ اس وقت میں اس خیال سے گنگوہ آیا اور نہ آج کل یہاں عرس ہونے کا مجھے علم تھا۔

حضرت امام ربانی نے فرمایا: اگرچہ تمہاری نیت عرس کی شرکت کی نہ تھی، مگر جس راستے میں دو آدمی عرس کے آنے والے آرہے تھے اسی میں تیسرے تم بھی تھے، جناب رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: "من کثر سواد قوم فھو منھم". (جس نے کسی قوم کی تعداد بڑھائی اس کا شمار اسی میں ہے)۔ (تذکرۃ الرشید ج ۲۔ ص ۹)

غلط مسئلہ بتانے پر نکیر:

ایک مرتبہ پیر جی محمد حسن نے جو حضرت گنگوہی کے خادم تھے ایک گاؤں کی مسجد میں رہتے تھے، گاؤں والوں سے یہ روایت بیان کردی کہ جمعرات کو ارواح موتی چھٹی پاتی ہیں کہ اپنے اپنے گھر جا کر سب کو دیکھ بھال آویں، گاؤں والوں نے حضرت مولانا سے اس روایت کی تصدیق چاہی، آپ نے فرمایا کہ یہ مسئلہ کون کہتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ پیر جی، جو آپ کے پاس رہتے ہیں، حضرت نے پیر جی سے پوچھا کہ یہ مسئلہ تم نے کہاں سے کہا؟ پیر جی نے عرض کیا کہ حضرت! "مقاصد الصالحین" میں لکھا ہے، حضرت نے بہت ناخوشی ظاہر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ ایسی کتابیں غلط ہیں، کبھی کوئی ایسی بات مت کہو جو معتبر ذریعہ سے نہ ملی ہو۔ (تذکرۃ الرشید ج ۲ ص ۴۲)

القاب کے آداب:

سید احمد شہید قدس سرہ کے سفر حج سے واپسی پر راستے میں مولوی سید کرامت علی بہاری کا الہ آباد سے خط آیا، سید عبد الرحمان صاحب کہتے ہیں کہ آپ نے وہ خط پڑھنے کے لئے مجھے دیا، اس میں آداب والقاب کے بعد یہ لکھا تھا کہ جناب والا کا سرفراز نامہ اس طرح شرف صدور لایا

جیسے آسمان سے وحی۔ابھی میں یہیں تک پہونچا تھا کہ ان لفظوں کو سنتے ہی آپ نے خط میرے ہاتھ لے لیا اور اس کو پھاڑ کر بتی بتی کر دیا، آپ کو خط کے ایسے برے عنوان سے بڑا رنج پہونچا، پیشانی پر سخت غصہ اور غضب کی علامتیں ظاہر ہوئیں۔

شیخ محمد خیر آبادی راوی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ کم از کم خط کا مضمون تو معلوم ہو جاتا، فرمایا کہ جس خط کا عنوان بارگاہ الٰہی میں ایسی گستاخی اور بے ادبی ہو، اس کا مضمون کیا دیکھا جائے؟ خود کو تو پیغمبر ٹھہرایا اور مجھے نعوذ باللہ خدا ہی بنا دیا۔(سیرت سید احمد شہید۔ج ۲۔ص ۴۹۴)

امانت ودیانت:

مولانا محمد یوسف (برادرزادۂ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی) جو سید احمد شہید قدس سرہ کے نزدیک لشکر اسلام کے قطب، اس جماعت میں امین الامۃ حضرت ابو عبیدہ بن ابی الجراح رضی اللہ عنہ کے قائم مقام تھے، آپ جماعت کے خازن اور بیت المال کے محافظ تھے، عطایا اور اموال کی تقسیم آپ ہی کے سپرد تھی، تقسیم میں بے انتہا احتیاط اور تدقیق سے کام لیتے اور خود امیر المومنین کے حصے میں ذرا زیادتی روا نہ رکھتے، اگر کبھی سید صاحب مزاحاً فرماتے کہ مولانا! مجھے کچھ زیادہ نہیں دیتے تو مولانا نہایت ادب سے عرض کرتے کہ اگر حکم ہو تو سارا مال قدموں پر ڈال دوں لیکن تقسیم میں مجھ سے کمی زیادتی نہیں ہو سکتی، اس میں مساوات ہی ہوگی۔(سیرت سید احمد شہید ج ۲۔ص ۵۲۴)

حکومتی تقریبات میں احتیاط:

سرکاری اجتماعات اور تقریبات میں گروپ فوٹو اجتماعات کا لازمی حصہ بن کر رہ گیا ہے، لیکن حضرت والد صاحب ایسے مواقع پر الگ ہو جاتے، شروع شروع میں بعض ناواقف لوگوں نے شمولیت پر اصرار کیا، لیکن جب حضرت والد صاحب نے فرما دیا کہ میں اسے شرعاً ناجائز سمجھتا ہوں تو پھر لوگوں نے کہنا ہی چھوڑ دیا بلکہ بعض مزاج شناس حکام آپ کی موجودگی میں گروپ فوٹو سے کترانے لگے تھے۔

سرکاری تقریبات میں کھڑے ہو کر کھانے کی بدمذاقی شروع سے جاری ہے، حضرت والد صاحب ایسی تقریبات میں ہمیشہ اپنا مختصر سا کھانا پلیٹ میں نکال دور کسی جگہ جا بیٹھتے اور کھانا

تناول فرماتے ۔ایک مرتبہ شہید ملت لیاقت علی خان مرحوم کی طرف سے دعوت تھی اور وہاں کھڑے ہوکر کھانے کا انتظام تھا، جسے حضرت والد صاحب ''کھڑا کھیل'' کہتے تھے، حضرت والد صاحب حسب معمول اپنا کھانا لے کر ایک طرف جا بیٹھے، آپ کو دیکھ کر بعض دوسرے حضرات بھی وہیں آگئے، یہاں تک کہ وہ ایک محفل بن گئی، لیاقت علی خان مرحوم دعوت میں عام مہمانوں کے ساتھ مصروف تھے، کھانے کے اختتام پر وہ حضرت مفتی صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے:

''مفتی صاحب! کھایا تو آپ نے ہے، ہم نے تو چرا ہے''۔(البلاغ مفتی اعظم نمبر ج ا۔ص ۴۳۳)

فضول گوئی سے اجتناب:

مولانا محمد زکی مرحوم صاحبزادہ مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی چشم دید حکایت سناتے ہیں کہ ایک روز والد صاحب حسب معمول مغرب کے بعد حضرت میاں جی اصغر حسین صاحب قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عموماً بعد مغرب عشاء تک یہ مجلس رہا کرتی تھی، خلاف عادت فرمایا کہ آج ہماری گفتگو عربی میں ہوگی، سبب پوچھنے کی جرأت تو نہ ہوئی، خود ہی گفتگو کی ابتداء عربی میں کردی، پھر والد صاحب نے بھی جو کچھ کہا عربی ہی میں کہا، لیکن طرفین کو عربی میں مکالمہ کی عادت تو تھی نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوچ سوچ کر صرف ضروری باتیں کہی اور سنی گئیں، اور اپنی زبان میں جس بسط وتفصیل کے ساتھ کلام ہوا کرتا تھا، اور ایک منٹ کی بات میں پانچ منٹ خرچ ہوجایا کرتے تھے، اس کا ایسا انسداد ہوا کہ وقت سے پہلے ہی مجلس ختم ہوگئی، اس وقت فرمایا کہ زندگی کا ایک ایک منٹ بڑا قیمتی بلکہ بے بہا جواہرات ہیں، ان کو فضول کام یا کلام میں صرف کرنا بڑی بے عقلی ہے، میں جانتا تھا کہ عربی میں گفتگو کریں گے تو صرف ضروری کلام ہوگا، اور فرمایا کہ ہماری مثال اس دولت مند انسان کی سی ہے، جس کے خزانے میں بے شمار گنیاں بھری ہوئی ہیں، اور وہ بے دریغ خرچ کررہا ہے، مگر اسی طرح ایک ایسا وقت بھی آ گیا، جب خزانہ خالی ہونے کے قریب آیا، اور چندگنی چنی گنیاں رہ گئیں، تو اب وہ بہت دیکھ بھال کر خرچ کرتا ہے، ہاتھ روکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں عمر کے بے شمار جواہرات عطا فرمائے تھے، جن کو ہم بے دریغ خرچ کرچکے ہیں، اب عمر کا آخر ہے، خزانہ خالی ہونے کو ہے، اس لئے ایک ایک منٹ دیکھ بھال

کرخرچ کرنا چاہئے۔(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ا۔ص ۲۶۶)

احتیاط کی نادر مثال:

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب نے فرمایا کہ حضرت شیخ الہند کے متعلقین میں سے کسی صاحب نے اہل بدعت کی تردید میں ایک رسالہ لکھا تھا، اہل بدعت نے اس کا جور دلکھا اس میں انہیں کافر قرار دیا، اس عمل کے جواب میں ان صاحب نے دوشعر کہے۔

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست چراغ کذب رانبود فروغے

مسلمانت بخوانم در جوابش دروغے راجزا باشد دروغے

انہوں نے حضرت شیخ الہند کو یہ شعر سنائے تو آپ نے شعری لطافت کی تو تعریف فرمائی لیکن ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ ”تم نے ان کو لطافت کے ساتھ ہی سہی کافر تو کہہ دیا، حالانکہ فتوی کے رو سے وہ کافر نہیں ہیں، اس لئے ان اشعار میں اس طرح ترمیم کرلو۔

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست چراغ کذب رانبود فروغے

مسلمانت بخوانم در جوابش وہم شکر بجائے تلخ دروغے

اگر تو مومنی فبہا و الا دروغے راجزا باشد دروغے

(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ا۔ص ۲۳۴)

☆☆☆☆☆☆

ادائیگی حقوق واحترام مشائخ

تعمیل وصیت:

مولانا محمد رفیع صاحب فرزند مفتی شفیع صاحب قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے دادا مرحوم نے وفات سے ایک روز پہلے احقر کے والد ماجد سے فرمایا:

"شفیع لوگ بھول جایا ہی کرتے ہیں مگر اتنی بات کہتا ہوں کہ جلدی نہ بھول جانا"۔

والد صاحب علیہ الرحمہ شدید تأثر کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ ان کا یہ جملہ لوح قلب پر ایسا کندہ ہوگیا کہ اب چالیس سال سے زائد ہوگئے ہیں، الحمد للہ کبھی فراموش نہیں ہوا، چنانچہ یہ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ گھر پر ہوں یا حالت سفر میں، بلا ناغہ روزانہ تلاوت کر کے اور سال میں کئی بار فقراء ومساکین کو کھانا کھلا کر وہ اپنے والد بزرگوار کو ایصال ثواب فرماتے رہے، اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ۱۔ ص ۸۶)

احترام مشائخ:

ایک مرتبہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے صحیح بخاری کے درس میں قرأت خلف الامام کے مسئلے پر نہایت شرح وبسط سے تقریر فرمائی اور امام ابوحنیفہ کے مسلک کے دلائل اس قوت اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمائے کہ تمام سامعین نہال ہوگئے، درس کے بعد ایک طالب علم نے حضرت سے کہا کہ "حضرت! آج تو آپ نے اس مسئلے پر ایسی تقریر فرمائی ہے کہ اگر امام شافعی تشریف فرما ہوتے تو شاید اپنے مسلک سے رجوع فرمالیتے"۔ حضرت کو یہ جملہ سن کر بہت غصہ آگیا، آپ نے فرمایا کہ امام شافعی علیہ الرحمہ کو تم کیا سمجھتے ہو؟ اگر امام صاحب زندہ ہوتے تو شاید میرے لئے ان کی تقلید کے سوا چارہ نہ ہوتا۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ۱۔ ص ۲۲۹)

عقیدت و حفظ حدود کا ایک نادر مجموعہ:

۱۳۹۲ھ میں والد صاحب (مفتی محمد شفیع) کو پہلی مرتبہ دل کا شدید دورہ ہوا، اور اس کی وجہ آپ تین ہفتے ہسپتال میں رہے، تو آپ نے اپنے شیخ کے طرزِ عمل کے مطابق ایک مضمون شائع کرایا، جس میں اپنے احباب اور ملنے جلنے والوں سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ اگر انہیں آپ سے کوئی تکلیف پہونچی ہو تو اسے للہ فی اللہ معاف فرما دیں، اور اگر کوئی مالی حق کسی کے ذمے رہ گیا ہو تو وہ وصول کر لیں، یہ مضمون ''کچھ تلافی مافات'' کے نام سے ہوا۔

جب حضرت والد صاحب کے دل میں اس مضمون کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا تو آپ نے احقر کو اس کا مفہوم بتلا کر اسے تحریری شکل میں مرتب کرنے کا حکم دیا اور ہدایت فرمائی کہ پہلے حضرت تھانوی قدس سرہ کے رسالے ''العذر والنذر'' کو پڑھ لینا، اور مضمون کی تمہید میں حضرت کے رسالے کا تعارف کرانے کے بعد اسی کے طرز پر اسے مرتب کر دینا۔

اس تحریر کا مجھ پر بہت بوجھ تھا، معاملہ بھی نازک سا تھا، اس میں بہت پہلوؤں کی رعایت کرنی تھی، اور سب سے بڑھ کر ایک جذباتی رکاوٹ تھی، وہ یہ کہ والد صاحب اس مضمون کے آغاز میں اس مفہوم کے جملے لکھوانا چاہتے کہ ''اب میرا وقت قریب معلوم ہوتا ہے، کسی بھی وقت بلاوا آ سکتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ جاننے کے باوجود کہ یہ باتیں حقیقت ہیں مجھے اس ماحول میں اپنے قلم سے اس قسم کے جملے لکھنا اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرنے سے زیادہ صبر آزما معلوم ہوتا تھا۔

بہر کیف، اللہ سے دعا کی، خدا جانے کس طرح میں نے چار صفحات لکھے، اور حضرت والد صاحب کو سنانا شروع کیا، یہ تو انہیں کی دعا و توجہ کی برکت تھی کہ بالآخر انہوں نے اسے پسند کیا، لیکن ابتدا میں جب میں لرزتی ہوئی آواز میں یہ مضمون سنانا شروع کیا اور اس قسم کا جملہ آیا کہ، ''حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے اس مقصد کے لئے ایک رسالہ شائع فرمایا تھا'' تو میں نے دیکھا کہ حضرت کے چہرے پر قدرے تکدر کے سے آثار نمودار ہوئے اور فرمایا:

''جاؤ میاں! تمہیں اب تک حضرت کا نام بھی لکھنا نہ آیا، اور حضرت کا تذکرہ اس طرح کر دیا جیسے کسی اجنبی عالم کا ذکر کر دیا جاتا ہے، خدا کے بندے یہ تحریر تم میری طرف سے لکھ رہے ہو،

اور اس حالت میں لکھ رہے ہو، تو حضرت کے ساتھ میرے تعلق کو بھی ملحوظ رکھو، وہ امت کے تو حکیم تھے مگر یہ بھی بتاؤ کہ میرے کیا تھے؟ تمہیں الفاظ کا بخل بھی یہیں کرنا تھا، ارے یوں لکھو کہ "میرے شیخ ومرشد، میرے آقا ومربی، سیدی وسندی ومرشدی.........الخ، اور ان آخری الفاظ پر آپ کی آواز بھرا گئی، آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور شدت جذبات میں سر تکیے پر ڈھلک گیا۔

ایک طرف اس واقعہ سے حضرت کے ساتھ آپ کے جذباتی تعلق کا اندازہ لگایئے اور دوسری طرف ایک واقعہ اور سنئے۔

غالباً حضرت والد صاحب کے ہسپتال سے واپس گھر تشریف لانے کے بعد ایک مرتبہ ایک اور تحریر مجھے لکھنے کے لئے دی تھی، اور اس حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا تذکرہ بھی تھا، اس میں احقر نے حضرت کے لئے کچھ اس قسم کے الفاظ لکھے تھے کہ "اس چودھویں صدی کے مجدد دین حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی"۔ میں نے یہ تحریر آپ کی خدمت میں بغرض ملاحظہ پیش کی، آپ نے جب وہ تحریر مجھے واپس کی تو میں نے دیکھا کہ اس میں "چودھویں صدی کے مجدد دین" کے الفاظ کاٹ کر آپ نے ان کی جگہ "مجدد ملت" کے الفاظ تحریر فرمادیئے تھے، میں اس اصلاح پر ابھی غور بھی نہ کر پایا تھا اور چہرہ سوالیہ نشان ہی بنا ہوا تھا کہ آپ نے خود فرمایا:

"سمجھے! یہ الفاظ میں نے کیوں بدلے ہیں؟"۔

احقر نے عرض کیا "نہیں، آپ ہی بیان فردیں۔

فرمایا کہ "دراصل مجدد دین کوئی ایسا منصب نہیں ہوتا جیسے نبی اور رسول ایک معین منصب ہے، صدی کے آغاز میں جس مجدد کی خبر دی گئی ہے وہ فرد واحد بھی ہوسکتا ہے اور افراد کا ایک طائفہ بھی ہوسکتا ہے، اور مجدد کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اسے اپنے مجدد ہونے کا علم ویقین بھی ہو اور نہ کسی دوسرے کے پاس کوئی ایسا یقینی ذریعہ ہوتا ہے جس سے وہ کسی فرد کو معین اور قطعی طور پر اس صدی کا مجدد قرار دے سکے، چنانچہ اس کی تعیین میں رائیں مختلف بھی ہوسکتی ہیں، اس ذیل میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ فلاں صاحب کے بارے میں گمان غالب یہ ہے کہ اس صدی کے مجدد تھے، حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے بارے میں ہمارا گمان غالب یہی ہے کہ اللہ تعالی نے انہیں اس صدی کا مجدد بنایا تھا، لیکن بالکل حتمی اور قطعی طور پر یہ بات کہنا درست نہیں،

کیوں کہ اس معاملہ میں حتم ویقین کی کوئی شرعی حجت ہوتی نہیں، ہاں، اس بات کا یقین بلکہ عین الیقین ہے کہ حضرت نے جو کارنامہ انجام دیا، وہ تجدیدی ہے، اور آپ سے اللہ تعالیٰ نے ملت کی تجدید واحیا کا عظیم کام لیا ہے، اس لئے 'مجدد ملت' کے الفاظ زیادہ محتاط اور قرین صواب ہیں۔
(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ا۔ص ۴۵۰)

احترام کی قدر و قیمت:

میری یادوں میں ایک واقعہ وہ بھی ہے جو ان کی (حضرت مفتی شفیع صاحب) نیک نیتی مقبولیت عنداللہ اور اپنے طبقہ علما حق کے ساتھ روحانی مخلصانہ ربط وتعلق اور علمی تقوی وتزکیہ کی ایک کھلی نشانی ہے، واقعہ یہ تھا کہ استاذ مرحوم نے مجھے کراچی دارالعلوم کے لئے بغرض تدریس بلایا تھا، اور خط وکتابت سے معاملہ طے ہونے کے بعد آخری خط تحریر فرمایا تھا کہ آپ فوراً چلے آئیں، کیوں کہ آپ کی وجہ سے ہم نے ایک اور صاحب کو آنے سے منع کر دیا ہے، جب کہ ان سے بات طے ہوگئی تھی، چنانچہ میں تعمیل حکم کے لئے تیار ہورہا تھا اور اچانک مرحوم کا تار ملا کہ آپ سردست تشریف نہ لائیں، آپ کے نام مفصل خط روانہ کیا گیا ہے، خیر میں نے وہ تیاری منسوخ کر دی لیکن اس ماجرا کا سبب معلوم کرنے کے لئے میں بے تاب تھا، جس کو خود ہی مرحوم نے بعد کی ایک ملاقات میں عیاں فرما کر کہا کہ مولانا! مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی توہین کرتے ہیں، اس لئے میں نے آپ کو یہاں آنے سے روک دیا، کیوں کہ میں حضرت مدنی کی توہین برداشت نہیں کرسکتا ہوں۔

دراصل میرے ایک محترم دوست نے مرحوم کو اس اکذوبہ کا یقین دلایا تھا، حالانکہ اپنے اساتذہ اور اکابر میں میری عقیدت حضرت مدنی سے اتنی ہے کہ جب ان کا نام نامی اور اسم گرامی زبان پر آتا ہے یا کان میں پڑتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرا ایمان تازہ ہوگیا، اور پورے بدن میں خوشی اور انبساط کی لہر دوڑنے لگتی ہے۔(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ۲۔ص ۱۰۱۴)

امانت کا اہتمام:

بندہ کے حج کے دوران ہمارے خاندان کے ایک بزرگ سید ریاض الحسن صاحب (جو مبارک پور ضلع رحیم یار خاں) میں رہتے ہیں، اور کئی مربع زمین اور باغات کے مالک ہیں، مکہ

معظّمہ میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کا ایک خط لے کر احقر کے پاس پہونچے کہ ان ضعیف بزرگ کی خدمت کرو، حتی الوسع حضرت کے حکم کی تعمیل کی گئی، اور بات آئی گئی ہوگئی، حج سے واپسی کے بعد جب آموں کا موسم آیا تو سید ریاض الحسن صاحب نے حسب معمول حضرت کی خدمت میں بذریعہ ریل اپنے باغ کے بہترین آم بھیجے، اور بلٹی ڈاک سے بھیج دی۔ لطیفہ ان آموں کے ساتھ یہ ہوا کہ آم کی پیٹی تو لانڈھی اسٹیشن پر پہلے پہونچ گئی لیکن محکمہ ڈاک کی تیز گامی اور مستعدی کی وجہ سے بلٹی کا رجسٹرڈ لفافہ حضرت کو نہ مل پایا، ایک دن لانڈھی ریلوے اسٹیشن کے ماسٹر نے فون کر کے حضرت کو بتایا کہ آپ کے نام آموں کی ایک پیٹی دو روز سے آئی پڑی ہے اور آم سڑنے لگے ہیں، اس کو منگوا لیجیئے، صبح دس بجے فون آیا، بارہ بجے ڈاک سے حضرت کو بلٹی بھی مل گئی، چنانچہ آم منگوائے گئے، بلٹی کے ساتھ خط میں سید صاحب نے لکھا تھا کہ ان آموں کا چوتھائی میرے عرفاتی بھائی فخر عالم کو پہونچا دیں، آم آئے، پیٹی کھولی گئی تو پتہ چلا کہ تقریباً سارے کہ سارہ آم سڑ گئے ہیں، اور محض چند دانے (اور وہ بھی داغ دار) ایسے نکلے کہ جنہیں فوری طور پر کھایا جا سکتا تھا، جون کے مہینے کی اس تپتی دوپہر میں جب کہ لو کے تھپیڑے ہم جیسے لوگوں کو کمروں کے اندر اور پنکھوں کے نیچے سلا رہے تھے، ٹھیک سوا دو بجے دوپہر میں میرے گھر پر دستک ہوئی، کمرے سے باہر نکل کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ حضرت کھڑے ہیں، اور کاغذ کا ایک چھوٹا سا تھیلہ ہاتھ میں ہے، یہ تھیلا احقر کو دیتے ہوئے فرمایا کہ بھائی! آج تمہارے ان آموں نے بہت ستایا، ریاض الحسن نے بھیجے ہیں، اور پھر سارا قصہ سنایا، میں انتہائی حیرانی سے حضرت کو دیکھ رہا تھا کہ اللہ تعالی نے انہیں کن کن اوصاف حمیدہ سے نوازا ہے، اور پشیمانی سے گڑا جا رہا تھا کہ اس گرم ترین دوپہر میں اس فقیہ اعظم نے ایک امانت کو اس کے حق دار تک پہونچانے میں کس قدر صعوبت اٹھائی؟ یہ چار آم جو داغ سے خالی نہیں تھے اگر حضرت ہی نوش فرما لیتے اور مجھے صرف ٹیلی فون سے یا مابعد کسی ملاقات پر بتا دیتے تو میرے نزدیک کوئی حرج کی بات نہ تھی، اور میں نے یہ بات کہی بھی، اور جب حضرت نے فرمایا کہ بھئی! امانت کے معاملہ میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے تو احقر نے عرض کیا کہ حضرت! پھر ایسا ہی تھا تو آپ کسی اور شخص کے ہاتھ بھیج دیتے۔ کتنے باریک تھے ہمارے حضرت کہ جواب ملا ''یہ گلے سڑے آم ایسے ہی بھیج دیتا، لانے والا نہ جانے بات صحیح پہونچاتا یا

نہیں؟ ہر چند کہ غبار سے دل صاف ہے لیکن شیطان تمہیں یہ سمجھا سکتا تھا کہ (نعوذ باللہ) ماموں اچھے آم خود کھا گئے اور گلے سڑے مجھے بھیج دیئے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ۲۔ ص ۱۰۷۷)

رشتہ کی ایسی کی تیسی:

حافظ محمد ضامن علیہ الرحمہ اپنے مرشد حضرت میاں جی نور محمد صاحب کے ہمراہ ان کا جوتہ بغل میں لے کر اور توبرہ گردن میں ڈال کر جھن جھانہ جاتے تھے، اور ان کے صاحبزادے کی سسرال بھی وہیں تھی، لوگوں نے عرض کیا کہ اس حالت میں جانا مناسب نہیں، وہ لوگ حقیر سمجھ کر کہیں رشتہ نہ توڑ ڈالیں، حافظ صاحب نے فرمایا کہ ''رشتہ کی ایسی کی تیسی (حافظ صاحب ظریف تھے) میں جانے میں اپنی سعادت نہیں چھوڑوں گا۔ (ارواح ثلاثہ۔ ص ۱۶۴)

خانقاہ کا ادب:

خان صاحب نے فرمایا کہ ''حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ نے خود مجھ سے فرمایا کہ جب میں ابتداء گنگوہ کی خانقاہ (حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی خانقاہ) میں آ کر مقیم ہوا ہوں تو خانقاہ میں بول و برزار نہ کرتا تھا بلکہ باہر جنگل جاتا تھا کہ شیخ کی جگہ ہے، حتی کہ لیٹنے اور جوتے پہن کر چلنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی۔ (ارواح ثلاثہ۔ ۲۲۸)

خدمت استاذ:

ایک مرتبہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کو دیوبند کا سفر درپیش تھا، برسات کا موسم تھا، اور مولانا کو بخار آ رہا تھا، شیخ الہند نے مولانا کو گھوڑے پر بیٹھایا اور لگام اپنے ہاتھ میں لے لی، اور ایک ہاتھ سے رکاب کے قریب ہو کر حضرت کی کمر کو سہارا دیا، اسی طرح بائیس میل کا راستہ پیدل طے کر کے دیوبند پہونچایا۔ (تذکرہ شیخ الہند۔ ص ۱۰۹)

حق استاذ:

شروع میں یہ ادارہ (دارالعلوم کراچی) نانک واڑہ کی مختصر عمارت میں تھا لیکن کام جب وسیع ہوا اور جگہ تنگ پڑ گئی تو وسیع جگہ کی ضرورت پڑی، اللہ تعالی نے ایک کشادہ جگہ کا انتظام فرما دیا اور آج کل جس جگہ اسلامیہ کالج ہے یہ جگہ اس وقت خالی تھی، دارالعلوم کے لئے الاٹ ہو چکی تھی، جگہ کشادہ اور شہر کے بہترین حصہ میں ہونے کے علاوہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہ کے مزار سے بالکل متصل تھی، اس لئے دارالعلوم کے لئے بے حد موزوں تھی، مفتی محمد شفیع

صاحب نے اس پر دارالعلوم کی تعمیر کا کام شروع کرنے کا ارادہ کیا اور سنگ بنیاد رکھنے کے لئے ملک کے مقتدر علما وصلحا کو دعوت دی، اور ایک جلسہ بھی منعقد فرمایا، لیکن عین اس وقت جب اس زمین پر چشمۂ خیر کی بنیاد ڈالی جارہی تھی، بعض اہل غرض نے حضرت علامہ عثمانی کی محترم اہلیہ کو کسی شدید غلط فہمی میں مبتلا کردیا، جس کی بنا پر انہوں نے اس منصوبہ کی مخالفت شروع کردی اور ایک مرتبہ خود مزار تشریف لاکر انہوں نے مخالفت کا اعلان کیا، شدید غلط فہمیوں کی بنا پر کوئی فہمائش کارگر نہ ہوئی تو لوگوں نے حضرت مفتی صاحب سے یہی کہا کہ چونکہ مخالفت کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، اس لئے آپ اپنا کام جاری رکھیں، اور تحفظ قانون کے اداروں نے بھی پورا یقین دلایا کہ آپ بغیر کسی تذبذب کے یہ کام شروع کرسکتے ہیں، اور پولیس آپ کا ساتھ دے گی، لیکن حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ میں یہ کام نہیں کرسکتا، حضرت علامہ عثمانی کی اہلیہ محترمہ اگرچہ شدید غلط فہمیوں کا شکار ہوگئی ہیں لیکن میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں استاذ محترم کی اہلیہ کے خلاف اس معاملہ میں قوت استعمال کروں اللہ مدرسہ کے لئے کوئی اور زمین دے گا۔

اللہ اکبر! استاذ کے احترام میں ان کی اہلیہ کی عزت اور بے نفسی وتوکل کا کیا مقام تھا کہ حق پر ہونے اور اس کے منوانے کی پوری طاقت کے باوجود اتنی بڑی زمین محض استاذ کی اہلیہ کی دل شکنی کے اندیشہ سے چھوڑ بیٹھے، اس وقت دارالعلوم کے لئے کوئی متبادل جگہ سامنے نہ تھی لیکن آپ نے اس جگہ کو توکلاً علی اللہ خالی کردیا، اللہ تعالی اپنے نیک بندوں کی مدد فرماتا ہے، چنانچہ کچھ ہی عرصہ کے بعد مدرسہ کے لئے شہر سے باہر اتنی وسیع وعریض جگہ مل گئی کہ اس کا خواب وخیال بھی پہلے نہ تھا۔ (البلاغ، مفتی اعظم نمبر ج ا۔ ص ۴۳)

☆☆☆☆☆☆

قناعت واستغناء

قلیل تنخواہ:

دارالعلوم دیوبند میں مالی وسائل کی قلت تھی، اساتذۂ کرام کی تنخواہیں نہایت قلیل ہوتی تھیں، قارئین کو حیرت ہوگی کہ ابتداء دارالعلوم میں آپ (مفتی محمد شفیع صاحب) کو صرف پانچ روپئے ماہوار وظیفہ ملتا تھا، اسی پر قناعت فرمائی، پھر رفتہ رفتہ مشاہرہ میں تھوڑا تھوڑا اضافہ ہوتا گیا، جب آپ ۲۶/سال کی جلیل القدر خدمات کے بعد دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوئے تو اس وقت بھی مشاہرہ صرف ۶۵ روپئے تھا، اس عرصہ میں دوسرے مدارس سے بڑی بڑی تنخواہوں پر بلانے کی مسلسل کوشش ہوتی رہی، مدرسہ عالیہ کلکتہ سے سات سوروپئے مشاہرہ کی پیش کش بار بار کی گئی، جہاں کام بھی دیوبند سے کم تھا مگر پیش نظر تنخواہ کبھی منظور نہ کی، دیوبند کی قلیل تنخواہ پر قناعت کی، مادر علمی کو چھوڑ نا پسند نہ فرمایا۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ا۔ ص ۱۰۴)

دولت ٹھکرادی:

حاجی امیر شاہ خاں (علماء دیوبند کے واقعات وحالات کے نہایت معتبر اور قوی الحفظ راوی) نے فرمایا کہ مولوی امیرالدین صاحب نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ بھوپال سے مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی طلبی آئی اور پانچ سوروپیہ ماہوار (یادرہے کہ یہ پانچ سو آج سے ڈیڑھ سوسال قبل کے ہیں) تنخواہ مقرر کی، میں نے کہا کہ اجی چلے کیوں نہیں جاتے، فرمایا کہ وہ مجھے صاحب کمال سمجھ کر بلاتے ہیں، اوراسی بناء پر وہ پانچ سوروپیہ دیتے ہیں، مگر میں اپنے اندر کوئی کمال نہیں پاتا، پھر کس بناء پر جاؤں، میں نے بہت اصرار کیا، مگر نہ مانے۔ (ارواح ثلاثہ۔ ۱۷۵)

نرالی ترقی:

دارالعلوم کراچی کی ابتدائی خدمات کے چار سال تک مفتی صاحب نے کوئی معاوضہ نہیں

لیا، پھر جب بورڈ آف تعلیمات اسلام کی رکنیت ختم ہوگئی، کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اور دارالعلوم کی خدمات شب وروز کا مشغلۂ زندگی بنی ہوئی تھیں تو جمادی الاولی ۱۳۷۴ھ سے مجلس منتظمہ کی درخواست پر پانچ سو روپئے مشاہرہ لینا منظور فرمالیا، مگر شعبان ۱۳۷۷ھ سے اس مشاہرہ میں ازخود کمی کر کے صرف تین سو روپئے ماہوار باقی رکھے، جس کا اکثر حصہ دارالعلوم کی ضروریات، ٹیلی فون آمدورفت اور مہمان داری میں خرچ ہو جاتا، پھر ۱۳۸۴ھ سے یہ تین سو رپئے لینا بھی ترک فرمادیا۔

اس عرصہ میں جتنی رقم دارالعلوم سے بطور مشاہرہ وصول کی تھی، والد صاحب کی خواہش تھی کہ اس کو بتدریج واپس فرمادیں، چنانچہ متفرق اوقات میں مختلف عنوانات سے تقریباً ساڑھے بیالیس ہزار روپئے دارالعلوم میں داخل فرمائے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ا۔ ص ۲۱۳)

استغناء:

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہ پاکستان کے صف اول کے معماروں میں شامل تھے، قائداعظم اور نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم تقسیم ملک کے وقت آپ کو اپنے ساتھ پاکستان لے آئے تھے، اور مغربی پاکستان میں پاکستان کا پرچم سب سے پہلے مولانا ہی نے لہرایا تھا، اگر آپ چاہتے تو یہاں اپنے لئے بہت کچھ دنیوی ساز وسامان اور عہدہ ومنصب حاصل کر سکتے تھے، لیکن مولانا نے آخر تک درویشانہ زندگی گزاردی، اپنے لئے کوئی ایک مکان بھی حاصل نہ کیا بلکہ وفات تک دو مستعار لئے ہوئے کمروں میں مقیم رہے اور اسی حالت میں دنیا سے تشریف لے گئے کہ نہ آپ کا کوئی بینک بیلنس تھا نہ ذاتی مکان تھا نہ ساز وسامان۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ا ص ۲۸۰)

استعفاء در جیب:

جس زمانہ میں آپ (مفتی محمد شفیع صاحب) بورڈ آف تعلیمات اسلام کے رکن تھے اس دور میں آپ نے ایک دینی ضرورت کے تحت حکومت کے خلاف ایک اخباری بیان دے دیا، اس پر ایک اعلی سرکاری عہدے دار نے آپ سے کہا کہ مفتی صاحب! آپ نے بورڈ کا ممبر ہوتے ہوئے ایسا بیان دیا، حالانکہ یہ بورڈ حکومت ہی کا قائم کردہ ہے، اس پر حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ اول تو بورڈ کے ارکان حکومت کے ملازم نہیں، اور اگر ملازم بھی ہوں تو شاید یہ ملازمت ان

حضرات کے لئے حق گوئی میں رکاوٹ بن سکتی ہے، جن کا ایک سوٹ کم از کم دوسو روپۓ میں بنتا ہے، اور جوتے، ٹوپی پر سو روپۓ خرچ ہوتے ہیں، اس کے برخلاف میرا معاملہ یہ ہے کہ بحمد للہ سر سے پاؤں تک میرے لباس کی تیاری پر بمشکل پندرہ روپۓ خرچ ہوتے ہیں، اس لئے ملازمت میرے لئے رکاوٹ نہیں بن سکتی، رہا بورڈ کی رکنیت کا معاملہ تو شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں بفضلہٖ تعالی اس عہدے سے استعفا جیب میں لئے پھرتا ہوں، جب یہ رکنیت کسی دینی ضرورت کے انجام دہی میں رکاوٹ ثابت ہوگی تو ان شاء اللہ استعفا دینے کے لئے چند منٹ بھی درکار نہیں ہوں گے۔

(واضح ہو کہ بورڈ کی رکنیت کے سلسلے میں حضرت مفتی صاحب کو ماہانہ ہزار روپۓ ملتے تھے)

(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ا۔ص ۴۳۱)

مدرسہ کے باب میں استغناء:

ملک کے ایک مشہور سرمایہ دار والد صاحب کے پاس تشریف لائے اور پہلے کچھ رقم بطور ہدیہ دینے کی پیش کش کی، جس سے آپ نے خوبصورتی کے ساتھ معذرت فرمالی، اس کے بعد دارالعلوم کی تعمیرات میں مؤثر حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی اور وہ اس مالی حیثیت کے آدمی تھے کہ دارالعلوم کے اس وقت کے تمام تعمیری منصوبے پورے کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، لیکن والد صاحب کو اپنی فراست سے اندازہ ہوگیا کہ ان کی اچانک آمد اور پیش کش بلا وجہ نہیں ہے، چنانچہ آپ نے اس پیش کش سے بھی یہ کہہ کر معذرت کردی کہ بحمد للہ فی الحال مدرسہ کا کام چل رہا ہے، آپ تکلیف نہ فرمائیں، چنانچہ وہ ناکام تشریف لے گئے اور بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت والد صاحب کا یہ فیصلہ کتنا صحیح تھا۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ا۔ص ۴۶۸)

حکومت کی امداد سے احتراز:

جب پاکستان غیر ملکی دفاعی معاہدوں میں شریک ہوگیا اور ایک غیر مسلم حکومت سے روابط زیادہ ہوگئے تو اسی زمانہ میں امریکہ کے ایک بہت بڑے بااختیار افسر نے میرے (مفتی محمد شفیع صاحب) پاس آمد و رفت شروع کردی، میں ان کی آمد کا اصل مقصود سمجھ نہیں سکا، لیکن بحیثیت مہمان میں نے ان کے احترام میں بھی کوتاہی نہ کی، متعدد بار میرے مکان پر آنے کے بعد ایک مرتبہ انہوں نے اپنے بنگلہ پر میری چائے کی دعوت کی اور واضح کردیا کہ گھر میں پکائی ہوئی کوئی چیز

نہ ہوگی، صرف چائے، پھل پیش کئے جائیں گے، میں نے یہ دعوت ردوکد کے بعد قبول کرلی، چائے کے بعد گفتگو کا سلسلہ چلا، اچانک میزبان نے اپنی گفتگو کا موضوع دارالعلوم کو بنالیا، اس وقت کورنگی میں دارالعلوم کی تعمیر جاری تھی، اور کثیر رقم کی اس میں ضرورت تھی، انہوں نے معلومات حاصل کرنے کے بعد اپنی حکومت کی جانب سے اتنی بڑی رقم کی پیش کش کی جس سے دارالعلوم کے تمام تعمیری منصوبے پایۂ تکمیل تک پہونچ جاتے، فرمایا کہ یہ سن کر مجھے پسینہ آگیا، مگر میں نے یہ کہہ کر کہ حکومت کی امداد میں شرائط ہوتے ہیں، اور ہم شرائط کے ساتھ کوئی امداد نہیں لیتے، ان سے عذر کردیا، انہوں نے برجستہ کہا کہ یہ تمام امداد غیر مشروط ہوگی، یہ سن کر مجھے پھر پسینہ آگیا، اور اللہ سے دعا کی کہ اس فتنہ سے بچا، اللہ تعالی نے جواب ذہن میں ڈالا اور میں نے کہا کہ ہم اپنی حکومت سے بھی امداد نہیں لیتے، اور ہمارے لئے بڑے اعتراض کی بات ہوگی کہ کسی غیر ملکی حکومت سے امداد لیں۔ اتنا سن کر وہ خاموش ہوگئے بلکہ مایوس ہوگئے، اس کے بعد نہ خود آئے نہ کوئی رابطہ قائم کیا۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ۲۔ ص ۸۲۳)

تعلقات حکومت سے اجتناب:

فلیڈ مارشل محمد ایوب خان کے دور میں وزیر اوقاف مسٹر مسعود جوان دنوں مدارس دینیہ کو قومی تحویل میں لینے کے لئے مدارس میں جایا کرتے تھے، دارالعلوم کراچی بھی آئے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم نے بات چیت کے دوران فرمایا کہ دارالعلوم کا ظاہری حسن و جمال کہیں آپ کو دھوکے میں نہ ڈال دے، آپ کو یقین آئے یا نہ آئے مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کو جو چیز مطلوب ہے (یعنی مستقل آمدنی) اس کا یہاں وجود ہی نہیں، اگر اعتبار نہ آئے تو حکومت اپنی تحویل میں لے کر دیکھ لے، مگر یاد رکھئے کہ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوجائے گا کہ دارالعلوم پر حکومت کا قبضہ ہے تو اس کی آمدنی ختم ہوجائے گی، بجائے لینے کے دینے پڑ جائیں گے، اس پر انہوں نے معذرت کی اور ساتھ ہی اصرار کیا کہ حکومت دارالعلوم کو کچھ گرانٹ دینا چاہتی ہے، اس کو قبول کرلیجئے، مگر آپ نے اسے قبول نہ کیا، وہ مسلسل اصرار کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے کہا کہ اچھا اتنا تو قبول کیجئے کہ مخصوص طلبہ کے وظائف ہم دیں گے، ان کی فہرست عنایت کیجئے، مگر اس بات کو بھی قبول نہ کیا۔

(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ۲۔ ص ۱۰۹۷)

اپنے مدرسہ کے ذکر سے گریز:

حضرت مفتی صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا کہ:

''ایک سیٹھ نے پوچھا کہ میرا کوئی وارث نہیں ہے، میں زندگی میں اپنا مال تقسیم کرنا چاہتا ہوں، اس کے لئے بہترین جگہ کون سی ہوگی؟ تو میں (مفتی محمد شفیع صاحب) نے متعدد دینی مدارس اس کو بتلائے، تو پاس بیٹھنے والے ایک شخص نے تعجب سے کہا کہ آپ کا بھی تو اپنا مدرسہ ہے، اس کا نام کیوں نہیں لیا؟ میں نے کہا اگر اس کو کچھ دینا ہوگا تو خود دیدیگا، مگر میری اپنی حمیت گوارا نہیں کرتی کہ وہ مجھ سے مسئلہ پوچھے اور میں اس کو اپنے مدرسے میں دینے کے لئے کہوں، اس میں بھی ایک طرح کا حظ نفس پایا جاتا ہے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ۲۔ص ۱۰۹۸)

دنیا ذلیل ہو کر آتی ہے:

مولانا حبیب الرحمان صاحب دیوبندی نے حافظ انوارالحق صاحب دیوبندی کی روایت سے نقل فرمایا کہ حضرت نانوتوی چھتہ کی مسجد میں حجرہ کے سامنے چھپر میں حجامت بنوار ہے تھے کہ شیخ عبدالکریم رئیس لال کرتی میرٹھ حضرت مولانا سے ملنے کے لئے دیوبند آئے، مولانا نے اس کو دور سے آتے ہوئے دیکھا، جب قریب آئے تو ایک تغافل کے ساتھ رخ دوسری طرف پھیر لیا، گویا کہ دیکھا ہی نہیں، وہ آکر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے، ان کے ہاتھ میں رومال میں بندھے ہوئے بہت سے روپئے تھے، جب انہیں کھڑے ہوئے بہت عرصہ ہوگیا تو حضرت مولانا نے ان کی طرف رخ کر کے فرمایا کہ آہا شیخ صاحب ہیں، مزاج اچھا ہے؟ انہوں نے سلام عرض کیا اور بندھا ہوا روپیہ قدموں پر ڈال دیا، حضرت نے اسے قدموں سے الگ کر دیا، تب انہوں نے ہاتھ باندھ کر بمنت قبول فرمالینے کی درخواست کی، بالآخر بہت سے انکار کے بعد انہوں نے تمام روپیہ حضرت کی جوتیوں میں ڈال دیا، حضرت جب اٹھے تو نہایت استغنا کے ساتھ جوتے جھاڑ دیئے، اور روپیہ سب زمین پر گر گیا، حضرت نے جوتے پہن لئے اور حافظ انوارالحق صاحب سے ہنس کر فرمایا کہ حافظ جی ہم بھی دنیا کماتے ہیں، اور اہل دنیا بھی دنیا کماتے ہیں، فرق یہ ہے کہ ہم دنیا کو ٹھکراتے ہیں اور وہ قدموں پر پڑتی ہے، اور دنیادار اس کے قدموں میں گرتے ہیں اور وہ انہیں ٹھکراتی ہے، اور یہ فرما کر روپیہ وہیں تقسیم فرمادیا۔ (ارواح ثلاثہ۔ص ۲۰۹)

مولویت پر دھبہ:

مولوی محمد یعقوب صاحب علیہ الرحمہ جب مرادآباد تشریف لاتے تو میں اور حافظ عطاء اللہ چھتاری سے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، نواب محمود علی خان کی بہت آرزو تھی کہ ایک مرتبہ مولوی محمد یعقوب صاحب چھتاری تشریف لاویں، مولانا نے فرمایا کہ ہم نے سنا ہے کہ جو مولوی نواب صاحب کے یہاں جاتا ہے نواب صاحب اس کو سو روپئے دیتے ہیں، ہمیں وہ خود بلاتے ہیں اس لئے شاید دوسو روپئے دیویں، سو دوسو ہمارے کے دن کے؟ ہم وہاں جاکر مولویت کے نام پر دھبہ نہ لگاویں گے۔ (ارواح ثلاثہ۔۲۴۹)

احکام شرع کا پاس ولحاظ:

خان صاحب نے فرمایا کہ نواب وزیرالدولہ پر غدر میں الزام لگایا تھا کہ انھوں نے بھی شاہ دہلی کے یہاں درخواست بھیجی تھی کہ جو کام میرے لائق ہو مجھے سپرد کیا جائے، میں خدمت کے لئے حاضر ہوں، ابھی صفائی نہ ہوئی تھی کہ آگرہ میں وائسرائے کا دربار ہوا، جس میں والیان ریاست مدعو تھے، اور مقصود اس سے والیان ریاست اور رؤوسا کا امتحان تھا، اتفاق سے وہ دن جمعہ کا تھا، نواب وزیرالدولہ اس پر جم گئے کہ میں جمعہ چھوڑ کر دربار میں نہ جاؤں گا، جب یہ خبر نواب یوسف علی خان والی رامپور اور سکندر بیگم والیہ بھوپال کو ہوئی تو یہ دونوں آئے اور آکر سمجھایا کہ آپ مسافر ہیں اور مسافر پر جمعہ فرض نہیں، پھر آپ پر الزام بھی قائم ہے، اس لئے مناسب ہے کہ آپ دربار میں شریک ہوں، انھوں نے فرمایا کہ یہ صحیح ہے مگر میں یہ ہرگز نہیں کروں گا کہ اپنے نفس کے لئے خدا کے دربار کو چھوڑ کر دنیا کے دربار میں شریک ہوں، القصہ، انھوں نے کسی طرح ترک جمعہ منظور نہ کیا اور چھٹی لکھ دی کہ آج جمعہ ہے اور مجھے نماز جمعہ میں شریک ہونا ہے اس لئے میں حاضریٔ دربار سے معذور ہوں۔ اس چھٹی کا جواب آیا کہ اگر یہ خیال ہمیں پہلے ہوتا تو ہم جمعہ کو دربار نہ کھولتے، مگر اب اعلان ہوچکا ہے اس لئے دربار تو نہیں موقوف ہوسکتا، آپ نماز جمعہ پڑھیں، آپ کے لئے دربار خاص منعقد کیا جاوے گا۔ یہ مضمون بیان فرما کر خان صاحب نے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ وزیرالدولہ کی یہ حالت کیوں تھی؟ اس کا سبب محض یہ تھا کہ اس نے خاندان شاہ عبدالعزیز کی خاک چاٹی تھی۔ (ارواح ثلاثہ۔۲۸۹)

دستوں کی گولی کھالی:

جب نواب محمود خان کا انتقال ہوا تو حضرات دیو بند کا ارادہ ہوا کہ وہ نواب صاحب کی تعزیت کے لئے چھتاری آئیں، اورانہوں نے مولوی محمود حسن صاحب پر بھی زور دیا کہ تم بھی چلو مولوی محمود حسن صاحب نے مجھے خفیہ جوابی خط لکھا اور لکھا کہ تم اپنی اصلی رائے لکھو کہ میں آؤں یا نہ آؤں؟ اور لکھا کہ اس کا جواب دہلی فلاں شخص کے نام بھیجنا، اور جواب مجمل لکھنا، میں نے لکھ دیا کہ نہ آیئے، اس پر مولوی صاحب نے دستوں کی گولیاں کھالیں اور اصرار کرنے والوں سے بیماری کا عذر کر دیا۔ (ارواح ثلاثہ۔ص ۳۰۰)

امرا کی حیثیت:

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کوئی دولت مند حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے، چونکہ اخلاص لے کر آئے تھے، اس لئے حضرت نے ضیافت کی، اتفاق سے مولانا محمود حسن صاحب اس روز وہاں حاضر تھے، دوپہر کو جب دستر خوان بچھا اور حضرت مہمان کو لے کر کھانا کھانے بیٹھے تو مولوی صاحب وہاں سے سرکے، مبادا، رئیس مہمان کو میرے ساتھ کھانا ناگوار ہو، حضرت نے پیچھے ہٹتے دیکھا تو فرمایا کہ آتے کیوں نہیں؟ مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت آپ نوش فرمائیں، ہم بعد میں کھالیں گے، حضرت سمجھ گئے اور بے ساختہ فرمایا: ''یہ نہیں ہوسکتا کہ تم ساتھ نہ کھاؤ، اگر ان کو تمہارے ساتھ کھانا ناگوار ہو تو یہ اٹھ کر جائیں، مجھے ان سے کیا لینا ہے؟ تمہارے ساتھ تو میری موت زندگی کا ساتھ ہے، اتنا سنتے ہی مولوی صاحب دستر خوان پر بیٹھ گئے کہ مبادا حضرت کی تقریر طویل ہو، اور مہمان کی دل شکنی کا سبب بنے۔ (تذکرۃ الرشید۔ج ۲۔ص ۵۵)

☆☆☆☆☆☆

قدر نعمت اور انتظام

قدر نعمت:

حضرت والد صاحب (مفتی محمد شفیع صاحب) کی اصل دولت قناعت واستغنا تھی، اہل خانہ، رشتہ داروں اور حاجت مندوں پر خرچ کرنے میں بہت فیاض تھے لیکن آپ کا کوئی پیسہ یا کوئی وقت فضول خرچ ہوتے ہم نے نہیں دیکھا، اللہ تعالی کی نعمتوں کی بہت قدر فرماتے، ہر چیز نہایت سلیقہ اور انتظام سے استعمال فرماتے تھے، چھوٹی چھوٹی چیزیں جن کی طرف عام طور سے دھیان نہیں جاتا، ان کا بھی آپ کے یہاں ایک مصرف مقرر تھا، کتب خانہ میں باہر سے کتابوں کے بنڈل اور پیکٹ بہت آتے تھے، آپ کی عادت تھی کہ اس کی سُتلی کھول کر گولے کی شکل میں محفوظ فرمالیتے تھے کہ دوبارہ استعمال میں آسکیں۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ا۔ص ۱۷۶)

ایک سبق:

بھائی جان (مولانا زکی کیفی) کے لڑکپن کا یہ واقعہ حضرت والد صاحب نے کئی بار سنایا کہ میں نے ایک بنڈل میاں زکی کو کھولنے کے لئے دیا، انہوں نے قینچی سے سُتلی جگہ جگہ سے کاٹ کر بنڈل کھول دیا، میں نے ایک طمانچہ رسید کیا کہ یہ کیا طریقہ ہے؟ تم نے ساری سُتلی ضائع کردی اور آئندہ کے لئے طریقہ بتایا۔ بھائی جان اپنا یہ واقعہ بڑے مزے لے لے کر ہمیں سنایا کرتے تھے کہ اس طمانچے نے مجھے پوری تجارتی زندگی میں فائدہ پہونچایا، خاص طور سے سُتلی تو مجھے بڑے کاروبار میں کبھی خریدنی نہیں پڑتی۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ا۔ص ۱۷۶)

قدر نعمت:

حضرت میاں صاحب (مولانا سید اصغر حسین صاحب) کے لئے جو کھانا گھر سے آتا تھا.... خود تو بہت کم خوراک تھے.... محلّہ کے بچوں کو بلا کر کھلاتے تھے، جو بوٹی بچ جاتی اس کو بلی کے

لئے دیوار پر رکھ دیتے اور جو ٹکڑے بچ جاتے اس کو چھوٹا چھوٹا کر کے چڑیوں کے لئے اور دستر خوان کے ریزوں کو بھی ایسی جگہ جھاڑتے تھے جہاں چیونٹیوں کا بل ہو، حق تعالی کی نعمتوں کی قدر پہچاننا، ان کو ٹھکانے لگانا، انہیں صاحب بصیرت بزرگوں کا حصہ تھا، آج تو ہر گھر میں بچا ہوا کھانا سڑتا ہے، نالیوں میں جاتا ہے، اس کا اگر اہتمام کیا جائے تو بہت سے غریبوں کا پیٹ بھر جائے۔
(ارواح ثلاثہ۔ص ۳۴۶)

صدقہ کا اصول:

حضرت مفتی شفیع صاحب کا معمول یہ تھا کہ زکوۃ ادا کرنے کے علاوہ آپ کے پاس جب بھی کوئی رقم آتی تو اس کا ایک معین حصہ فوراً مصارف خیر میں خرچ کرنے کے لئے علیحدہ فرما لیتے، اور طے کیا ہوا تھا کہ آمدنی اگر محنت سے حاصل ہوئی ہے تو بیسواں حصہ (پانچ فی صد) اور اگر کسی محنت کے بغیر حاصل ہوئی ہے (مثلاً انعام، ہدیہ، تحفہ وغیرہ) تو اس کا دسواں حصہ فوراً علیحدہ نکال لیا جائے، صندوقچی میں ایک تھیلا آپ کے پاس ہمیشہ رہتا تھا، جس پر صدقات و مبرات لکھا رہتا تھا، تنگ دستی کا زمانہ ہو یا فراغی کا، آمدنی کا مذکورہ حصہ آپ فوراً اس تھیلے میں رکھ دیتے تھے، اور جب تک یہ حصہ ''صدقات و مبرات'' کے تھیلے میں نہ چلا جاتا، اس وقت تک اس آمدنی کو استعمال نہیں فرماتے تھے، اگر دس روپئے بھی کہیں سے آئے ہیں تو فوراً اس کے چھوٹے نوٹ بدلوا کر ایک روپیہ اس تھیلے میں رکھنے کا اہتمام فرماتے تھے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ۱ ص ۴۵۶)

حضرت مولانا تھانوی اپنی کمائی کا ایک تہائی خیرات کر دیا کرتے تھے اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب اپنی کمائی کا ایک خمس خیرات کرتے تھے (یعنی پانچواں حصہ) حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب کو دیکھا کہ ان کے پاس تین چپاتیاں آتی تھیں، ان میں ڈیڑھ چپاتی خود تناول فرماتے ایک چپاتی خیرات کر دیتے تھے اور آدھی کسی کو ہدیہ کر دیتے تھے اور کھانے کے ریزہ جو دستر خوان پر گرتے وہ پرندوں یا چیونٹیوں کو ڈلوا دیتے تھے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ۲۔ ص ۸۹۱)

☆☆☆☆☆☆

شجاعت اور اعتماد علی اللہ

انوکھی بہادری:

سفر حج سے واپسی پر آپ (حضرت سید احمد شہید قدس سرہ) موضع ،ڈگہا جو عظیم آباد کے قریب ہے، اپنے ایک مرید بااخلاص شیخ جان کے مکان پر مقیم تھے کہ آپ نے ایک شخص سے فرمایا کہ مکان کے باہر ایک شخص مسلح چکر لگارہا ہے، اس کو میرے پاس لاؤ، جب وہ شخص آپ کے سامنے لایا گیا تو آپ نے مکان خالی کروادیا، سب لوگ باہر چلے گئے، لیکن ایک شخص جو حقیقۃً جاگ رہا تھا، بظاہر سوتا دکھائی دے رہا تھا، وہ سب حال دیکھتا رہا، اس وقت آپ کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا، جب سب لوگ باہر چلے گئے تو آپ نے اس کہا کہ تم جس کام کے لئے آئے، اس میں دیر کیوں کرتے ہو؟ آپ کے یہ فرماتے ہی اس کے جسم میں رعشہ پڑ گیا، اور وہ بدحواس ہوگیا، آپ نے پھر فرمایا کہ میں نے اسی لئے تنہائی کرائی ہے کہ تم اپنا کام پورا کرلو، ڈرو نہیں، اور شک نہ کرو کہ شاید یہ کوئی دوسرا آدمی ہو، میں وہی شخص ہوں، جس کے لئے تم آئے ہو، اس شخص نے اپنے تمام ہتھیار اتار کر آپ کے سامنے رکھ دیئے، اور عرض کیا کہ یہ سب حضور کی نذر ہیں، میں اپنے اس فعل سے توبہ کرتا ہوں، اس کے بعد اس نے بیان کیا کہ فلاں شخص نے مجھے پانچ سو روپئے آپ کو شہید کرنے کے لئے دیئے ہیں، اور میں مال کے لالچ اور شیطان کے فریب میں آکر اس حرکت پر آمادہ ہوگیا، اور یہاں تک پہونچا، اللہ تعالی معاف فرمائے، اور آپ بھی درگزر کریں، اس کے بعد اس نے بیعت کی، آپ نے اس کے سارے ہتھیار واپس کردیئے، اور پانچ روپئے اوپر سے دیئے، اور ان پانچ روپیوں میں سے ایک روپئے کو الگ کرکے فرمایا کہ یہ چار تو اپنی ضروریات میں خرچ کرنا اور اس ایک کو محفوظ رکھنا اور کسی کی نوکری کبھی نہ کرنا، ان شاء اللہ تم زندگی میں پھر کبھی محتاج نہ ہوگے، اور ہمیشہ خوش حال رہوگے۔ (سیرت سید احمد شہید۔ ج ۲۔ ص ۴۷۵)

دوسرا واقعہ:

ایک دوسرا واقعہ بھی اسی طرح کا ہے کہ تکیے (تکیہ رائے بریلی) پر بھی ایک شخص اسی ارادے سے آیا، نماز عصر کے بعد آپ کا معمول تھا کہ سئی ندی کے کنارے تشریف لے جاتے اور دونوں پاؤں پانی میں لٹکا کر بیٹھ جاتے، وہ شخص تلوار کھینچ کر آپ کی طرف دوڑا، اس وقت اور لوگ بھی تھے، کسی نے اس کی تلوار پکڑ لی اور کسی نے اس کو پکڑا بلکہ کسی کا ہاتھ بھی تلوار پکڑنے کی وجہ سے زخمی ہوگیا، بعض آدمیوں نے اس کو مارنے پیٹنے کا ارادہ کیا، حاجی نور محمد درانی نے اس کی گردن پکڑ لی، قریب تھا کہ اس کا گلا گھٹ جائے، آپ بڑی شفقت کے ساتھ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھے، لوگوں کو منع کیا اور فرمایا کہ ہم اس شخص کو بند رکھیں گے، تم چھوڑ دو، لوگوں نے تعمیل ارشاد میں چھوڑ دیا اس خیال سے کہ میں اگر اس کو معاف بھی کردوں تو شاید حاکم نہ چھوڑے، آپ نے اس کو درشن سنگھ کے پاس جو رائے بریلی میں نواب کی طرف سے مقرر تھا، بھیجا اور پیغام دیا کہ ہم نے اس کی خطا معاف کردی ہے، آپ بھی اس کی خطا معاف کریں اور چھوڑ دیں۔

میاں دین محمد کہتے ہیں کہ درشن سنگھ نے دو دن اس کو قید میں رکھا اور پھر اس کو آپ کے پاس بھیج دیا، اور کہا کہ یہ شخص آپ کا قصوروار ہے، آپ جو چاہیں کریں، آپ نے اس کو تکیے میں ٹھہرالیا اور سیر بھر گوشت اور پاؤ بھر گھی اور دوسری اجناس اس کے لئے مقرر کردیں، چنانچہ وہ کچھ مدت تک تکیے پر مقیم رہا، کبھی کبھی اپنے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا بھی آپ کی خدمت میں بھیجتا تھا، جب آپ سے رخصت چاہی تو آپ نے اس کو کچھ عطا بھی کیا۔ (سیرت سید احمد شہید ج ۲۔ص ۴۷۶)

سادھو کو دعوت اسلام:

حکیم خادم علی اورنگ آبادی اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مولوی محمد اسماعیل صاحب اور کچھ ساتھی جن میں مَیں بھی تھا، شکار کے لئے چلے، قطب صاحب کی پرلی طرف میل بھر کے فاصلے پر ایک گشائیں رہتا تھا، جو مرتاض تھا، اور اس کے پاس اس کے چیلے رہتے تھے، اس کی کٹی کے اطراف میں مور بہت زیادہ تھے، ہندوؤں کے نزدیک مور بہت عظمت کی چیز ہے، مولانا نے بندوق سے مور کا شکار کیا، اس پر گشائیں کے چیلوں میں ایک شور مچ گیا، اور گشائیں سمیت سب کے سب مولانا اور ان کے ہمراہیوں سے لڑنے کے لئے آئے، مولانا کے

ہمراہی بھی مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوکر ادھر کو چلے، مولانا نے اپنے ہمراہیوں سے فرمایا کہ خبردار! جب تک میں اجازت نہ دوں تم کچھ نہ بولنا، اور فرمایا کہ تم ذرا نرمی کرو، ان شاءاللہ مور اس کو کھلا کر چلیں گے، یہ کہہ کر مولانا مسکراتے ہوئے گشائیں کی طرف بڑھے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ گشائیں صاحب! ذرا میری بات سن لیجئے، اس کے بعد جو آپ کے جی میں آئے کیجئے، ہم آپ کے پاس موجود ہیں، کہیں جاتے نہیں، غرض اس قسم کی نرم گفتگو سے اس کو نرم کیا، اس کے بعد آپ مناسب طور سے اسلام کی دعوت دی، اور دونوں جانب سے دیر تک اس معاملہ میں گفتگو رہی، اس کے بعد وہ گشائیں اور اس کے اکثر ہمراہی مشرف باسلام ہوئے، اور کچھ لوگ گشائیں کو بھی اور مولانا کو بھی برا بھلا کہتے ہوئے رخصت ہوگئے، مولانا نے اس رات کو گشائیں کے پاس آرام فرمایا اور مور پکوا کر اس کو کھلایا۔ (کاروان ایمان وعزیمت۔ص ۲۸)

☆☆☆☆☆☆

اختلاف کی حدود

وسعت قلب:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

''جس زمانے میں مرحوم (مولانا حافظ جلیل احمد صاحب ،حضرت حکیم الامت کے مخصوص اور ممتاز خلیفہ) اپنے اہل وعیال کے ساتھ تھانہ بھون میں مقیم تھے،آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ کی وقف کردہ جائداد کے متعلق کچھ سوالات حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی خدمت میں پیش کئے ،جن کا جواب اس وقت کے مفتیٔ خانقاہ نے تحریر فرمایا مگر حضرت علیہ الرحمہ کو اس جواب پر اطمینان نہ ہوا اور اس پر کچھ اشکالات تحریر فرما کر اپنا جواب لکھا،اور ارشاد فرمایا اب یہ مجموعہ محمد شفیع کے پاس دیوبند بھیج دیا جائے کہ وہ جواب لکھے،میں نے مسئلہ میں جتنا غور وفکر کیا تو مجھے حضرت علیہ الرحمہ کی تحریر پر اطمینان اور شرح صدر نہیں ہوا بلکہ کچھ شبہات واشکالات پیش آئے ،جن کو تحریر کر کے حضرت کی خدمت میں بھیج دیا،اور میرا جواب حضرت کے جواب سے مختلف ہو گیا،اور معاملہ اور زیادہ الجھ گیا تو مولانا حافظ جلیل احمد صاحب سے فرمادیا کہ خط وکتابت میں طول ہوگا،محمد شفیع کے تھانہ بھون آنے کا انتظار کرو،زبانی گفتگو سے بات طے کر لی جائے گی۔

جب احقر تھانہ بھون حاضر ہوا تو حضرت نے اس مسئلے پر گفتگو کے لئے ایک وقت مقرر فرمایا،اور کافی دیر تک مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث وگفتگو ہوتی رہی،مگر عجیب اتفاق یہ پیش آیا کہ اس زبانی گفتگو میں بھی کسی ایک صورت پر رائیں متفق نہ ہوسکیں،حضرت کے سامنے مجھ بے علم وعمل کی رائے ہی کیا تھی؟ مگر حکم یہی تھا کہ جو کچھ رائے ہو اس کو پوری صفائی سے پیش کرو،اس میں ادب مانع نہ ہونا چاہئے،اس لئے اظہار رائے پر مجبور تھا،کچھ دیر کے بعد مجلس اس بات پر ختم ہوئی کہ دیر کافی ہوگئی ہے،اب پھر کسی روز اس مسئلے پر غور کریں گے۔

اب حافظہ رخصت ہو چکا ہے،پوری بات یاد نہیں،اتنا یاد ہے کہ اس کے بعد پھر تحریر کا

سلسلہ شروع ہوا، حضرت نے میرے شبہات واشکالات کا جواب تحریر فرمایا، مگر احقر کو اس جواب پر اطمینان نہ ہوا، تو مزید سوالات لکھ بھیجے، اس طرح ایک عرصے تک پھر یہ زیر بحث مسئلہ ملتوی رہا، اور آخر میں جب احقر تھانہ بھون حاضر ہوا تو مزید غور وفکر کے لئے ایک مجلس منعقد ہوئی، اس میں بھی صورت حال یہی رہی کہ نہ حضرت کی رائے بدلی اور نہ میری، حضرت نے فرمایا کہ میں تمہارے جواب کو اصول وقواعد کی رو سے غلط نہیں کہتا مگر اس پر میرا شرح صدر نہیں، اس لئے اختیار نہیں کرتا، احقر نے بھی عرض کیا کہ حضرت کی تحقیق کے بعد غالب یہی معلوم ہوتا ہے کہ میری رائے غلط ہوگی مگر کیا کروں؟ اس کا غلط ہونا مجھ پر واضح نہیں، اس لئے حضرت علیہ الرحمہ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اچھا بس آپ اپنی رائے رہیں، میں اپنی رائے اور فتوی پر ہوں۔

مستفتی کو ہم اس کی اطلاع کردیں گے کہ اس مسئلہ میں ہم میں اور ان میں اختلاف ہے اور کسی جانب کو بالیقین غلط نہیں کہہ سکتے، اس لئے تمہیں اختیار ہے جس پر چاہو عمل کرو۔

عجب اتفاق ہے کہ مستفتی جو حضرت کے مرید اور خاص خلیفہ تھے ان کو جب اختیار ملا تو انہوں نے عرض کیا کہ اگر مجھے اختیار ہے تو بندہ محمد شفیع کے فتوی کو اختیار کرتا ہے، حضرت نے بڑی خوشی کے ساتھ اس کو قبول کیا۔ یہ واقعہ حضرت حکیم الامت کی وفات سے چھ سال پہلے یعنی ۱۳۵۶ھ کا ہے۔ (جواہر الفقہ)

صحیح نام لینا چاہئے:

خان صاحب نے فرمایا کہ جن بزرگوں کا اخلاق بہت بڑھ جاتا ہے ان سے مخلوق کی اصلاح نہیں ہوتی، اور فرمایا کہ مولانا نانوتوی جو نہایت وسیع الاخلاق تھے مگر اصلاح کے معاملہ میں اخلاق نہیں برتتے تھے، اور مریدوں اور متعلقین کو برابر روک ٹوک کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا خورجہ تشریف لائے، مولوی فضل رسول بدایونی (اہل بدعت کے پیشوا اور اہل حق کے سخت معاندو مخالف) کا تذکرہ چل گیا، میری زبان سے بجائے فضل رسول (بصاد معجمہ) کے ''فصل رسول'' (بصاد مہملہ) نکل گیا، مولانا نے ناخوش ہوکر فرمایا کہ لوگ ان کو کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا 'فضل رسول'، آپ نے فرمایا کہ تم 'فصل رسول' کیوں کہتے ہو؟۔ (ارواح ثلاثہ۔ ص ۱۸۴)

اکابر متقدمین کا ادب:

جو مسائل ائمہ مجتہدین کے باہمی اختلاف سے متعلق ہیں ان کو بیان کرتے وقت یہ

انداز اختیار کیا جاتا ہے جیسے حق و باطل کا معرکہ پیش ہے، یہ اختلافات مکمل طور سے اخلاص اور علمی دیانت داری پر مبنی ہیں، اور ان کا حاصل زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اپنے مسلک کو ''صواب محتمل الخطاء'' اور دوسرے مسلک کو ''خطاء محتمل الصواب'' قرار دیا جائے، لہٰذا ان مسائل پر گفتگو کے دوران فریق ثانی کا احترام کرنا لازمی ہے، اور اس سلسلے میں مناظرانہ انداز سے مکمل اجتناب کرنا چاہئے، جو حضرات جوش تقریر میں امام بخاری، امام دارقطنی، امام بیہقی وغیرہ کی تردید کرتے ہوئے ان کے بارے میں ایسے کلمات کہہ دیتے ہیں جو ان حضرات کے شایان شان نہیں ہوتے، حضرت والد صاحب (مفتی محمد شفیع صاحب) ان پر سخت نکیر فرماتے، اور اپنے استاذ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ کا یہ ارشاد نقل فرمایا کرتے تھے کہ حافظ ابن حجر ہوں یا علامہ عینی، یہ سب حضرات صدیوں پہلے اپنے خیمے گاڑ چکے ہیں، ان کی شان میں کوئی نامناسب بات کہہ کر اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ (بروایت مولانا تقی عثمانی صاحب)

☆☆☆☆☆☆

مرض الوفات

مولانا محمد یاسین صاحب (متوفی ۱۳۵۵ھ):

مرض وفات میں دو ماہ تک ورم جگر اور کثرت اسہال کی شدید تکلیف اور بخار میں مبتلا رہے مگر لاٹھی کے سہارے مسجد میں پہونچتے رہے، جب اس کی بھی سکت نہ رہی تو مجبوراً ۵۶ دن کی نمازیں گھر پر ادا کرنی پڑیں۔

اپنے لائق فرزند حضرت مفتی محمد شفیع صاحب سے ایک روز فرمانے لگے کہ شفیع ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں انہیں دستوں میں ختم ہو جاؤں گا، مگر کچھ غم نہیں، کیوں کہ حدیث میں اس کو بھی شہادت فرمایا گیا ہے، شب جمعہ میں مغرب کے وقت حالت نازک اور بالکل نزع کا سا عالم تھا، مفتی صاحب کی والدہ نے مفتی صاحب سے فرمایا کہ اس وقت تم مسجد نہ جاؤ، نماز مغرب یہیں ادا کرلو، مگر جماعت کے اس عاشق نے اسی نزع کے عالم میں فرمایا ''نہیں مسجد'' حضرت مفتی صاحب نے حکم کی تعمیل کی، جمعہ کو صبح صادق کے وقت مفتی صاحب کو اٹھایا کہ جلدی کرو، میرے کپڑے اور بدن پاک کرنے ہیں، نماز قضا نہ ہو جائے؟ کپڑے اور بدن پاک ہونے کے بعد فرمایا کہ مجھے وضو کے لئے بٹھاؤ، مفتی صاحب نے اٹھایا تو معلوم ہوا کہ اعضا کی جان نکل چکی ہے، اٹھاتے ہی آنکھیں چڑھ گئیں، حالت بدل گئی، لٹا دیا گیا، پھر کچھ سکون ہوا، اور ذکر و توبہ واستغفار کرنے لگے، پھر اچانک مفتی صاحب کی والدہ محترمہ سے فرمانے لگے کہ رسول مقبول ﷺ۔ اتنے الفاظ تو سنے گئے، اس کے بعد کوئی ایسا جملہ فرمایا کہ ''تشریف لائے'' یا اس کے ہم معنی جو سمجھ میں نہ آئے، نزع شروع ہو چکا تھا، کلمہ پڑھتے رہے، یہاں تک آواز ختم ہوگئی مگر زبان کی حرکت باقی رہی، بالآخر چند منٹ میں ان سب حرکات کو ہمیشہ کے لئے سکون ہو گیا، اور آپ کی اس دعا کی مقبولیت ظاہر ہوگئی جو اکثر پڑھا کرتے تھے۔

جب دم واپسیں ہو یا اللہ! لب پہ ہو لا الہ الا اللہ

(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ا۔ص ۸۵)

مفتی صاحب کی والدہ ماجدہ (متوفی ۱۳۸۱ھ)

حضرت مفتی شفیع صاحب کی والدہ محترمہ سادات میں سے تھیں، اور غالباً وہ حضرت گنگوہی سے بیعت تھیں، بیوہ ہوجانے کے بعد تا حیات اپنے سعادت مند بیٹے کے ساتھ رہیں، لکھنا پڑھنا نہ جانتی تھیں، مگر نماز روزہ اور عبادات کا بڑا اہتمام فرماتی تھیں، ضروری کاموں سے فراغت کے بعد بیشتر وقت ذکر اور نماز میں یا نماز کے انتظار میں گزرتا تھا، سامنے گھڑی رکھی رہتی اور بار باران کی نظریں اسی طرف اٹھتی تھیں، جب بینائی بہت کمزور ہوگئی تو ہم میں سے جو سامنے سے گزرتا اس سے پوچھتیں رہتی ''بیٹے! کیا بجا ہے؟ اذان میں کتنی دیر ہے؟'' کثرت ذکر کی وجہ سے آخر حیات میں یہ حال ہوگیا تھا کہ باتیں کررہی ہوں یا خاموش لیٹی ہوں، ہر سانس کے ساتھ اندر سے خود بخود ''اللہ اللہ'' کی آواز آتی رہتی تھی، جس کا احساس انہیں ہو یا نہ ہو مگر ہم سب اہل خانہ ہمیشہ اس کا مشاہدہ کرتے تھے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ا۔ص ۸۷)

شوق جہاد:

ایک مرتبہ مرض الوفات میں حضرت شیخ الہند کے خدام میں سے کسی نے آپ کو مغموم دیکھا تو وہ یہ سمجھے کہ زندگی سے مایوسی کی بنا پر پریشان ہیں، چنانچہ انہوں نے کچھ تسلی کے الفاظ کہنے شروع کئے، اس پر حضرت نے فرمایا:

''ارے مرنے کا کیا غم؟ غم تو اس بات کا ہے کہ بستر پر مر رہا ہوں، ورنہ تمنا تو یہ تھی کہ کسی میدان جہاد میں مارا جاتا، سر کہیں ہوتا اور ہاتھ پاؤں کہیں ہوتے''۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ا ص ۲۳۰)

انتقال کے وقت فتوی:

بعض دوستوں نے مجھے بتلایا کہ حضرت مفتی عزیز الرحمان صاحب کی وفات سے پہلے بھی ایک فتوی ہاتھ میں تھا جس کو موت نے ہاتھ سے چھڑا کر سینہ پر ڈال دیا تھا۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ج ا۔ص ۲۷۳)

مرض الوفات میں علمی انہماک:

حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے ذہن پر احکام القرآن کی تالیف کا بڑا تقاضا تھا، اور آپ نے اس کا ایک حصہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب اور دوسرا مولانا ظفر عثمانی صاحب اور تیسرا مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کے سپرد فرما دیا تھا، مرض وفات کے زمانے میں حضرت ایک روز آنکھیں بند کئے لیٹے تھے، اچانک فرمایا کہ کیا مفتی شفیع ہیں، مفتی صاحب موجود تھے، عرض کیا جی، میں حاضر ہوں، حضرت نے فرمایا "والمحصنٰت" میں جو یہ آیت ہے اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے، یہ فرما کر حضرت نے فرمایا کہ دیکھو فلاں آیت سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے، اس کو ضبط کرلو۔
(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ۱۔ ص ۴۰)

مولانا عبدالحی صاحب کی وفات:

مولانا عبدالحی صاحب مرض بواسیر میں مبتلا تھے، کوئی دوا مفید نہیں ہو رہی تھی، روز بروز بیماری بڑھتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ نزع کی حالت ہوگئی، کسی وقت آپ بے ہوش ہو جاتے، کسی وقت ہوش میں آتے تھے، یہ حال سن کر سید صاحب آپ کے پاس تشریف لائے، جو مولانا کو ذرا ہوش آیا تو سید صاحب کو دیکھا اور پہچانا، آپ نے پوچھا: کیا حال ہے؟ فرمایا: نہایت تکلیف ہے، آپ میرے واسطے دعا کریں، اور میرے سینے پر اپنا قدم رکھ دیں کہ اس کی برکت سے اللہ تعالی اس مصیبت سے نجات دیں، آپ نے فرمایا: مولانا صاحب! آپ کے سینے میں قرآن وحدیث کا علم ہے، یہ مناسب نہیں کہ میں اس پر اپنا قدم رکھوں، پھر آپ نے بسم اللہ کر کے اپنا داہنا ہاتھ رکھ دیا مولانا کو قدرے تسکین ہوئی اور کئی بار "اللہ الرفیق الاعلی" اپنی زبان سے کہا اور انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (سیرت سید احمد شہید۔ ج ۲۔ ص ۶۱)

مولانا خواجہ سید احمد صاحب نصیر آبادی کی وفات:

مولانا خواجہ احمد صاحب نصیر آبادی علیہ الرحمہ کی مفصل روداد مولوی حکیم فخر الدین صاحب (جد امجد مولانا ابوالحسن علی ندوی) کی زبان سے سنئے:

"حضرت دموی المزاج تھے، ایک مرتبہ خدا کی مشیت سے ضعف بہت ہوگیا، خدام کی مجلس میں آپ نے ذکر فرمایا، ایک ناواقف نے قصداً نہیں بلکہ قوت پیدا کرنے کے خیال سے

ناواقفیت کی بنا پر کشتوں کی قسم کی کوئی دوا دیدی، حضرت نے نوش فرمائی، انہیں مہینوں میں کچھ انڈوں کا استعمال بھی زیادہ ہوا، اس کی حرارت سے خون میں کچھ جوش پیدا ہوگیا، اور چند دنوں میں بہت بڑھ گیا، لیکن مسہلات اور مناسب تدابیر سے اللہ تعالی کے حکم سے یہ شکایت زائل ہوگئی، اور آپ کو آرام ہوگیا، عین مسہل کے زمانے میں ہیضہ پھیل گیا، مسہل ہیضہ میں تبدیل ہوگیا، کئی سو کی تعداد میں اسہال کی نوبت آئی، اور صحت سے مایوسی ہوگئی، لیکن "**فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمة**" اس ہیضہ اور اسہال سے اصل مرض کا مادہ خارج ہوگیا، اور مکمل صحت ہوگئی، کچھ دنوں کے بعد قوت بھی آگئی، لیکن کافی مدت تک وطن میں قیام کرنے کے بعد خدام کی درخواست پر پورب کے نواح کا سفر اختیار فرمایا، اور اس میں مرض کے اثرات سے پورا پرہیز اور احتیاط نہ ہوسکی، اور دوسرے سال پھر اس نے عود کیا، اگرچہ اس اعادہ میں بہت سی مناسب تدابیر عمل میں لائی گئیں، اور سیکڑوں روپیہ خرچ ہوا لیکن مرض باوجود اس کے کہ اس کا بڑا حصہ زائل ہوچکا تھا، لیکن مادہ زائل نہ ہوا اور صحت نہ ہوسکی، یہاں تک کہ یکشنبہ ۲۸/ جمادی الاول ۱۲۸۹ھ سے غذا بالکل ترک ہوگئی، اور دوا کا استعمال بھی چھوٹ گیا، دونوں سے بے رغبتی پیدا ہوگئی، اسی روز سے مرض کی زیادتی کے باوجود سلطان الذکر جاری ہوگیا، یہاں تک کہ لطائف ستہ میں سے ہر عضو حرکت میں آگیا، اور جابجا جسم شریف میں عضو معلوم ہوتا تھا کہ اڑ رہے ہیں، قلب کی حرکت سب سے زیادہ تھی، اور اسی وجہ سے تمام اعضا میں شدت سے درد پیدا ہوگیا، اگرچہ یہ حالت دو تین روز رہی لیکن انتقال کا وقت جتنا قریب آتا گیا حرکت اور درد بڑھتا گیا، یہاں تک سہ شنبہ ۳۰/ جمادی الاول کو ان باتوں میں انتہا درجہ کی زیادتی اور شدت پیدا ہوگئی، دل کی جگہ دونوں ہاتھوں سے تھامے بغیر چارہ نہ تھا، لیکن مضبوط تھامنے کے باوجود حرکت کی تیزی اور قوت کی وجہ سے پھسل پھسل جاتا تھا، مریدین کو اس روز عجیب کیفیت حاصل ہورہی تھی، اس روز صبح سے حضرت کی توجہ بڑی قوت کے ساتھ ان لوگوں پر تھی، اور ہر شخص اپنے درجہ کے مطابق اس سے حظ لے رہا تھا، انتقال کے روز قبلہ سے آپ کا رخ ہٹنے نہ پایا تھا، اگرچہ وہ بہی خواہ جو باطن سے بے خبر تھے، درد کے کم ہوجانے کے خیال سے مشرق کی طرف آرام فرمانے کو عرض کرتے تھے مگر آپ قبلہ سے رخ نہ ہٹاتے تھے، نماز اشراق کے بعد جو شخص بھی عیادت کے لئے آیا اس کو آپ نے اللہ ورسول کے اتباع کی وصیت

فرمائی۔

سب سے پہلے آپ نے اپنے بھتیجے مولوی سید احمد حسن کو اللہ ورسول کی اتباع کی تاکید فرمائیں، اور فرمایا کہ تم کو خدا کے سپرد کیا، پھر خواجہ محمد فیض اللہ صاحب سے جو آپ کے سب سے بڑے خلیفہ تھے، فرمایا کہ تم معمول کے مطابق اول وقت اذان دینا، اور نوافل واوراد پر مداومت رکھنا، اور جو ذکر وشغل تم نے سیکھا ہے، اس میں ذاکر وشاغل رہنا، اور دوسروں کو ان کے سکھانے میں کوتاہی نہ کرنا، تم کو میں پہچانتا ہوں، دوسرا تمہاری قدر نہیں جان سکتا، علماءِ ظاہر تو بہت ہیں، اہل باطن کا دستیاب ہونا مشکل ہے، اسی طرح ہر ایک کو اس کی لیاقت کے مطابق وصیت فرمائیں، اور اپنا ہاتھ اپنے خادم خاص اللہ یار خاں پر رکھ کر فرمایا کہ تم نے حق خدمت ادا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، میری اولاد بھی اگر خدمت کرتی تو اس سے زیادہ نہ کرتی، میں تم سے بہت خوش ہوں، تم خیر و فلاح کی امید رکھو۔ لوگ ان وصیتوں کو سن کر اور یہ حالت دیکھ کر رونے لگے، حضرت نے ان کو تسلی دی اور فرمایا: پریشان خاطر مت ہو، اللہ سے امید منقطع نہ کرو، چونکہ پہلے سے وصیت کر دینا مستحب ہے اس لئے یہ چند کلمے میں نے کہے، ورنہ میری طبیعت اچھی ہے، اگر کوئی مزاج پرسی کرتا (تو باوجود سکرات موت کے) استغفار وکلمہ ودعا کے سوا کوئی لفظ زبان پر نہ آتا، اس وقت یہ الفاظ بھی زبان مبارک پر آتے ''شکر ہے، احسان ہے، عنایت، یا اللہ خیر'' اس وقت جو شخص عیادت کے لئے آتا اس سے مصافحہ فرماتے اور اس کا حال اور کیفیت مزاج اچھی طرح دریافت فرماتے، اور اسی طرح رخصت کرتے، اشراق کے بعد بار بار ظہر کو دریافت کرتے اور صبح سے قبض روح تک ارشاد و ہدایت میں مشغول تھے، حاضرین کو نصیحت فرماتے اور جو بیعت کا ارادہ رکھتا اس سے بیعت لیتے، چنانچہ چالیس آدمی کئی دفعہ کر کے اس روز بیعت ہوئے، جو شخص کسی مرض باطنی میں مبتلا تھا اس کو اس کے ازالہ کی نصیحتیں فرماتے، اور باوجود شدت مرض، ضعف اور سکرات موت کے دونوں طریقوں کے مطابق بیعت کرتے، یعنی ایک شاہ عبدالعزیز صاحب کے بیعت لینے کا طریقہ کہ اس میں بہت سے الفاظ ہیں، دوسرے سید احمد شہید قدس سرہ کا طریقہ جس میں اختصار ہے۔ بعض مخلصین نے آپ کے ضعف کو دیکھ کر عرض کیا کہ اس وقت مختصر طریقہ پر بیعت لیں، فرمایا: ان شاء اللہ دونوں طریقوں پر لوں گا، چنانچہ سید وجیہ الدین وغیرہ سے اسی طریقہ پر بیعت لی اس کے بعد

طریقۂ دوم پر اقتصار فرمایا، لوگوں نے صاحبزادوں سید خلیل الرحمان اور سید عبداللہ اور دوسرے عزیزوں کے بچوں کو پیش کیا، حضرت نے فرمایا کہ ''بیعت کی تین قسمیں ہیں، بیعت توبہ، بیعت ارشاد، اور بیعت تبرک، بچوں کے حق میں بیعت تبرک ہے اور دوسروں کے حق میں بیعت توبہ اور بیعت ارشاد ہے، حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بچہ کو سرور کائنات ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا، آں حضرت ﷺ نے اس سے بیعت نہیں لی، دست مبارک اس کے سر پر پھیرا اور دعائے برکت فرمائی، دوسری بار ایک آٹھ سال کے لڑکے کو پیش کیا گیا، آں حضرت ﷺ نے اس سے بیعت لی جیسے کہ ''القول الجمیل'' میں مذکور ہے، اگر کسی کو شک ہو، دیکھ لے''۔ ایک مرید نے عرض کیا کہ جناب کے فرمانے میں کسی کو شک ہوسکتا ہے، فرمایا نہیں اگر کسی کو شک ہو، دیکھ لے، اس کے بعد لڑکوں سے بیعت لی۔

عم محترم سید عبدالوہاب مرحوم نے بڑے صاحبزادے سید خلیل الرحمان کو خلافت عطا فرمانے کے لئے عرض کیا، حضرت نے ان کی کم عمری کو دیکھتے ہوئے انکار فرمایا، اور کہا کہ میں نے اپنے بزرگوں سے جو کچھ پایا ہے، وہ سید خلیل الرحمان، سید عبداللہ اور سید مقتدی (جو آپ کے بڑے بھتیجے تھے) کو دیا، باقی جو صالح اور لائق ہوگا، اس کو ان امور کی اجازت ہے۔

المختصر ظہر سے دو گھنٹے پہلے نفی واثبات کی ضربیں بلند آواز سے اور پورے اطمینان کے ساتھ پیدا ہوگئیں، ظہر کی اذان کے قریب مولوی احمد حسن کو یاد فرمایا اور حاضر رہنے کی ہدایت کی، ظہر کا وقت ہوجانے کے بعد چار رکعت فرض سورہ کوثر و اخلاص سے اللہ یار خان خادم کی گود میں تکیہ کے سہارے پورے اطمینان کے ساتھ ادا فرمائی، سر مبارک کچھ دیر تک اللہ یار خان کی گود میں رہا، باوجود اس کے کہ حاضرین نے دو تین مرتبہ خان موصوف سے کہا کہ نماز پڑھ آؤ، دوسرا آدمی بیٹھ جائے گا لیکن حضرت اس بارے میں خاموش رہے، جس وقت مولوی احمد حسن نے نماز کی اجازت چاہی، فرمایا جلد آنا، جب وہ واپس آگئے تو اللہ یار خان سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ جب آدمی مرجائے تو اس کے دونوں ہاتھ اس کے پہلوؤں میں سیدھے رکھ دینے چاہئیں، اس کی آنکھ بند کردینی چاہئیں اور اس کے پاؤں کو بستر پر سیدھا کردینا چاہئے، اور پاؤں کے انگوٹھوں کو باندھ دینا چاہئے، ڈاڑھی کو کپڑے کے ٹکڑے سے باندھ دینا چاہئے، اس تقریر سے عموی مولوی سید

عبدالوہاب صاحب نے کہا کہ (جو حضرت کے بڑے نسبتی بھائی تھے) آپ ایسی گفتگو کیوں فرماتے ہیں؟ لوگ اور پریشان اور مغموم ہوتے، فرمایا: میں مسئلہ بیان کر رہا ہوں، اسی اثنا میں دو عورتوں نے بیعت کی درخواست کی، آپ نے اس کو عصر پر ملتوی رکھا، پھر فرمایا کہ جلد ہاتھ میں ہاتھ دو، پھر چند کلمات نصیحت آمیز، نماز و روزہ کی پابندی، لڑائی جھگڑے سے بچنے اور شرک و بدعات کے چھوڑنے کی تاکیدیں فرمائیں، اور فرمایا کہ مہلت زیادہ نہیں، پھر اس کے بعد فرمایا کہ ہمارے گھر میں رسوم و بدعات جیسے سہ ماہی، چہلم وغیرہ کچھ نہیں ہوتی، رسول مقبول ﷺ کی پیروی ضرور پیش نظر رہنی چاہیے، اسی اثنا میں برادرم سید محمد ایوب نے پھر اللہ یار خان کو نماز کی یاددہانی کرائی، حضرت نے فرمایا کہ معاملہ درست ہوگیا، پھر محمد مصطفیٰ خان، حاجی نعمت اللہ (جو آپ کے مریدین میں سے ہیں) کا نام لے کر فرمایا کہ ان کو اور دوسرے برادران دینی کو علی العموم سلام علیک کہنا، پھر اللہ یار خان کی گود چھوڑ دی، پاؤں پھیلا دیئے، بدن بستر پر رکھ دیا، اور فرمایا کہ دروازہ کھول دو، لوگوں کو باہر کردو، اب کوئی مجھ سے مخاطب نہ ہو، کہ اس وقت میں اللہ کے ساتھ مواجہہ میں ہوں، پھر لب مبارک کو جنبش ہوئی اور روح مقدس بکمال بے تعلقی شاداں وفرحاں اوج فردوس کی طرف پرواز کرگئی، اور مضمون کلام " **الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب** " ظاہر ہوا۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون** (کاروان ایمان وعزیمت۔ ص ۱۵۵)

مولانا حکیم سید فخر الدین کا انتقال:

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب اپنے والد بزرگوار مولانا حکیم سید فخر الدین صاحب کے انتقال کا واقعہ اس طرح سناتے ہیں کہ:

"۴ رمضان المبارک کو تپ، لرزہ کے ساتھ لاحق ہوئی، اور عادت کے مطابق اسہال شدت سے شروع ہوگئے، دوسرا روز یوم الراحۃ تھا، تیسرے روز پھر لرزہ کے ساتھ باری آئی، اور اس قدر اسہال واستفراغ (قے) ہوا کہ ضعف وناطاقتی سے بے ہوش ہوگئے، تمام رات غافل رہے، اور یوم الراحۃ کو بھی نقل وحرکت کی طاقت نہ رہی، اسی طرح روز بروز ضعف غالب آتا گیا، ساتویں روز یوم الراحۃ کو تمام دن ہوشیار و بیدار رہے، اور اپنے ہاتھ سے لوگوں کو تپ لرزہ کی گولیاں جو آپ کے معمولات میں سے تھیں، اپنے قلم دان سے نکال کر دیتے رہے، اور بیری کی لکڑی جس

پر کچھ لکھ چھوڑا تھا، بازو پر باندھنے کے لئے دیتے رہے، شام کے وقت اسہال شروع ہو گئے، ہر مرتبہ طاقت جواب دیتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ مغرب کے بعد نبض بھی ساقط ہو گئی، اور سوائے سانس کے زندگی کی کوئی علامت باقی نہیں رہی، دس بجے شب کو یک بیک جنبش پیدا ہوئی اور از خود دائیں طرف جھک گئے، اور قلب جاری ہو گیا، اور اس میں اس قدر شدت وحدت پیدا ہوئی کہ سو قدم کے فاصلے سے لفظ مبارک ’اللہ‘ سنا جا سکتا تھا، قلب مبارک میں اتنی جنبش تھی کہ گویا ایک ایک بالشت اچھلتا تھا، یہ حال ایک بجے رات تک رہا، پھر اضمحلال پیدا ہو گیا، اس وقت اس فقیر نے بعض حاضر الوقت دوستوں سے کہا کہ سورہ یس کی تلاوت کریں، تلاوت کرتے ہی خاموشی اور سکون پیدا ہو گیا، دوبارہ سورہ یس کی تلاوت کی گئی، پھر تلقین شروع کی، آپ نے ذکر لسانی شروع فرمایا، منہ اور زبان کی حرکت دیکھنے سے اور آواز قریب سے سننے سے معلوم ہوتی تھی کہ لفظ مبارک ’اللہ‘ کو کمال تجوید کے ساتھ ادا فرماتے تھے، جیسے کہ زندگی میں عادت مبارک تھی، اسی طرح آخر تک ذاکر رہے، دم واپسیں کے وقت فک اسفل بلند ہو گیا اور اسم ذات کے ادا کرنے میں زبان متحرک ہو گئی، مگر پورے طور پر ادا نہ ہونے پایا تھا کہ جان جان آفریں کے سپرد کی۔

چیست ازیں خوب تر در ہمہ آفاق کار دوست رسد نزد دوست یار بنزد یک یار

وہ رات ہم لوگوں کے لئے شب قدر تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملائکۂ رحمت نے ہر طرف سے ہجوم کیا ہے، تنہائی سے کوئی وحشت اور ایسے شفیق باپ کے دنیا سے جانے کا کوئی صدمہ نہ تھا، قلب میں عجیب کشائش تھی اور بے ساختہ زبان پر ’الحمدللہ‘ جاری تھا، احباب تسبیح وتہلیل میں مشغول تھے، اور نماز تہجد ادا کر رہے تھے، ایسی کیفیت محسوس کر رہے تھے جو بیان میں نہیں آسکتی، میں نے اس طرح کی کیفیت اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھیں۔

یہ واقعہ ۱۰؍رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ کا ہے، اس وقت والد ماجد کی عمر ۷۱؍سال کی تھی۔

(کاروان ایمان وعزیمت۔ص۱۷۴)

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کی وفات کا ایمان افروز منظر:

تقریباً ساٹھ سال مخلوق خدا کی نفع رسانی اور ہدایت سامانی میں زندگی گزار کر ۱۲۱؍سال کی عمر میں جس شان کے ساتھ اپنی روح وجان، جہان آفریں پروردگار کے سپرد کی ہے، وہ ان کی

عظمت وبزرگی اور مذہب اسلام کی حقانیت کی ایک عظیم دلیل ہے،موت برحق مگر انسانی افتاد ومزاج اور لذت وخواہش کے برعکس ایک تلخ حقیقت ہے، یہ تلخ حقیقت جب اللہ کے مخلص بندوں تک پہونچتی ہے تو وہی تلخی جو عام انسانوں کے کام ودہن کو ہرنا گوار سے بڑھ کرنا گوار محسوس ہوتی ہے، اللہ والوں کے لئے ایک جام نوشیں ثابت ہوتی ہے، وہ بڑھ کر اس استقبال کرتے ہیں، اور اس کے آثار وعلائم کو محسوس کر کے مسرت وشادمانی سے مست وسرشار ہوجاتے ہیں۔

حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری علیہ الرحمہ کی وفات کے حالات اس درجہ ایمان پرور، دل افروز اور نشاط انگیز ہے کہ انہیں پڑھنے سے ایمان میں تازگی ، آخرت کی محبت اور اللہ کی رحمت کی امید کا ایک زندہ سماں بندھ جاتا ہے، یہ حالات ان کے خلیفہ خاص ، ہمہ وقت کے حاضر باش حضرت زین بدر عربی نے ایک رسالہ میں لکھے ہیں، ہم انہیں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی کے حوالے سے من وعن نقل کرتے ہیں، شیخ زین بدر عربی فرماتے ہیں:

''چہار شنبہ کا دن تھا اور ۵رشوال ۷۸۲ھ کی تاریخ تھی ، میں حاضر خدمت ہوا، نماز فجر کے بعد اس نئے حجرے میں جس کو ملک الشرق نظام الدین خواجہ ملک نے تعمیر کیا تھا، سجادہ پر تکیہ سے سہارا لگائے بیٹھے تھے، شیخ خلیل الدین حقیقی بھائی اور خادم خاص اور بعض دوسرے احباب اور خادم جو متواتر کئی راتوں سے آپ کی خدمت کے لئے جاگتے رہے تھے، جن میں قاضی شمس الدین، مولانا شہاب الدین، (جو خواجہ مینا کے بھانجے تھے) مولانا ابراہیم، مولانا آموں قاضی، میاں ہلال وعقیق اور دوسرے عزیز حاضر تھے، آپ نے زبان مبارک سے فرمایا ''**لاحول ولا قوۃ الا باللہ العظیم**'' پھر حاضرین کی طرف رخ کر کے فرمایا: سبحان اللہ، وہ ملعون اس وقت بھی مسئلہ توحید میں لغزش دینا چاہتا ہے، خدا کا فضل وکرم ہے، اس کی طرف کیا توجہ ہوسکتی ہے، پھر آپ نے **لاحول ولاقوۃ الا باللہ العظیم** پڑھنا شروع کیا، اور حاضرین سے فرمایا: تم بھی پڑھو، اس کے بعد آپ اپنے ادعیہ ووظائف میں مشغول ہوگئے ، چاشت کے وقت ان سے فارغ ہوئے ، کچھ دیر کے بعد اللہ تعالی کی حمد وثنا میں مشغول رہے، بآواز بلند **الحمد للہ الحمد للہ** کہنے لگے، فرماتے تھے: خدا نے کرم فرمایا **المنۃ للہ المنۃ للہ**، کئی بار دل کی خوشی اور اندرونی فرحت کے ساتھ اسی کو بار بار دہراتے رہے۔**الحمد للہ الحمدللہ ،المنۃ للہ المنۃ للہ**

بعد ازاں آں مخدوم حجرہ سے صحن حجرہ میں تشریف لائے، اور تکیہ کا سہارا لیا، تھوڑی دیر کے بعد دست مبارک پھیلائے، جیسے مصافحہ فرمانا چاہتے ہوں، آپ نے قاضی شمس الدین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اور دیر تک لئے رہے، پھر ان کا ہاتھ چھوڑ دیا، خدام کو رخصت کرنے کا آغاز انہیں سے ہوا، پھر قاضی زاہد کا ہاتھ پکڑ کر سینہ مبارک پر رکھا اور فرمایا: ہم وہی ہیں ہم وہی ہیں۔ پھر فرمایا: ہم وہی دیوانے ہیں، ہم وہی دیوانے ہیں۔ پھر تواضع وخاکساری کی کیفیت طاری ہوئی، اور فرمایا: نہیں، بلکہ ہم ان دیوانوں کی جوتیوں کی خاک ہیں، پھر حاضرین میں سے ہر ایک کی طرف اشارہ فرمایا اور ہر ایک کے ہاتھ، داڑھی کو بوسہ دیا، اور اللہ تعالی کی رحمت ومغفرت کے امیدوار رہنے کی تاکید فرمائی، اور بلند آواز سے پڑھا "**لا تقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعاً**"۔ پھر یہ شعر پڑھا۔

خدایا رحمتت دریائے عام است ازانجا قطرے بر ما تمام است

اس کے بعد حاضرین کی طرف رخ کر کے فرمایا: کل تم سے سوال کریں گے تو کہنا "**لا تقنطوا من رحمة الله**" لائے ہیں، اگر مجھ سے پوچھیں گے تو میں بھی یہی کہوں گا، اس کے بعد کلمۂ شہادت بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا "**اشهد ان لا اله الاالله وحده لا شريک له واشهد ان محمدا عبده ورسوله**"۔ یہ الفاظ بھی ادا کئے۔ **رضيت بالله ربا وبالاسلام دينا وبمحمد ﷺ نبيا وبالقرآن اماما وبالكعبة قبلة وبالمومنين اخوانا وبالجنة ثوابا وبالنار عذابا.**

میں اللہ کو رب مانتا ہوں، اسلام کو دین، محمد ﷺ کو نبی، قرآن کو اپنا پیشوا، کعبہ کو قبلہ، اہل ایمان کو اپنا بھائی، جنت کو اللہ کا انعام اور دوزخ کو اللہ کا عذاب تسلیم کرتا ہوں، اور اس عقیدے پر مطمئن ہوں۔

اس کے بعد آپ نے مولانا تقی الدین اودھی کی طرف متوجہ ہو کر اپنا ہاتھ پھیلایا اور فرمایا: عاقبت بخیر ہو، اور ان کے حال پر بڑی عنایت ومہربانی فرمائی، پھر زبان مبارک سے فرمایا، آموں! مولانا آموں حجرے کے اندر تھے، وہ سن کر لبیک کہتے ہوئے دوڑتے ہوئے آئے، آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور چہرۂ مبارک پر ملنے لگے، فرمایا: تم نے بڑی خدمت کی، تمہیں نہیں

چھوڑوں گا، خاطر جمع رکھو، ایک ہی جگہ رہیں گے، اگر قیامت کے دن پوچھیں گے کہ کیا لائے؟ تو کہنا" **لاتقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعاً**"، اگر مجھ سے پوچھیں گے تو میں بھی یہی کہوں گا، دوستوں سے کہو خاطر جمع رکھیں، اگر میری آبرو رہے گی تو میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا، اس کے بعد ہلال اور عقیق کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: تم نے ہم کو بہت خوش رکھا، ہماری بڑی خدمت کی، جیسے ہم تم سے خوش رہیں گے، تم بھی خوش ہوگے اور ہمیشہ خوش رہوگے، تین مرتبہ اپنا ہاتھ میاں ہلال کی پیٹھ پر رکھا اور فرمایا: بامراد ہوگے، اس وقت آپ کے دونوں پاؤں میاں ہلال کی گود میں تھے، اوران کے حال پر بڑی عنایت تھی۔

اس عرصہ میں مولانا شہاب الدین ناگوری آئے، آپ نے کئی باران کے سر، چہرہ، داڑھی اور دستار کو بوسہ دیا، آپ آہ آہ کرتے جاتے تھے، اور الحمد اللہ الحمد للہ کہتے جاتے تھے، آپ نے ہاتھ نیچے کرلیا، اور درود پڑھنے لگے، مولانا شہاب الدین کی بھی آپ کے چہرۂ مبارک پر نظر تھی، اور درود پڑھ رہے تھے، اس کے بعد آپ نے مولانا شہاب الدین خوہر زادہ خواجہ معین الدین کا نام لیا، اور فرمایا: میری بڑی خدمت کی، مجھ سے بہت اتحاد تھا، بڑی خوبی کے ساتھ میری صحبت اٹھائی، عاقبت بخیر ہو، اس وقت مولانا شہاب الدین نے مولانا مظفر بلخی اور مولانا نصیر الدین جونپوری کا نام لیا، اور فرمایا کہ ان دونوں کے باب میں کیا ارشاد ہوتا ہے؟ آپ نے بہت خوش ہوکر مسکراتے ہوئے اور اپنی تمام انگلیوں سے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا مظفر میری جان ہے، میرا محبوب ہے، مولانا نصیر الدین بھی اسی طرح ہیں، خلافت اور مقتدائی کے لئے جو شرائط واوصاف ضروری ہیں، وہ ان دونوں میں موجود ہیں۔

اس موقع پر مولانا شہاب الدین نے کچھ ہدیہ پیش کیا اور عرض کیا، مخدوم! اسے قبول فرمائیں، فرمایا میں نے قبول کیا، یہ کیا ہے میں نے تو سارا گھر قبول کیا، اس کے بعدان کو کلاہ عطا ہوئی، انہوں تجدید بیعت کی درخواست کی، آپ نے قبول فرمایا، اس دوران قاضی مینا حاضر خدمت ہوئے، میاں ہلال نے تعارف کرایا، اور عرض کیا کہ یہ قاضی مینا ہیں، فرمایا: قاضی مینا! قاضی مینا! قاضی مینانے کہا، حضرت حاضر ہوں، اور ہاتھ کو بوسہ دیا، آپ نے ان کا ہاتھ اپنے چہرہ وریشِ مبارک اور رخسار پھیرا، اور فرمایا: خدا کی تم پر رحمت ہو، باایمان رہو، اور باایمان دنیا سے جاؤ، ازراہ

شفقت یہ بھی فرمایا: مینا ہمارے ہیں۔ اس دوران میں مولانا ابراہیم آئے، آپ نے اپنا دایاں ہاتھ ان کی داڑھی پر پھیرا، اور فرمایا: تم نے میری اچھی خدمت کی ہے، اور پورا ساتھ دیا، باآبرو ہوگے، مولانا ابراہیم نے عرض کیا: مخدم مجھ سے راضی ہیں؟ فرمایا ہم سب سے راضی ہیں، تمہیں بھی ہم سے راضی ہونا چاہئے، جو کچھ ہے میری طرف سے ہے، اس کے بعد قاضی شمس الدین کے بھا قاضی نورالدین حاضر ہوئے، آپ نے قاضی نورالدین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اور بڑی شفقت کے ساتھ ان کی داڑھی، چہرہ، رخسار اور ہاتھ کو کئی بار بوسہ دیا، آپ آہ آہ کرتے جاتے، آپ نے ان سے فرمایا کہ تم ہماری صحبت میں بہت رہے ہو، اور ہماری بڑی خدمت کی ہے، ان شاء اللہ کل ایک ہی جگہ رہیں گے، اس کے بعد مولانا نظام الدین کوہی حاضر ہوئے، فرمایا غریب اپنا وطن چھوڑ کر ہمارے جوار میں آ گیا تھا، یہ کہہ کر کلاہ مبارک اپنے سے سر اتار کر ان کو عطا فرمائی، اور حسن عاقبت کی دعا فرمائی، اور فرمایا حق تعالیٰ مقصود تک پہونچائے، پھر سب حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: دوستو! اپنے دین وایمان کا غم کھاؤ، اور اسی میں مشغول رہو۔

اس کے بعد کاتب سطور زین عربی نے دست مبارک کو بوسہ دیا، اپنی آنکھ، سر اور بدن پر پھیرا، ارشاد ہوا کون ہے؟ میں نے عرض کیا، گدائے آستانہ توجہ چاہتا ہے، اور عرض کرتا ہے کہ مجھے از سرنو غلامی میں قبول فرمایا جائے، فرمایا جاؤ، تم کو بھی قبول کیا، تمہارے گھر اور اہل خاندان کو قبول کیا، خاطر جمع رکھو، اگر میری آبرو رہی تو کسی کو چھوڑنے والا نہیں ہوں، میں نے عرض کیا: مخدوم تو مخدوم ہیں، مخدوم کے غلاموں کی بھی آبرو ہے، فرمایا امیدیں تو بہت ہیں۔ قاضی شمس الدین آئے اور حضرت مخدوم کے پہلو میں بیٹھ گئے، مولانا شہاب الدین وہلال وعقیق نے عرض کیا کہ مخدوم! قاضی شمس الدین کے بارے میں کیا ارشاد ہوتا ہے؟ فرمایا قاضی شمس الدین کے بارے میں مَیں کیا کہوں؟ قاضی شمس الدین میرا فرزند ہے، کئی جگہ میں اس کو فرزند لکھ چکا ہوں، خط میں مَیں نے اس کو برادرم بھی لکھا ہے، ان کو علم درویشی کے اظہار کی اجازت ہو چکی ہے، انہیں کے خاطر اتنے کہنے اور لکھنے کی نوبت آئی، ورنہ کون لکھتا؟۔

اس کے بعد برادر اور خادم خاص شیخ خلیل الدین نے جو پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا، آپ نے ان کی طرف رخ کیا، اور فرمایا: خلیل! خاطر جمع رکھو، تم کو علما و درویش چھوڑیں

گئے نہیں، ملک نظام الدین خواجہ ملک آئے گا، اس کو میرا اسلام ودعا پہونچانا، میری طرف سے بہت معذرت کرنا اور کہنا کہ میں تم سے راضی ہوں، اور راضی جارہا ہوں، تم بھی راضی رہنا، فرمایا کہ جب تک ملک نظام الدین ہے تم کو نہیں چھوڑے گا، شیخ خلیل الدین بہت متأثر تھے، آنکھوں میں آنسو تھے، حضرت مخدوم نے جب ان کی دل شکستگی دیکھی تو بڑی شفقت سے فرمایا: خاطر جمع رکھو، اور دل کو مضبوط رکھو، اس کے بعد فرمایا کون ہے؟ ہلال نے عرض کیا کہ ملا محمود صوفی ہیں، آپ نے بڑے گہرے افسوس کے ساتھ فرمایا کہ بیچارہ غریب ہے، مجھے اس کی بڑی فکر ہے، بیچارے کا کوئی نہیں، اس کے بعد ان کے لئے حسن عاقبت کی دعا فرمائی، اس کے بعد قاضی خاں خلیل حاضر خدمت ہوئے، فرمایا: بیچارہ قاضی ہمارا پرانا دوست ہے، ہماری صحبت میں بہت رہا ہے، اللہ تعالی اس کو جزائے خیر دے، اور عاقبت بخیر کرے، اس کے فرزند بھی ہمارے دوست ہیں، سب کی عاقبت بخیر ہو، اور حق تعالی دوزخ سے رہائی دے۔

اس کے بعد خواجہ معز الدین مشرف بخدمت ہوئے، فرمایا عاقبت بخیر ہو، پھر مولانا فضل اللہ نے قدم بوسی کی، فرمایا بھلے بھلے، اللہ عاقبت بخیر کرے، فتوح باورچی روتا ہوا آیا، اور قدموں میں گر گیا، فرمایا: بیچارہ فتوحا، جیسا کچھ تھا میرا ہی تھا، اس کے حق میں بھی دعائے عاقبت فرمائی، اس کے بعد مولانا شہاب الدین صاحب نے شرف قدم بوسی حاصل کی، ہلال نے تعارف کرایا کہ مولانا شہاب الدین حاجی رکن الدین کے بھائی ہیں، فرمایا: انجام بخیر ہو، ایمان کا غم کھاؤ، اور رحمت حق کے امیدوار ہو کر پڑھو **لا تقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعاً**.

کچھ دیر کے بعد نماز ظہر کے قریب سید ظہیر الدین اپنے چچا زاد بھائی کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے، آپ نے سید ظہیر الدین کو بغل میں لے لیا، اور بڑے لطف وشفقت کے ساتھ فرمایا: میں جو عاقبت عاقبت کہتا تھا، یہی عاقبت ہے، اس کے بعد تین مرتبہ ان کو بغل میں لیا اور آخری بار یہ آیت پڑھی، **لاتقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعاً**، اور حاضرین کو رحمت ومغفرت خداوندی کا امیدوار بنایا، اس کے بعد وہاں سے اٹھے اور حجرے میں تشریف لے گئے، اور سید ظہیر الدین کے ساتھ کچھ دیر بیٹھے، اور ان سے کچھ دیر باتیں فرمائیں، اس کے بعد سلطان شاہ پرگنہ دار راجگیر اپنے بیٹے کے ساتھ حاضر خدمت ہوا، ایک روغن کا سرریاح

پیش کیا، ارشاد ہوا کہ مولانا نظام الدین بھی لائے تھے، پھر شربت اور پان دے کر معذرت کی، اس کے بعد خلیل کے بھائی منور نے عرض کیا کہ توبہ و بیعت کرنا چاہتا ہوں، فرمایا آؤ، اس کی جانب ہاتھ بڑھا کر توبہ و بیعت سے مشرف فرمایا، پھر قینچی طلب کی، قینچی سے بال تراشے اور کلاہ پہنائی، اور فرمایا جاؤ دوگانہ ادا کرو اس طرح اس کے بیٹے نے بھی بیعت کی، اس کو بھی یہی حکم ہوا۔

اسی اثنا میں قاضی عالم احمد مفتی، مولانا نظام الدین مفتی کے بھائی جو مریدان خاص میں سے ہیں، آئے، اور ادب کے ساتھ آپ کے سامنے بیٹھ گئے، اسی درمیان ملک حسام الدین کے بھائی امیر شہاب الدین اپنے لڑکے کے ساتھ حاضر ہوئے اور آکر بیٹھ گئے، آپ کی نظر مبارک لڑکے پر پڑی، آپ نے فرمایا: پانچ آیتیں پڑھ سکتے ہو؟ حاضرین نے عرض کیا، ابھی چھوٹا ہے، سید ظہیر الدین مفتی کا لڑکا بھی حاضر تھا، میاں ہلال نے جو دیکھا کہ آپ کو اس وقت کلام الٰہی سننے کا ذوق ہے، تو انہوں نے اس لڑکے کو بلایا اور پانچ آیت پڑھنے کی ہدایت کی، سید ظہیر الدین نے جب محسوس کیا کہ طبیعت مبارک پر قرآن مجید سننے کا تقاضا ہے تو اپنے لڑکے کو ارشاد کیا کہ قرآن مجید کی پانچ آیتیں پڑھو، لڑکا سامنے آیا اور مؤدب بیٹھ گیا، اس نے سورہ فتح کے آخری رکوع کی آیتیں **محمد رسول اللہ والذین معہ الخ** پڑھنی شروع کی، حضرت مخدوم تکیہ کے سہارے آرام فرما رہے تھے، اٹھ بیٹھے، اور معمولِ قدیم کے مطابق باادب دوزانو بیٹھ گئے، اور بڑی توجہ سے قرآن سننے لگے، لڑکا "**لیغیظ بھم الکفار**" پر پہونچا تو مرعوب ہو گیا، اور اس سے پڑھا نہ جا سکا، آپ نے اس کو آگے کے لفظ کی تلقین فرمائی، جب لڑکے نے قرأت ختم کی تو آپ نے فرمایا: اچھا پڑھتا ہے اور خوب ادا کرتا ہے، لیکن مرعوب ہو جاتا ہے، اس موقع پر آپ نے ایک مغربی درویش کا ذکر کیا کہ کبھی اس کی طبیعت حاضر ہوتی تھی اور قرآن مجید سننے کا ذوق ہوتا تھا، کبھی اس طبیعت حاضر نہیں ہوتی تھی اور قرآن مجید سننے کا ذوق نہیں ہوتا تھا۔

اس کے بعد قاضی عالم کو شربت اور پان دینے کا ارشاد ہوا، اور معذرت فرمائی، آپ نے پیراہن جسم سے اتارنا چاہا اور وضو کے لئے پانی طلب فرمایا، اور آستین سمیٹی، مسواک طلب فرمائی، آواز سے بسم اللہ پڑھی، اور وضو شروع فرمایا، اور ہر موقع کی ادعیہ پڑھیں، کہنیوں تک دونوں ہاتھ دھوئے، منھ دھونا بھول گئے، شیخ فرید الدین نے یاد دلایا کہ منھ دھونا رہ گیا، آپ نے

ازسرنو وضو کرنا شروع کیا، اور بسم اللہ اور وضو کی دعائیں جس طرح آئی ہیں، بڑی احتیاط کے ساتھ پڑھتے تھے، مفتی سید ظہیر الدین اور حاضری مجلس دیکھتے تھے، اور تعجب کرتے تھے، اور آپس میں کہتے تھے کہ ایسی حالت میں یہ احتیاط! قاضی زاہد نے پاؤں دھونے میں مدد کرنا چاہی، حضرت مخدوم نے ان کو روک دیا، اور فرمایا، کھڑے رہو، اس کے بعد خود سے وضو پورا کیا، وضو مکمل کرنے کے بعد کنگھی طلب فرمائی، اور داڑھی میں کنگھی کی، اس کے بعد مصلیٰ طلب فرمایا، نماز شروع کی، اور دو رکعت پر سلام پھیرا، تکان ہو جانے کی وجہ سے کچھ دیر آرام فرمایا، شیخ خلیل الدین نے عرض کیا کہ حضرت سلامت حجرہ میں تشریف لے چلیں، ٹھنڈک کا وقت ہو گیا ہے، آپ کھڑے ہوئے، جوتیاں پہنیں اور حجرہ کی طرف چلے، آپ کا ایک ہاتھ مولانا زاہد کے کاندھوں پر تھا، دوسرا مولانا شہاب الدین کے کاندھوں پر، حجرہ میں آپ ایک شیر کی کھال پر لیٹ گئے، میاں منور نے بیعت وتوبہ کی درخواست کی، آپ نے ان کی طرف ہاتھ بڑھادیا، اور ان کو توبہ و بیعت سے مشرف فرمایا، اور ان کے سر کے بال دونوں جانب سے تھوڑے تراشے، ان کو کلاہ پہنائی اور فرمایا جاؤ دوگانہ ادا کرو، یہ آخری بیعت وتوبہ تھی جو آپ نے کرائی، اس موقع پر ایک عورت اپنے دولڑکوں کو لے کر حاضر ہوئی، اور شرف قدم بوسی حاصل کیا، نماز عصر کے بعد مغرب کی نماز کے نزدیک خدام نے عرض کیا کہ حضرت چارپائی پر آرام فرمائیں، آپ چارپائی پر تشریف لے گئے اور آرام فرمایا۔

نماز مغرب کے بعد شیخ خلیل الدین، قاضی شمس الدین، مولانا شہاب الدین، قاضی نورالدین، ہلال وعقیق اور دوسرے احباب وخدام جو خدمت میں مصروف تھے، چارپائی کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے تھے، حضرت مخدوم نے کچھ دیر کے بعد باآواز بلند بسم اللہ کہنی شروع کی، کئی بار بسم اللہ کہنے کے بعد زور زور سے پڑھا **لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین**، اس کے بعد بار بار بلند آواز سے بسم اللہ الرحمان الرحیم پڑھا، پھر کلمہ شہادت **اشھد ان لاالہ الااللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ**، اس کے بعد فرمایا: **لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم**، پھر کچھ دیر تک کلمہ شہادت زبان پر جاری رہا، پھر کئی بار **بسم اللہ الرحمان الرحیم، بسم اللہ الرحمان الرحیم، لا الہ الا اللہ**

محمد رسول الله ،اس کے بعد بڑے اہتمام سے اور دل کی بڑی قوت اور بڑے ذوق وشوق سے محمد، محمد، محمد اللهم صل علی محمد وعلیٰ آل محمد الخ، پھر یہ آیت پڑھی، ربنا انزل علینا مائدة من السماء الخ پھر رضیت بالله ربا وبالاسلام دینا وبمحمد صلی اللہ علیہ وسلم نبیا ،اس کے بعد تین مرتبہ کلمہ طیبہ کا ورد فرمایا، پھر آسمان کی طرف ہاتھ بلند کئے اور بڑے ذوق وشوق کے ساتھ جیسے کوئی دعا اور مناجات کرتا ہے، فرمایا: اللهم اصلح امة محمد اللهم ارحم امة محمد اللهم اغفر لامة محمد اللهم تجاوز عن امة محمد اللهم اغث امة محمد اللهم انصر دین محمد اللهم فرج عن امة محمد فرجاً عاجلاً اللهم اخذل من خذل دین محمد ،برحمتک یا ارحم الراحمین ۔ان الفاظ پر آواز بند ہوگئی، اس وقت زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے، لا خوف علیهم و لا هم یحزنون لا اله الا الله، اس کے بعد ایک بار بسم اللہ الرحمان الرحیم کہا اور جاں بحق تسلیم ہوئے، یہ واقعہ شب پنج شنبہ ۶ رشوال ۷۸۲ھ عشا کی نماز کے وقت کا ہے، اگلے روز پنج شنبہ کے دن نماز چاشت کے وقت تدفین عمل میں آئی۔

نماز جنازہ شیخ اشرف جہانگیر سمنانی نے پڑھائی، جو انتقال کے بعد پہونچے تھے، لطائف اشرفی میں حضرت مخدوم صاحب کی خود وصیت اور پیش گوئی فرمانے، اور شیخ جہانگیر کے وہاں پہونچنے اور حسب وصیت نماز پڑھانے کا واقعہ تفصیل سے مذکور ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخدوم صاحب کی وصیت واطلاع کے مطابق جنازہ تیار کر کے راستہ پر رکھ دیا گیا تھا، اور ان کا انتظار تھا، شیخ اشرف جہانگیر دہلی سے بنگالہ سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ علاؤ الدین علاؤ الحق لاہوری پنڈوی کی خدمت میں تشریف لے جارہے تھے، راستہ میں بہار شریف عین اس وقت میں پہونچے جب حضرت کا جنازہ تیار کر کے راستہ پر رکھ دیا گیا تھا، اور امام کا انتظار تھا، آپ نے نماز جنازہ پڑھائی اور قبر میں اتارا، قبر کچی ہے اور اس پر کوئی گنبد نہیں ہے، سوریوں کے عہد سلطنت میں اس کے گرد وپیش مکانات، مسجد اور حوض وفوارہ بنا، لیکن بخیال اتباع شریعت جس کا حضرت مخدوم کو بڑا اہتمام تھا قبر اپنی حالت پر چھوڑ دی گئی۔ (علوم ونکات ۔ج ۲۔ص ۱۲۰)

☆☆☆☆☆☆

شہدا کا دمِ واپسیں

پہلا شہید:

حضرت امیر المومنین سید احمد شہید قدس سرہ کے حالات میں منقول ہے کہ:

''ہدایت اللہ بانس بریلی کہتے ہیں کہ جس وقت کالے خان کے گولہ لگا اور وہ گھوڑے سے گر پڑے اور صف آگے بڑھ گئی، اور ہم کئی آدمی ان کو وہاں سے مایا مار کی مسجد کے حجرے میں اٹھا لائے، وہ جان کنی کی حالت میں تھے، گھڑی گھڑی دو دو گھڑی کے فاصلے سے انہوں نے پوچھا کہ بھائی لڑائی کا کیا حال ہے؟ اور کس کی فتح ہے؟ اس وقت درانیوں کا پہلا اور دوسرا غول آیا تھا، میں نے ان سے کہا، ابھی تو معاملہ گڈ مڈ ہے، ابھی تک فتح وشکست کسی کی نہیں ہوئی ہے، یہ سن کر وہ چپ ہو رہے اور 'اللہ اللہ' کیا کئے، پھر جب درانیوں کا دوسرا غول آیا اور شکست کھا کر بھاگ گیا تب انہوں نے پھر پوچھا کہ اب لڑائی کا کیا طور ہے؟ کسی کی فتح ہوئی یا نہیں؟ میں نے کہا، اللہ تعالی نے ہمارے سید صاحب کو فتح یاب کیا، یہ خوش خبری سن کر انہوں نے کہا 'الحمد للہ' اسی دم ان کا دم نکل گیا۔

(سیرت سید احمد شہید۔ ج ۲۔ ص ۲۶۰)

دوسرا شہید:

قاضی گل احمد الدین صاحب کہتے ہیں کہ میں نے ایک جگہ دیکھا کہ سید ابو محمد صاحب زخمی پڑے ہیں، مگر ایسے کاری زخم لگے تھے کہ قدرے جان تو ان میں باقی تھی، ہوش وحواس کچھ برجا (بجا) نہ تھے، میں نے کئی بار ان کے کان میں پکار کہا کہ سید ابو محمد! حضرت امیر المومنین کی فتح ہوئی، انہوں نے کچھ خیال نہ کیا، اور نہ کچھ جواب دیا، مگر ان کا حال یہ تھا کہ اپنے ہونٹ چاٹتے جاتے تھے اور 'الحمد للہ' کہتے جاتے تھے، اور جو لوگ لاشیں اٹھا رہے تھے، میں نے ان کو آواز دی کہ کوئی ادھر آؤ، سید ابو محمد صاحب ادھر پڑے ہیں، ادھر سے ایک آدمی آیا، میرے پاس ایک کمبل تھا،

ان کو اٹھا کر اس میں لٹایا، ہم دونوں آدمی ان کو تو رو میں لائے، تب تک ان میں رمق باقی تھی، اسی طرح ہونٹ چاٹتے تھے اور لبوں سے کچھ اشارہ 'الحمدللہ' کہنے کا معلوم ہوتا تھا، پھر کچھ دیر میں جان نکل گئی۔ (سیرت سید احمد شہید ج ۲۔ ص ۲۶۱)

مولانا اسماعیل صاحب کی شہادت:

نگینہ کے مولوی عبداللہ صاحب مرحوم جہاد بالاکوٹ میں مولانا اسماعیل صاحب قدس سرہ کے ساتھ تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ:

''مولوی محمد اسماعیل صاحب نے سید صاحب سے میدان جنگ میں جانے کی اجازت چاہی، حضرت نے فرمایا کہ مولانا اس لڑائی میں ہماری فتح نہیں ہے، آپ نہ جائیے، آپ کے جہاد لسانی سے ان شاء اللہ بندگان خدا کو بہت فائدہ پہونچے گا، مولوی صاحب نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ حضرت! ''یہ سر تصدق کرنے کے لئے لایا ہوں، آپ مجھ کو اجازت ہی دیجئے''۔ سید صاحب خاموش ہوگئے، اور مولانا میدان میں گئے، ایک گولی آپ کے انگوٹھے میں لگی، انگوٹھا کٹ گیا، آپ پھر تشریف لائے، سید صاحب نے پھر منع کیا مگر مولانا نے پھر الحاح وزاری سے اجازت مانگی، اور تشریف لے گئے، مجھے یاد ہے کہ تین مرتبہ سید صاحب نے روکا، آخر کو مولانا اسماعیل صاحب کی پیشانی پر ایک کاری زخم لگا اور آپ شہید ہوئے۔ (کاروان ایمان وعزیمت۔ ص ۳۸)

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

☆☆☆☆☆☆

امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ کے واقعات

تجارت اور دیانت:

مشہور محدث حضرت وکیع بن الجراح بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں امام ابو حنیفہ کے پاس موجود تھا کہ ایک عورت خز (ایک خاص قسم کا کپڑا جس میں تار ریشم کا اور بانا دوسری چیز کا استعمال ہوتا ہے) فروخت کرنے کے لئے لے کر آئی، امام صاحب خز کا کاروبار کرتے تھے، اس نے کہا کہ میرا یہ تھان آپ فروخت کریں گے؟ امام صاحب نے اس سے دریافت کیا کہ کتنی قیمت میں فروخت کرنے کے لئے کہا گیا ہے؟ عورت نے جواب دیا کہ سو درہم میں، امام صاحب کا جواب سننے کے لائق ہے، لانے والا سودے کا دام سو درہم بتا رہا ہے، لیکن امام صاحب کی امانت و دیانت ملاحظہ ہو، چاہئے تو یہ تھا کہ خریدنے والا دام کم کراتا، مگر یہ لوگ تو کسی اور سانچے کے ڈھلے ہوئے تھے، بجائے کم کرانے کے سننے کی بات کی کہ امام صاحب اس عورت سے کہہ رہیں "**ھو خیر من مأۃ درھم**" وہ اس سے بہتر ہے جو سو میں فروخت ہو، فرمایا اور کچھ کہو، اس نے بڑی ہمت کی تو سو بڑھا کر دو سو بتائے، امام صاحب دیکھ رہے تھے کہ کپڑا بیش قیمت ہے اور عورت ناواقفیت کے باعث اس کے دام کم بتا رہی ہے، اسے پھر ٹوکا، اور پھر ٹوکا تو وہ چار سو تک پہونچی، امام صاحب نے پھر سمجھایا کہ وہ اس سے بھی بہتر ہے، عورت جھنجھلا گئی، اس نے خیال کیا ہوگا کہ انہیں خریدنا منظور نہیں ہے، اس لئے ٹٹھول کر رہے ہیں، چڑھ کر کہنے لگی "**تھزأ بی؟**" کیا آپ میرے ساتھ مذاق کرتے ہیں؟ امام صاحب نے دیکھا کہ یہ نروس ہو رہی ہے تو فرمایا کہ جاؤ کسی آدمی کو بلاؤ، وہ جا کر کوئی آدمی پکڑ لائی، امام صاحب نے اس سے قیمت لگوا کر پانچ سو درہم میں خرید لیا۔

آج کی سوز وزیاں کی دنیا میں جب کہ ہر شخص ننانوے کے پھیر میں ہے، اس واقعہ کا یقین کرنا بھی مشکل ہے، برتنا تو درکنار۔ (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ۔ ص ۵۰)

تجارت اور دیانت:

نقشہ تو آپ نے امام صاحب کی خریداری کا دیکھا، اب فروخت کا حال سنئے، جعفر بن عون عمری کہتے ہیں کہ ایک بڑھیا امام صاحب کی دوکان پر آئی اور خز کا ایک تھان طلب کیا، امام صاحب نے ایک عمدہ تھان اسے دکھایا جو اسے پسند آیا، مگر وہ گراں تھا، بڑھیا کہنے لگی کہ میں ایک کمزور عورت ہوں، اور یہ رقم امانت کی ہے، آپ ازراہ کرم ایسا کریں کہ جتنے میں یہ تھا یعنی آپ کو پڑا ہے، اتنے ہی میں میرے ہاتھ فروخت کر دیں، فرمایا بہت اچھا، اس کے دام تم چار درہم دیدو، بڑھیا سخت حیران ہوئی، اس نے بے ساختہ کہا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں بوڑھی عورت ہوں، میرے ساتھ تو آپ کو مذاق نہ کرنا چاہئے، امام صاحب نے ارشاد فرمایا کہ میں مذاق نہیں کرتا، میں نے دو تھان خریدے تھے، ان میں سے ایک تھان کی قیمت مجھے اتنی مل گئی ہے جتنے میں دونوں لئے تھے، اگر کمی تھی تو چار درہم کی اس لئے یہ تھان مجھے چار درہم میں پڑا ہے۔ (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ ص ۵۱)

یہ امانت وصداقت تھی جس نے امام صاحب کو صرف کوفہ ہی میں نہیں تمام دنیا میں ہر دل عزیز بنا کر چھوڑا، مشہور محدث حضرت وکیع بن الجراح نے بالکل سچ فرمایا ہے کہ:

کان ابو حنیفة رضی الله عنه عظیم الامانة جلیلاً فی نفسه یوثر ربه علی کل شئی ولو اخذت السیوف فی الله لاحتمل. (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ۔ص ۵۰)

امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ زبردست امانت دار، جلیل القدر آدمی تھے، ہر چیز پر خدا کی رضا کو ترجیح دیتے، خدا کی راہ میں اگر ان پر تلوار بھی اٹھ جاتیں تو انہیں خوشی سے گوارا تھا۔

پڑوسی کا حق:

امام ابو یوسف علیہ الرحمہ ایک واقعہ سناتے ہیں کہ امام صاحب کے پڑوس میں ایک موچی رہتا تھا، وہ رات میں شراب پی کر گھر لوٹتا اور غل غپاڑہ مچاتا رہتا، ہر روز رات میں یہ ہنگامہ بپا رہتا، اسی نشہ کی حالت میں وہ یہ شعر دہراتا رہتا:

**اضاعونی وای فتی اضاعوا	لیوم کریهة وسداد ثغر**

لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا، افسوس! کیسے جوان مرد کو ضائع کیا، جو لڑائی کے دن اور سرحدوں کی حفاظت کے وقت کام آتا۔

امام صاحب ہر روز رات میں جب نماز میں مشغول ہوتے تو یہ شور وغل سنتے رہتے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اس شور وہنگامہ کی رپوٹ کسی نے پولس کو کر دی، پولیس آئی اور اسے گرفتار کر کے لے گئی، دو تین دن جب اس ہنگامہ کو سکون رہا تو امام صاحب نے اس کی حالت کے بارے میں لوگوں سے دریافت کیا، بتانے والے نے بتایا کہ اسے پولیس گرفتار کر لے گئی، امام صاحب نے فرمایا کہ پڑوسی کا حق ادا کرنا چاہئے، فوراً حاکم کے پاس پہونچے، وہ دیکھتے ہی گھبرا گیا کہ حضرت آپ کیوں تشریف لائے؟ امام صاحب نے فرمایا کہ میرے ایک پڑوسی کو پولیس لے کر آئی ہے، اسی کی سفارش کے لئے آیا ہوں، حاکم نے پوچھا کہ اس کا نام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ نام تو میں جانتا نہیں، البتہ اتنا بتا سکتا ہوں کہ وہ موچی ہے، حاکم اسی وقت حکم جاری کیا کہ اس رات جتنے لوگ پکڑے گئے ہیں سب کو چھوڑا دیا جائے، چنانچہ سب چھوڑ دیئے گئے، وہ موچی امام صاحب کی شکر گزاری کے جذبہ سے حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اچھا جوان بتاؤ، ہم نے تو تمہیں ضائع نہیں ہونے دیا؟۔ (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ۔ص ۵۲)

امام صاحب کی عبادت گزاری:

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ کوفہ کے مشہور محدث مسعر بن کدام امام ابوحنیفہ کے مخالف تھے، اوران کے عیوب کی جستجو میں لگے رہتے تھے، ایک رات کا قصہ ہے کہ امام صاحب عبادت میں مصروف تھے، یہ چپکے سے گئے، امام صاحب سجدہ کی حالت میں تھے، انہوں نے آہستہ سے چند کنکریاں امام صاحب کے کپڑے میں ڈال دیں، اور باہر نکل آئے کہ دیکھیں امام صاحب پر کیا اثر ہوتا ہے؟ امام صاحب کو کچھ خبر نہ ہوئی، وہ سجدہ میں سر رکھے مصروف گریہ وبکا رہے، یہاں تک فجر کی اذان ہوگئی، امام صاحب نماز سے فارغ ہو کر فجر کی سنت پڑھنے لگے، اور پھر رات ہی کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی، مسعر نے جب سارا منظر دیکھا تو بہت نادم ہوئے، صبح اپنے شاگردوں کی پوری جماعت لے کر امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور غایت انصاف پسندی سے کہنے لگے کہ میں نے اب تک جو کچھ آپ کے متعلق کہا ہے سب سے اللہ کے حضور توبہ کرتا ہوں، خدارا آپ بھی معاف فرمادیں، امام صاحب نے فرمایا کہ اگر کوئی جاہل میری غیبت کرے تو وہ بالکل معاف ہے البتہ اہل علم غیبت کرتے ہیں تو جب تک وہ توبہ نہ کریں میری طرف سے ان کی معافی

نہیں ہے، اس لئے علما کا غیبت کرنا ان کے اخلاق عالیہ پر سخت بدنما دھبہ ہے، آپ مطمئن رہیں، میں نے سب کچھ معاف کر دیا، کہتے ہیں کہ پھر جو دونوں بزرگوں میں دوستی قائم ہوئی تو مرتے دم تک باقی رہی۔ (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ۔ ص۵۳)

امام صاحب کی عبادت گزاری:

یہی مسعر بن کدام فرماتے ہیں کہ میں امام ابو حنیفہ کو دیکھا کرتا تھا کہ فجر کی نماز ادا کر کے تلامذہ کے حلقے میں تعلیم کے لئے بیٹھ جاتے اور عصر تک مسلسل مشغول رہتے، اس دوران نہ تو تازہ وضو کی ضرورت پیش آتی اور نہ کھانا تناول فرماتے، اور نہ ہی پانی پیتے، پھر عصر کے بعد مغرب تک اور مغرب کے بعد عشا تک مسلسل تعلیم علم میں مصروف رہتے، میں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ شخص تو پورے دن درس وتدریس میں منہمک رہتا ہے تو عبادت ونوافل کی فرصت اسے کب ملتی ہے؟ ایک دن طے کیا کہ دیکھنا چاہئے کہ یہ رات میں کیا کرتے ہیں؟ دن بھر کے کام تو سب کے سامنے ہیں، ممکن ہے رات میں کچھ عبادت وغیرہ کرتے ہوں، ایک رات یہی ارادہ کر کے ان کی نگرانی میں لگ گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ سب کے ساتھ نماز عشا پڑھ کر اپنے گھر چلے گئے، جب تمام لوگ سو گئے اور گلیوں میں آمد ورفت کا سلسلہ بند ہو گیا تو آپ گھر سے نکل کر مسجد میں آ گئے، اور پوری رات نماز وعبادت میں مشغول رہے، جب صبح ہونے کو آئی اور لوگ نیند سے اٹھنے لگے تو آپ پھر گھر چلے گئے، جب صبح کی نماز کے لئے لوگ مسجد میں آنے لگے تو امام صاحب بھی لباس درست کر کے اور ڈاڑھی میں کنگھی کر کے مسجد تشریف لائے، فجر کی نماز پڑھ کر پھر حسب معمول درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

مسعر فرماتے ہیں کہ میں نے دل میں خیال کیا کہ چند روز کے لئے شاید انہوں اپنا یہ معمول مقرر کر لیا ہو، لیکن یہ چند روزہ بات نہ تھی، میں وصال کے وقت تک یہی دیکھتا رہا، میں نے انہیں ہمیشہ روزہ دار پایا، ایسا کبھی نہیں دیکھا کہ وہ روزہ سے نہ ہوں، اور نہ کبھی دیکھا کہ رات میں لحظہ بھر کے لئے سوئے ہوں، البتہ ظہر سے پہلے تھوڑی دیر برائے نام جھپکی لے لیا کرتے تھے، حضرت مسعر کے شاگرد ثابت کا بیان ہے کہ حضرت مسعر بھی اپنی وفات سے پہلے عبادت و ریاضت میں بہت مجاہدہ کرنے لگے تھے تا آنکہ حالت سجدہ ہی میں وصال ہوا۔ فرحمهما الله

رحمة واسعة. (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ۔ص ۵۳)

مسائل کا استحضار:

کوفہ کے مشہور امام حدیث حضرت وکیع بن الجراح امام ابوحنیفہ کی ذکاوت وذہانت کا ایک عجیب واقعہ سناتے ہیں جس سے امام صاحب کے استحضار مسائل اور سرعت انتقال ذہنی کا اندازہ ہوتا ہے، فرماتے ہیں ہم لوگ امام صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس نے عرض کیا کہ میرے بھائی نے وفات پائی، اس کے ترکے میں کل چھ سو دینار تھے، لیکن لوگوں نے اس میں سے مجھے صرف ایک دینار دیا، امام صاحب نے فرمایا کہ فریضہ کس نے تقسیم کیا؟ اس نے جواب میں امام صاحب کے مشہور شاگرد، صوفی وزاہد حضرت داؤد طائی کا نام لیا، آپ نے برجستہ فرمایا کہ جب یہ تقسیم داؤد طائی نے کی ہے تو یقیناً تمہارا اتنا ہی حصہ ہے، اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے بھائی جس کا انتقال ہوا ہے، کی بیٹیاں ہیں کہ نہیں؟ اس نے اقرار کیا، فرمایا: اس کی ماں بھی زندہ ہے؟ اس نے ہاں کی، فرمایا کہ بیوی بھی ہے؟ اس نے عرض کیا جی، پھر ارشاد ہوا کہ بارہ بھائی اور ایک بہن؟ کہنے لگی کہ سچ ہے، اب آپ نے مسئلہ سمجھایا کہ مسئلہ کی رو سے دو تہائی دو بیٹیوں کا حصہ ہے، اس لئے چار سو تو وہ لے گئیں، ماں کے لئے چھٹا حصہ متعین ہے، چنانچہ ایک سو اس کا ہوا، بیوی کے لئے شریعت نے آٹھواں حصہ مقرر فرمایا ہے، لہٰذا وہ ۷۵/دینار لے گی، اب کل پچیس دینار بچے، بارہ بھائیوں نے دو دو دینار پائے، اور تمہیں اس کا نصف ایک دینار ملا، یہ سن کر عورت خاموشی واپس چلی گئی۔ (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ۔ص ۳۷)

امام صاحب کی دقت نظر:

حضرت عبداللہ بن مبارک ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہ سے ایک سوال کیا کہ ایک شخص کا ایک درہم اور دوسرے کے دو درہم ہیں، تینوں آپس میں مخلوط ہو گئے، اور تمیز باقی نہ رہی کہ کون درہم کس کا ہے؟ پھر ان میں سے دو درہم ضائع ہو گئے، اب ایک درہم کس کو دیا جائے؟ امام صاحب نے جواب دیا کہ باقی دونوں کے درمیان مشترک ہوگا، دو تہائی دو درہم والے کو ملے گا، اور ایک تہائی ایک والے کو۔

یہ جواب سن کر حضرت عبداللہ بن مبارک قاضی ابن شبرمہ کے پاس گئے، ان سے بھی یہی مسئلہ دریافت کیا، انہوں نے پوچھا کہ یہ مسئلہ کسی اور سے بھی معلوم کر چکے ہو؟ میں نے کہا ہاں،

ابوحنیفہ سے پوچھا تھا، ابن شیرمہ نے کہا کہ ابوحنیفہ نے مسئلہ تم کو بتایا ہوگا کہ وہ درہم دونوں کے درمیان تہائی کے حساب سے تقسیم ہوگا، میں نے کہا، جی ہاں، انہوں نے کہا کہ غلام نے غلط کہا۔ واضح ہو کہ امام صاحب کے دادا زوطی بنی تیم اللہ کے غلام تھے، اسی کی جانب قاضی شیرمہ نے تعریض کی ہے، انہوں نے مسئلہ بتایا کہ یہ تو معلوم ہے کہ ایک شخص کا ایک ہی درہم ہے، اور ضائع دو درہم ہوئے ہیں، تو یقیناً دو درہم والے کا ایک درہم ضائع ہو چکا ہے، البتہ دوسرے درہم میں احتمال ہے، دونوں میں سے ہر ایک کا ہوسکتا ہے، اس لئے گم شدہ دو درہموں سے ایک تو دو والے ذمے ڈال دو، اک درہم مشترکہ قرار دو، اس طرح بچا ہوا درہم آدھا، آدھا دونوں کے درمیان تقسیم ہو جائے گا۔

عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ مجھے ان کی یہ بات بہت پسند آئی، پھر میں امام ابوحنیفہ سے ملا، اتنا کہہ کر عبداللہ بن مبارک امام صاحب کی بلند و بالا شخصیت کی عقیدت و محبت سے سرشار ہو کر بطور جملہ معترضہ کے فرماتے ہیں کہ:

ولو وزن عقله بعقل نصف اهل الارض فى الفقه لرجحهم ان شاء الله.

اگر فقہ میں آدھی دنیا کی عقل کا ان کی عقل سے موازنہ کیا جائے تو ان شاء اللہ انہیں کی عقل غالب ہوگی۔

انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ تم نے ابن شیرمہ سے مسئلہ پوچھا تھا، انہوں نے تم کو بتایا، دو درہموں میں ایک یقیناً معلوم ہے کہ دو درہم والے کا ہے، اس لئے باقی درہم دونوں کے درمیان نصف نصف ہوگا، میں نے اثبات میں جواب دیا، امام صاحب نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے، جب دونوں کے سب دراہم مخلوط ہو گئے اور تمیز باقی نہ رہی تو ہر ایک درہم میں شرکت ہوگئی، ہر درہم میں دو تہائی ایک کا اور ایک تہائی ایک کا ہو گیا، جو دو درہم ضائع ہوئے تو دونوں کے اسی حساب سے ضائع ہوئے، جو بچ گیا اس میں شرکت اسی حساب سے باقی رہی۔ (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ ص ۳۱)

جود و سخاوت اور دریا دلی:

امام ابوحنیفہ کی سخاوت و دریا دلی اور بخششوں کی جو حکایتیں عموماً مشہور ہیں وہ بجائے خود ایسی عجیب و نادر ہیں کہ خودغرضی اور کشمکش مال و جاہ کی اس دنیا میں ان کا یقین کرنا مشکل ہے

لیکن بعض واقعات ان میں بھی ایسے عجیب تر ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ شخص انسانیت کی کن بلندیوں پر جاپہونچا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی مثالیں نبی کریم روحی فداہ ﷺ کی قوت تربیت کے معجزانہ نمونے ہیں، ایک حکایت مشہور صوفی وزاہد شیخ حضرت شفیق بلخی سناتے ہیں، آج بھی پڑھنے سے طبیعت میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوجاتی ہے، آنکھیں اشک بار ہوجاتی ہیں، شفیق بلخی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ایک بار امام ابوحنیفہ کسی مریض کی عیادت کے لئے تشریف لے جارہے تھے، میں بھی ساتھ تھا، اچانک دور سے ایک شخص آتا ہوا دکھائی پڑا، اس نے امام صاحب کو دیکھا اور امام صاحب نے بھی اسے دیکھ لیا، جونہی اس کی نظر امام صاحب پر پڑی سرپٹ بھاگ کر اس نے چھپ جانا چاہا، کوشش کی کہ دوسری راہ لگ کر فرار ہوجائے، امام صاحب سے رہا نہ گیا، بے اختیار آپ نے بلند آواز سے اسے پکارا، سنو سنو! جس راہ پر تم آرہے تھے اسی پر چلے آؤ، دوسرا راستہ نہ اختیار کرو، اس آدمی نے تو سمجھا کہ امام صاحب نے اسے دیکھا نہیں ہے، لیکن اب اسے احساس ہوا کہ انہوں نے دیکھ لیا ہے، تو مارے شرم کے زمین میں گڑ گیا، سر جھکا کر کھڑا ہوگیا، شرم اور رعب کی وجہ سے اس میں سر اٹھانے کی ہمت نہ تھی، امام صاحب شفقت سے پوچھ رہے ہیں۔

'کیوں میاں! جس راہ پر تم آرہے تھے، اسے چھوڑ کر دوسری راہ کیوں چل پڑے تھے؟'

بولا: حضرت! آپ کے دس ہزار درہم میرے ذمہ باقی ہیں، ادائیگی کی جو مدت مقرر تھی اسے گزرے ہوئے طویل عرصہ گزر گیا ہے اور میں اب تک اس کے ادا کرنے پر قادر نہ ہوسکا، اسی واسطے مارے شرم کے آپ کے پاس آنے کی ہمت نہ کرسکا۔

اس کی یہ بات سن اسے سمجھانے لگے کہ سبحان اللہ! صرف اتنی بات کا اتنا اثر ہے کہ تم مجھ سے چھپنے لگے؟ نہیں، تم کو چھپنا نہیں چاہئے، پھر اتنے ہی بس نہیں کہا بلکہ معاً یہ بھی فرمایا کہ جاؤ، میں نے تمہارا سارا قرض معاف کردیا۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ بغیر کسی دغدغہ کے یک قلم سب کو معاف کردیا لیکن سننے کی بات اس کے بعد کی ہے فرماتے ہیں:

واجعلنی فی حل مما دخل فی قلبک منی حیث لقیتنی

مجھے دیکھ کر جو شرم اور دہشت کا اثر تم نے اپنے دل میں پایا ہے، اسے خدارا معاف کردو

اللہ اکبر! مسلمان کے قلب کی اتنی رعایت، سچ فرمایا حضرت بکیر بن معروف نے، جس

کوصاحب عقود.....نے نقل کیا ہے:

ما رأیت رجلاً احسن فی امة محمد ﷺ من ابی حنیفة

میں نے امت محمدیہ میں ابوحنیفہ سے بڑھ کر عمدہ سیرت وخصلت کا شخص نہیں دیکھا۔

اس واقعہ کے مشاہدہ کے بعد حضرت شفیق بلخی جیسے زاہد و بزرگ کی شہادت سنئے۔

فعلمت انه زاهد حقیقی میں نے سمجھ لیا کہ یہ حقیقی زاہد ہیں۔

اشتات / متفرقات

طلبہ کا حق:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے فرمایا کہ:

مولانا محمد یعقوب صاحب دارالعلوم دیو بند میں قرن اول کے صدر مدرس تھے، مادر زاد ولی، خدا رسیدہ اور صاحب کشف وکرامات بزرگ، علم وفضل اور اخلاص وتقوی میں نہایت کامل، قطب زمان اور حضرت گنگوہی کے استاذ زادہ تھے، ان کی خدمت میں چونکہ حاجت مند بکثرت آیا کرتے تھے، اس لئے ان کو درسگاہ پہونچنے میں دیر ہو جایا کرتی تھی، مہتمم صاحب نے حضرت گنگوہی کو جو دارالعلوم کے سرپرست تھے، اس صورت حال سے آگاہ کیا، چنانچہ حضرت گنگوہی دیو بند تشریف لائے اور مولانا محمد یعقوب صاحب سے فرمایا کہ یہ نہ سمجھنا کہ میں بڑا عالم اور اللہ والا ہوں، کوئی مواخذہ نہ ہوگا، طلبہ کا حق ضائع کرتے ہو، قیامت میں کیا جواب دوگے؟ مولانا نے اس فہمائش کو سنا اور اپنی اصلاح کر لی۔ حضرت گنگوہی نے حقوق کے معاملہ میں اتنی برگزیدہ ہستی کی بھی رعایت نہیں فرمائی، ادھر مدرسہ والوں کو سمجھایا کہ تم لوگ مولانا کے مرتبہ کو کیا پہچان سکتے ہو؟ اگر مولانا دارالعلوم کا صرف ایک چکر لگا کر ہی چلے جایا کریں تو خدا کی قسم یہ بھی کافی ہے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر ج ۲۔ ص ۸۲۵)

غیبت سے اجتناب:

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری صاحب اپنی مجلس میں کسی کی غیبت کو کسی حال میں برداشت نہ فرماتے تھے، جب کبھی کوئی شخص کسی دوسرے کا تذکرہ شروع کرتا اور نوبت غیبت کے قریب پہونچنے لگتی تو حضرت ہاتھ اٹھا کر فرماتے: بس بھائی، اس کی حاجت نہیں''۔ اور غیبت کا فتنہ وہیں مر جاتا۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر ج ۱۔ ص ۲۵۳)

عالمانہ برتاؤ:

سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب (فرزند حضرت مولانا محمد قاسمؒ) فرماتے ہیں کہ رامپور ضلع سہارن پور میں ایک خاندان حضرت نانوتوی کا سخت مخالف تھا، اور ہمیشہ درپے آزار رہا کرتا تھا، اسی مخالف خاندان کے رکن دو بھائی تھے، جن سے حضرت نانوتوی کا بچپن سے میل جول تھا، اور حضرت کا دستور تھا کہ جب رامپور آپ کا جانا ہوتا، دونوں بھائیوں سے ملاقات کے لئے ضرور تشریف لے جاتے، اور وہ بھی حضرت سے ملنے حکیم ضیاء الدین صاحب (میزبان ودوست حضرت نانوتوی) کے مکان پر آتے، اس خاندان کے مفسدہ پردازیوں کے زمانہ میں بھی حضرت کی حالت نہ بدلی، حکیم ضیاء الدین صاحب کو ناگواری ہوتی کہ ان مفسدوں کے یہاں حضرت اب تشریف کیوں لے جاتے ہیں؟ آخر یہی تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت پر بڑے بڑے الزامات لگائے، مگر زبان سے حکیم صاحب نے کبھی ذکر نہیں کیا، ایک مرتبہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت نانوتوی دونوں بزرگ رامپور میں اکٹھا ہوگئے، اور حضرت نانوتوی حسب عادت ان لوگوں کے پاس تشریف لے گئے، تو حکیم صاحب نے مولانا گنگوہی سے ذرا تیز لہجہ میں فرمایا کہ دیکھئے مولانا نانوتوی اب بھی وہاں جانا نہیں چھوڑے، حضرت گنگوہی مسکراتے رہے، جب حکیم صاحب کی تیزی بڑھتی گئی، تو مولانا گنگوہی نے ذرا مستعد ہوکر فرمایا کہ حکیم صاحب آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ ان کے قلب کی حالت ملاحظہ نہیں فرماتے، جس شخص کے قلب میں ایمان کی طرح یہ بات راسخ ہوچکی ہے کہ دنیا میں اس سے زیادہ ذلیل وخوار کوئی ہستی نہیں ہے، ایسے شخص کو آپ کس طرح کہیں جانے سے روک سکتے ہیں، اور کہیں چلے جانے سے ان پر کیا اثر ہوسکتا ہے۔ (ارواح ثلاثہ۔ص ۱۸۷)

سادگی وپرکاری:

حضرت نانوتوی کے شاگرد مولانا احمد حسن صاحب امروہوی کا بیان ہے کہ جب مباحثہ شاہجہاں پور طے ہوا، تو مولانا محمد قاسم صاحب بغیر کسی اطلاع کے تنہا بنفس نفیس شاہجہاں پور تشریف لے گئے، جب مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند) نے سنا تو وہ بھی مولانا کے بعد تشریف لے گئے، اس کے بعد میں گیا، شاہجہاں پور میں مولانا محمود حسن صاحب سے میری ملاقات ہوئی،

میں نے دریافت کیا کہ مولانا مل گئے؟ مولانا محمود صاحب نے فرمایا کہ نہیں، مجھ کو ابھی نہیں ملے، میں نے کہا کہ اچھا چلئے سرائے میں چل کر تلاش کریں، چنانچہ سرائے کے اندر جو شخص آنے والوں کا نام لکھا کرتا تھا، اس سے میں نے دریافت کیا کہ یہاں کوئی آدمی خورشید حسن نام کے (مولانا کا تاریخی نام) بھی آئے ہیں، اس نے کہا ہاں آئے ہیں، چنانچہ ہم نے تلاش کیا تو ایک کوٹھری میں مولانا تشریف رکھتے تھے، جب صبح ہوئی تو مولانا میدان مناظرہ میں تشریف لے چلے، راستہ میں ایک ندی پڑتی تھی، اور مولانا پیدل تھے، مولانا پاجامہ پہنے ہوئے ندی میں اتر پڑے، پاجامہ بھیگ گیا، پار اتر کر مولانا نے لنگی باندھی، اور پاجامہ نچوڑ کر پیچھے لاٹھی پر جیسے گاؤں کے رہنے والے ڈال لیا کرتے ہیں، ڈال لیا، اور تشریف لے چلے، جب مولانا کی تقریر ہوئی تب لوگوں کو اطلاع ہوئی کہ مولانا محمد قاسم مناظرہ کا جواب دے رہے ہیں، اس کے بعد رتھ پر بیٹھا کر اعزاز کے ساتھ لوگ واپس لائے، اور مولانا کی تقریر سن کر وہ پادری جو وہاں مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے آیا تھا، اس نے کہا کہ اگر ایمان کسی کی تقریر پر لانا ہوتا تو میں مولانا محمد قاسم کی تقریر پر ایمان لے آتا۔ (ارواح ثلاثہ۔ص ۲۱۸)

الفقر فخری:

صاحبزادۂ محترم حضرت مولانا حافظ احمد صاحب کا ارشاد ہے کہ مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند) فرمایا کرتے تھے، کے ہمارے یہ سارے بزرگ آفتاب و ماہتاب تھے، ایک سے ایک اعلیٰ و افضل تھے، لیکن بہر حال جس کی قیام گاہ پر جا کر دیکھا ضرورت زندگی میں سے کچھ نہ کچھ سامان پایا، حضرت گنگوہی کے حجرے میں سامان مباح میں سے تمام ضروریات موجود نہیں، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے حجرہ میں کچھ نہ کچھ اشیاء نظر پڑتی تھیں، لیکن اس منقطع عن الخلق اور زاہد فی الدنیا (مولانا محمد قاسم نانوتوی) کے حجرہ میں کچھ بھی تو نظر نہ آتا، چٹائی بھی اگر تھی تو وہ بھی ٹوٹی ہوئی، گویا عمر بھر کے لئے اسی ایک چٹائی کو منتخب فرما لیا تھا، نہ کوئی صندوق تھا نہ کپڑوں کی گٹھری، سفر میں جب یہ حضرات جاتے تو حضرت گنگوہی کے خادم خاص عبد اللہ شاہ صندوق لیتے، کپڑے لگاتے، سامان سفر مہیا کرتے، اہتمام ہوتا، لیکن یہاں کوئی اہتمام نہ تھا، اگر کبھی ایک آدھ کپڑا ہوا تو کسی کے پاس رکھوا دیا، ورنہ عموماً اسی ایک جوڑے میں سفر پورا ہوتا تھا، جو حضر میں پہنے

ہوتے تھے، البتہ ایک نیلی لنگی ساتھ رہتی تھی، جب کپڑے زیادہ میلے ہوگئے، تو لنگی باندھ کر کپڑے اتار لئے، اور خود ہی دھو لئے، اور وہ لباس بھی کیا تھا، جو اتنی قلت کے ساتھ رہتا تھا، بغیر کرتے کے بندوں دارا چکن یا انگرکھا، یا پاجامہ، سردی ہوتی تو مختصر سا معمولی عمامہ ورنہ ایک کنٹوپ تمام سردی سر پر رہتا، مدۃ العمر کپڑوں میں بٹن نہ لگائے۔

فرماتے تھے کہ یہ نصاریٰ کی علامت ہے، ہر جگہ بند استعمال کرتے، اگر ان کے پاس کوئی دنیا ہی کے لئے آتا تو محروم وہ بھی نہ ہوتا، کیونکہ آپ کے پاس بہت کچھ آتا تھا، مگر اس میں اپنے لئے کچھ بچا کر رکھ لیں، یہ انہیں پسند نہ تھا۔ (ارواح ثلاثہ۔ص ۱۹۵)

تلاش حق:

مولانا محمد یحییٰ صاحب محدث کاندھلوی (والد ماجد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے فرمایا کہ مولوی یحییٰ! احمد رضا خاں مدت سے میرا رد کر رہا ہے، ذرا اس کی تصنیف ہمیں بھی سنادو، (اس وقت مولانا کی ظاہری بینائی کثرت گریہ کے باعث جاتی رہی تھی) میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھ سے تو نہ ہو سکے گا، حضرت نے فرمایا کہ کیوں؟ میں نے عرض کیا حضرت ان میں تو گالیاں ہیں، فرمایا کہ اجی دور کی گالیوں کا کیا کہنا، پڑی (یعنی بلا سے) گالیاں ہوں، تم سناؤ، آخر اس کے دلائل تو دیکھیں، شاید کوئی معقول بات بھی لکھی ہو، تو ہم رجوع کر لیں، میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھ سے تو نہیں ہوسکتا۔ (ارواح ثلاثہ۔ص ۲۲۳)

بے نفسی کا کمال:

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا گنگوہی حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے، کہ بارش آ گئی، سب طلبہ کتابیں لے لے کر اندر بھاگے، مگر مولانا کو دیکھا گیا تو سب طلبہ کے جوتے اٹھا کر محفوظ جگہ رکھ رہے ہیں۔ (ارواح ثلاثہ۔ص ۲۳۹)

طالب علم کی عزت افزائی:

حضرت مولانا تھانوی نے فرمایا کہ حاجی حضرت محمد عابد صاحب (بانی دارالعلوم دیوبند) ہمارے بزرگوں میں سے ہیں، میرے استاذ مولانا فتح محمد صاحب ان کی ایک حکایت

بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ طالب علمی کے زمانہ میں مَیں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، کیوں کہ اس وقت وہ مہتمم مدرسہ بھی تھے، اسی وقت ایک ڈپٹی صاحب بھی حضرت حاجی صاحب سے ملنے کے لئے آئے تھے، حاجی صاحب اپنی جگہ سے اٹھ چکے تھے، اس لئے کھڑے ہی کھڑے ان سے معمولی گفتگو کر کے رخصت کر دیا، پھر میں گیا، لوٹ کر اپنی جگہ بیٹھنے لگے، میں نے عرض کیا اس کی حاجت نہیں ہے، میں ویسے ہی عرض کرلوں گا، فرمایا کہ تم اپنے آپ کو ڈپٹی صاحب پر قیاس کرتے ہو؟ کہاں وہ دنیا دار اور کہاں تم نائب رسول؟

حاجی محمد عابد صاحب کے زمانہ اہتمام میں ایک طالب علم کسی انتظام میں آپ سے خفا ہوگیا، اور مقابلہ میں برا بھلا کہا، حضرت حاجی صاحب خاموش ہوگئے، دوسرے وقت اس مسجد میں جہاں وہ طالب علم رہتا تھا، خود تشریف لے گئے، اور ان طالب علم کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھے، اور فرمایا کہ مولانا معاف کیجئے، آپ نائب رسول ہیں، آپ کو ناراض رکھنا مجھے گوارہ نہیں۔

حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ مہتمم اور ایک ادنیٰ طالب علم کے سامنے ان کا یہ حال! اب امید نہیں کہ ایسے لوگ پیدا ہوں، روز بروز تغیر ہوتا جاتا ہے، سچ ہے:

حریفاں بعد ما خوردند و رفتند تہی خم خانہا کردند و رفتند

(ارواح ثلاثہ۔ص ۲۸۷)

مہمان کی خدمت:

مفتی محمد شفیع صاحب نے فرمایا کہ میرے ایک دوست مولانا مغیث الدین صاحب ضلع بجنور کے باشندے، جو دارالعلوم دیوبند میں اکثر اسباق میں میرے ساتھ رہے تھے، مگر درمیان میں کچھ عرصہ کے لئے دارالعلوم چھوڑ کر مدرسہ معینیہ اجمیر شریف میں مولانا معین الدین صاحب اجمیری سے معقولات، منطق، فلسفہ پڑھنے کے لئے چلے گئے، کیوں کہ معقولات میں اس مدرسہ کی اور مولانا معین الدین صاحب کی بڑی شہرت تھی، ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مولانا معین الدین صاحب کا ارادہ ہوا کہ ذرا علماء دیوبند سے ملاقات کر کے دیکھیں، کہ وہ کس پائے کے عالم ہیں؟ اور کس انداز کے لوگ ہیں؟ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس اس وقت حضرت شیخ الہند تھے، ان کا نام نامی سنے ہوئے تھے، ان کی ملاقات کے لئے دیوبند کا سفر کیا، یہ وہ زمانہ تھا جس میں اکابر کے

ناموں کے ساتھ لمبے چوڑے القاب نہ تھے، حضرت شیخ الہند پورے دیوبند میں صرف ''بڑے مولوی صاحب'' کے لقب سے معروف تھے، مولانا معین الدین صاحب نے اسٹیشن پر اتر کر تانگہ والے سے پوچھا کہ تم مولانا محمود حسن صاحب کا مکان جانتے ہو؟ تانگہ والے نے جواب دیا کہ دیوبند میں ایک بڑے مولوی صاحب ہیں، ان کا مکان جانتا ہوں، مگر ان کا نام مجھے معلوم نہیں، مولانا نے فرمایا کہ بس وہیں لے چلو، تانگہ والے نے ان کو بڑے مولوی صاحب کے مکان پر پہونچا دیا، یہ اندر داخل ہوئے، دیکھا کہ ایک صاحب پستہ قد، تہبند باندھے ہوئے، صرف بنیان پہنے، چھوٹی دو پلی ٹوپی سر پر پہنے ہوئے مکان کے صحن میں کھڑے ہیں، مولانا نے سمجھا کہ یہ کوئی مولانا محمود حسن صاحب کے خادم ہیں، اپنا سامان ان کے حوالہ کیا، اور کہا، سامان رکھ لو، اور مولانا کو اطلاع دے دو کہ مولانا معین الدین صاحب اجمیری ملاقات کے لئے آئے ہیں، حضرت مولانا کو ان کی ناواقفیت سے خدمت کا خوب موقع ہاتھ آیا، سامان اٹھا کر اندر رکھا، اور پنکھے کے نیچے اپنے آرام کرنے کے لئے جو چارپائی بچھا رکھی تھی، اس پر مولانا کو بیٹھا دیا، بجلی کا زمانہ نہیں تھا، فرشی پنکھا تھا، گرمی کی دوپہر تھی، حضرت نے پنکھا کھینچنا شروع کر دیا، مولانا معین الدین صاحب نے فرمایا کہ میاں! مولانا کو اطلاع کر دو، میں ان کے ملاقات کے لئے آیا ہوں، حضرت نے فرمایا کہ ابھی اطلاع ہو جائے گی، آپ گرمی میں آئے ہیں، ذرا آرام کر لیں، پھر گھر میں تشریف لے گئے، وہاں سے ٹھنڈا شربت لائے، مولانا نے فرمایا کہ مولانا سے کب ملاقات ہوگی، حضرت نے فرمایا کہ وہ بھی ہو جائے گی، آپ شربت نوش فرمائیں، پھر کچھ دیر گزرنے کے بعد گھر میں تشریف لے گئے، اور کھانا لا کر رکھا، اب تو مولانا معین الدین صاحب نے ذرا غصہ کے لہجہ میں فرمایا، کہ آپ کھانا بھی لے آئے، لیکن مولانا سے ملاقات نہیں ہوئی، میری واپسی کا وقت قریب آرہا ہے، اس وقت حضرت مولانا شیخ الہند قدس سرہ نے فرمایا کہ مولانا تو یہاں کوئی نہیں رہتے، بندہ محمود تو میرا ہی نام ہے، یہ سن کر مولانا معین الدین صاحب حیران رہ گئے کہ اب کیا کریں؟ اور بڑی شرمندگی کے ساتھ کہنے لگے، کہ آپ نے پہلے کیوں نہیں ظاہر کیا؟ حضرت نے فرمایا کہ آپ دربار اجمیر سے تشریف لائے ہیں، اگر میں ظاہر کر دیتا تو مجھے یہ خدمت کی سعادت کیسے ملتی؟ مولانا معین الدین صاحب حیرت میں رہ گئے، اور اس معاملہ کا جو اثر ہونا چاہئے تھا، وہی ہوا، انہوں نے واپسی کا ارادہ

ترک کر کے کئی روز قیام فرمایا، اور عمر بھر اس مجلس سے متاثر رہے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر ج ا۔ص ۲۳۲)

برادران وطن کی مہمان داری:

حضرت تھانوی نے فرمایا کہ مولوی محمود رامپوری کہتے تھے کہ ایک مرتبہ میں اور ایک ہندو تحصیل دیوبند میں کسی کام کو گئے، میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کے یہاں مہمان ہوا، اور وہ ہندو بھی اپنے بھائیوں کے گھر کھا پی کر میرے پاس آ گیا، کہ میں بھی یہیں سوؤں گا، اس کو ایک چارپائی دے دی گئی، جب سب سو گئے تو رات کو میں نے دیکھا کہ مولانا زنانہ میں سے تشریف لائے، میں لیٹا رہا، یہ سمجھا کہ اگر کوئی مشقت کا کام کریں گے تو اٹھ کر مدد کر دوں گا، ورنہ خوامخواہ اپنے جاگنے کا اظہار کر کے پریشان کیوں کروں؟ میں نے دیکھا کہ مولانا اس ہندو کی طرف بڑھے، اور اس کی چاپائی پر بیٹھ گئے، اور اس کے پاؤں دبانے لگے، وہ خراٹے لے کر سوتا رہا، مولوی محمود صاحب اٹھے اور کہا حضرت آپ تکلیف نہ کریں، میں دبا دوں گا، مولانا نے فرمایا کہ تم جا کر سوؤ، یہ میرا مہمان ہے، میں ہی اس خدمت کو انجام دوں گا، مجبوراً میں چپ ہو گیا، اور مولانا اس ہندو کے پاؤں دباتے رہے۔ (قصص الاکابر۔ص ۲۰۴)

احتساب نفس:

مولانا محمد قاسم نانوتوی کا ارشاد ہے کہ نواب قطب الدین خاں (مظاہر حق کے مؤلف) بڑے پکے مقلد تھے، اور مولوی نذیر حسین صاحب پکے غیر مقلد، ان میں آپس میں تحریری مناظرے ہوتے تھے، ایک دن کسی مجلس میں میری زبان سے نکل آیا کہ اگر کسی قدر نواب صاحب ڈھیلے ہو جائیں، اور کسی قدر مولوی نذیر حسین صاحب اپنا تشدد چھوڑ دیں، تو جھگڑا مٹ جائے، میری اس بات کو کسی نے نواب قطب الدین خاں تک بھی پہونچا دیا، اور مولوی نذیر حسین صاحب تک بھی، مولوی نذیر حسین صاحب تو سن کر ناراض ہو گئے، مگر نواب صاحب پر یہ اثر ہوا کہ جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا، میرے پاس تشریف لائے، اور آ کر میرے پاؤں پر اپنا عمامہ ڈال دیا، اور پاؤں پکڑ لئے، اور رونے لگے، اور فرمایا کہ بھائی جس قدر میری زیادتی ہو، خدا کے واسطے بتلا دو، مجھے ان کے حالات سے بہت سخت ندامت ہوئی، وہ بہت دیر تک روتے رہے۔ (واضح ہو کہ نواب

صاحب موصوف مولانا نانوتوی سے عمر اور طبقہ کے اعتبار سے مقدم تھے)۔(ارواح ثلاثہ ص۲۹۲)

وہ صورتیں الٰہی:

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب ناقل ہیں کہ ایک مرتبہ مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی (شاہ اسحاق محدث دھلوی کے تلمیذ اور علماء دیو بند کے بزرگ) کہیں تشریف لے جارہے تھے، راستہ میں ایک بوڑھا آدمی ملا جو بوجھ لئے جارہا تھا، بوجھ کسی قدر زیادہ تھا، بمشکل چل پاتا تھا، مولانا نے جب یہ حال دیکھا تو آپ نے اس سے بوجھ لئے لیا، اور جہاں جانا چاہتا تھا پہونچادیا، اس بوڑھے نے پوچھا کہ اجی! تم کہاں رہتے ہو، فرمایا میں کاندھلہ میں رہتا ہوں، اس نے کہا وہاں مولوی مظفر حسین بڑے ولی ہیں، فرمایا اور تو اس میں کوئی بڑی بات نہیں ہے، ہاں نماز پڑھ لے ہے، اس نے کہا واہ میاں! تم ایسے بزرگ کو ایسا کہو، مولانا نے فرمایا کہ میں ٹھیک کہتا ہوں، وہ بوڑھا ان کے سر ہوگیا، اتنے میں ایک اور شخص وہاں آ گیا، جو مولانا کو جانتا تھا، اس نے بوڑھے سے کہا بھلے مانس! مولوی مظفر حسین صاحب تو یہی ہیں، وہ بوڑھا یہ سنتے ہی ان سے لپٹ کر رونے لگا، مولانا بھی اس کے ساتھ رونے لگے۔(ارواح ثلاثہ۔ص ۱۵۵)

نامعلوم قلی:

اسی کے مماثل ایک واقعہ مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان کا بھی ان کے صاحبزادے مولانا محمد رفیع صاحب لکھتے ہیں کہ سردیوں کی ایک رات میں والد صاحب بذریعہ ریل تھانہ بھون کے اسٹیشن پر اترے، برانچ لائن پر یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، جس کا اسٹیشن بھی بہت چھوٹا اور آبادی سے کافی دور ہے، راستہ میں کھیت اور غیر آباد زمینیں ہیں، وہاں اس زمانہ میں بجلی تو تھی ہی نہیں، رات کے وقت قلی یا سواری ملنے کا امکان نہ تھا، کیوں کہ اس وقت اکا دکا ہی کوئی مسافر آجاتا تھا، گاڑی دو تین منٹ رک کر روانہ ہوگئی، اب اسٹیشن پر ہو کا عالم تھا، ہر طرف جنگل، اندھیری رات اور سناٹا، اسٹیشن سے قیام گاہ تک عموماً آمدورفت پیادہ ہوا کرتی تھی، والد صاحب تنہا تھے، سامان بھی ساتھ میں نہ تھا، اس لئے فکر نہ تھی، اچانک آواز آئی ''قلی، قلی'' یہ آواز بار بار آرہی تھی، اور اب اس میں گھبراہٹ بھی شامل ہوگئی تھی، کوئی صاحب مع اہل وعیال اسی گاڑی سے اترے تھے، قلی نہیں مل رہا تھا، جو آبادی تک پہونچادے، یہ والد صاحب کے ایک واقف کار تھے،

اورعقیدت مندانہ ملتے تھے، والد صاحب سے اپنا بوجھ اٹھوانے پر ہرگز راضی نہ ہوتے، یا عمر بھر ندامت کے بوجھ میں دبے رہتے، حضرت والد صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے جلدی سے سر پر رومال لپیٹ کراوپر سے چادر ڈالی، اور مزدورانہ ہئیت میں تیزی سے پہونچ کر کہا، سامان رکھواؤ، کہاں جانا ہے؟ انہوں نے پتہ مختصراً بتاتے ہوئے، سر پر سامان لادنا شروع کیا، پہلا بکس ہی اتنا بھاری تھا کہ میں نے کبھی نہیں اٹھایا تھا، اوراس پر دوسرا بکس رکھا، تیسرا میرے ہاتھ اور بغل میں تھمانا چاہتے تھے، میں دونوں ہاتھوں سے بمشکل ان بکسوں کو سنبھالتے ہوئے کہا کہ حضور میں کمزور آدمی ہوں، زیادہ نہیں اٹھا سکتا، یہ آپ سنبھال لیں، یہ مختصر قافلہ روانہ ہوا، بوجھ سے میرے پاؤں ڈگمگا رہے تھے، مگر میری اس کمزوری کو میری ٹارچ نے چھپالیا، جو انہیں راستہ دکھا رہی تھی، اور میری طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں دے رہی تھی، ان کے قیام گاہ پر سامان اتارا، اور یہ کہہ کر ذرا اندر گئے کہ ابھی پیسے دیتے ہیں، میں موقع پا کر وہاں سے غائب ہوگیا، اگلے دن خانقاہ میں حسب سابق تعظیم سے ملے، انہیں کیا معلوم کہ وہ ایک قلی سے مل رہے ہیں۔(البلاغ مفتی اعظم نمبر ج ۱۔ص ۱۱۰)

افشاء راز:

مولانا محمد رفیع صاحب لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ والد صاحب نے ہمیشہ راز میں رکھا، حتیٰ کہ جن صاحب کا سامان اٹھایا تھا، انہیں بھی عمر بھر معلوم نہ ہوسکا، کہ وہ فرشتہ صفت قلی کون تھا، تقریباً بیس سال بعد ہم سب بھائیوں کے سامنے یہ راز اس طرح کھلا کہ کراچی میں جب احقر کی عمر پندرہ سال کی تھی، اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، اس زمانہ میں ہماری والدہ صاحبہ کو ہم بھائیوں سے بار بار یہ شکایت پیش آتی تھی کہ وہ گھر کا سودا سلف لانے کے لئے فرماتیں، ہم لڑکپن کی لاپرواہی میں ایک دوسرے پر ٹال دیتے، والدہ ماجدہ کو اس سے جو تکلیف ہوتی ہوگی، اب اس کے تصور سے بھی ڈر لگتا ہے، انہوں نے کئی بار والد صاحب کو توجہ دلائی، اور شکایت کی کہ یہ لوگ بازار سے سامان لانے میں عار سمجھتے ہیں، اس لئے ٹالتے ہیں، والد صاحب چشم پوشی فرماتے رہے، آپ کی عادت تھی کہ کسی غلطی پر بار بار نہیں ٹوکتے تھے، فہمائش کے لئے زیادہ سے زیادہ مؤثر موقع کا انتظار فرماتے، اور ایسے وقت تنبیہ فرماتے، جب سب کو فراغت، طبیعتوں میں نشاط ہو، ایک دن ہم سب

والد صاحب کی خدمت میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے، ہماری کسی کسی بات میں وہ بھی دلچسپی لیتے رہے، پھر اچانک سنجیدہ ہو گئے، اور محترمہ والدہ صاحبہ کی مسلسل پریشانی کا ذکر فرما کر ہماری اس بے پرواہی پر شرم دلائی، پھر آہ سرد بھر کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ میرا ایک راز تھا، جو میرے اور اس کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا، تمہاری اصلاح کے لئے آج وہ راز کھولنے کی ضرورت پیش آ گئی، پھر یہ واقعہ سنایا، ہم سب پر اس کا گہرا اثر ہوا، اور بحمد للہ اس گناہ سے توبہ کی توفیق ہوئی۔

کمال بے نفسی:

اس موقع پر ایک واقعہ بھی سنایا کہ میں دیوبند میں ایک روز نماز فجر کے لئے جا رہا تھا، ایک بہت ہی ضعیف بڑی بی کو دیکھا جو پانی کا گھڑا کنویں سے بھر کر لا رہی تھیں، مگر اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا، بمشکل چند قدم چل کر زمین پر بیٹھ جاتی تھیں، مجھ سے دیکھا نہ گیا، پاس جا کر کہا لاؤ اماں! یہ گھڑا تمہارے گھر پہونچا دوں، یہ کہہ کر میں نے گھڑا اٹھا لیا، وہ ایک چھوٹی برادری سے تعلق رکھتی تھیں، اور اسی محلّہ میں رہتی تھیں، جب میں گھڑا بڑی بی کے گھر رکھ کر نکلا تو وہ نہایت لجاجت اور الحاح کے ساتھ دعائیں دینے لگیں، جو مجھے کافی آگے تک سنائی دیتی رہی، اگلے دن پھر اسی وقت اسی حالت میں ملیں، میں نے پھر گھڑا اٹھا کر ان کے گھر پہونچا دیا، واپسی میں دور تک پھر ان کی دعائیں سنتا رہا، میں یہ سوچ کر کہ یہ سودا تو بڑا سستا ہے، کہ چند منٹ کی محنت پر اتنی دعائیں ملتی ہیں، میں نے روز کا معمول بنا لیا، بڑی بی بھی اس کی عادی ہو گئیں، اب میں کنویں پر ہی پہونچنے کی کوشش کرتا، تا کہ انہیں ڈول بھی نہ کھینچنا پڑے، بحمد للہ یہ معمول عرصہ دراز تک جاری رہا، یہاں تک بڑی بی نے آنا ہی چھوڑ دیا، شاید ان کا انتقال ہو گیا تھا، پھر فرمایا کہ یہ واقعہ بھی آج پہلی بار تم ہی کو بتا رہا ہوں، تا کہ کچھ سبق حاصل کرو۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر ج ۱ ص ۱۱۲)

سلام میں سبقت:

حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب کی یہ ادا سارے مدرسے میں مشہور تھی کہ وہ ہر کس و ناکس کو ہمیشہ ابتداً بالسلام کرنے کا اہتمام فرماتے، اور کوئی شخص عام طور سے انہیں سلام کرنے کی ابتدا نہیں کر سکتا تھا، بعض اوقات طلبہ پہلے سے طے کر کے کوشش کرتے کہ آج ہم مولانا کو پہلے سلام کریں گے لیکن اس کوشش میں کامیاب نہ ہوتے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر ج ۱ ص ۲۷۸)

خود شکنی:

مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی نے سات حج پیدل کئے، ایک مرتبہ حج سے واپس تشریف لا رہے تھے، پانی پت سے چل کر شب کو کسی گاؤں میں سرائے کی مسجد میں قیام کیا، اور اخیر شب میں اٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے، اتفاق سے رات کو سرائے میں چوری ہو گئی، بھٹیاری نے کہا کہ ایک شخص مسجد میں ٹھہرا تھا، اور صبح ہی چلا گیا، ضرور وہی چور ہے، لوگ تعاقب کے لئے آئے اور جھن جھانہ کے قریب آ کر پکڑ لیا، اور کہا کہ تھانہ چلو، آپ نے فرمایا کہ جھن جھانہ کے تھانہ میں نہ لے چلو، کہیں اور چلو، اس پر ان لوگوں نے اور شبہہ کیا، اور وہ جھن جھانہ ہی کے تھانہ میں لے گئے، اور ایک سپاہی کے حوالہ کر دیا، اس نے آپ کو حوالات میں بند کر دیا، تھوڑی دیر میں قصبہ کے لوگوں نے دیکھا تو تمام قصبہ میں شور مچ گیا، عوام بہت مشتعل ہوئے، اور یہ سمجھ کر کہ تھانہ دار کی بدمعاشی ہے، اس کی جان کے درپے ہو گئے، تھانہ کو لوٹنا چاہتے تھے، تھانہ دار خواجہ احمد حسن تھے، مولانا سے خوب واقف تھے، بہت مشکل سے جان بچا کر آئے، اور مولانا کو حوالات سے نکالا، اور واقعہ کی تحقیق کی، پھر لوگ اس پانی پت والے آدمی کی جان کے درپے ہو گئے، جو آپ کو پکڑ کر لایا تھا، آپ نے خواجہ احمد حسن سے فرمایا کہ اس کی جان کے ذمہ دار تم ہو، اس کے ساتھ دو تین آدمی کر دو، جو اس کو پانی پت بخیریت پہونچا دیں۔ (ارواح ثلاثہ۔ص ۱۵۹)

مخلصانہ خدمت:

مولانا مظفر حسین صاحب بہت زیادہ منکسر المزاج تھے، اپنے سب کام خود کیا کرتے تھے، بلکہ دوسروں کے کام کر دیتے تھے، عادت شریفہ یہ تھی کہ اشراق کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلتے، اور جو جو گھر اپنے اقارب کے تھے، ان میں تشریف لے جاتے، اور اگر کسی کو بازار سے کچھ منگانا ہو تو پوچھ کر لا دیتے، پیسہ اس زمانہ میں کم تھا، جو شئے آتی غلہ کی آتی، آپ غلہ کبھی کرتے کے پلّے میں لے جاتے، اور کبھی لنگی میں۔ (ارواح ثلاثہ۔ص ۱۶۰)

(۲) حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہ، دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی تھے، آپ کے بلند علمی مقام کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ آپ اس دور میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی رہے، جب وہاں آسمان علم کے آفتاب و ماہتاب مصروف تدریس تھے، لیکن

تواضع اور سادگی کا عالم یہ تھا کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

حضرت مفتی صاحب کو حق تعالیٰ نے جو کمالات علمی اور عملی، ظاہری اور باطنی عطا فرمائے تھے، حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک شخص کے لئے ادراک بھی آسان نہ تھا، اور کوئی کیسے سمجھے کہ یہ بڑے عالم یا صاحب کرامت صوفی، اور صاحب نسبت شیخ ہیں، جب کہ غایت تواضع کا یہ عالم ہو کہ بازار کا سودا سلف نہ صرف اپنے گھر کا، بلکہ محلّہ کی بیواؤں اور ضرورت مندوں کا بھی خود لاتے، بوجھ زیادہ ہوتا تو بغل میں گٹھری دبا لیتے، اور پھر ہر ایک کے گھر کا سودا مع حساب اس کو پہونچا دیتے۔

ان کے پوتے مولانا تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ احقر نے حضرت والد (مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ) سے بار بار سنا کہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ جب حضرت مفتی صاحب کسی عورت کا سودا دینے کے لئے جاتے تو وہ دیکھ کر کہتی، مولوی صاحب یہ تو آپ غلط لے آئے ہیں، میں نے یہ چیز اتنی نہیں، اتنی منگائی تھی، چنانچہ یہ فرشتہ صفت بزرگ دوبارہ بازار جاتے، اور اس عورت کی شکایت دور کر کے گھر واپس ہوتے، پھر کہتے ہیں کہ تواضع اور سادگی کی یہ صفت اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہ کے جانشیں یعنی حضرت والد صاحب کو بھی خوب عطا فرمائی تھی، آپ بھی اپنے بلند علمی و عملی مقام کے باوصف نہ صرف اپنا بلکہ محلّہ کے بے سہارا افراد اور عزیزوں رشتہ داروں کا کام بھی خود کیا کرتے تھے، اور آپ کو کسی کام سے عار نہ تھی، یہاں تک کہ ایک مرتبہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب قدس سرہ نے غایت شفقت سے فرمایا کہ:

بھئی مولوی صاحب! اب آپ دارالعلوم کے مفتی ہو گئے ہیں، اس منصب کا بھی کچھ خیال کریں، اب آپ کو پتیلی ہاتھ میں لے کر بازار میں نہیں پھرنا چاہئے۔

حضرت والد صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت مدنی قدس سرہ کی اس تنبیہ پر مجھے خیال ہوا کہ میں واقعۃً اس منصب کی حق تلفی تو نہیں کر رہا ہوں؟ لیکن میرے اساتذہ میں سے کسی نے حضرت مدنی سے فرمایا کہ پہلے مفتی صاحب یعنی مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کا حال بھی تو یہی تھا، اس پر حضرت مدنی قدس سرہ نے تبسم فرمایا، گویا فرما رہے ہوں کہ سادگی اور تواضع کی یہ ادا محبوب تو بہت ہے، البتہ اب لوگوں کے مزاج چونکہ بگڑ گئے ہیں، اس لئے قدرے احتیاط کی ضرورت ہے۔

(البلاغ مفتی اعظم نمبر ج ۱۔ص ۱۷۱)

اخلاق و بردباری:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے فتاویٰ دارالعلوم کے شروع میں حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہ کے کچھ حالات تحریر فرمائے ہیں، اس میں آپ لکھتے ہیں:

تقریباً ۱۳۲۵ھ میں جب احقر نے درجہ فارسی میں داخلہ لیا، اس وقت سے حضرت مفتی صاحب کو دور و نزدیک سے دیکھنے کا مسلسل اتفاق ہوتا رہا، اس طرح بیس سال تک حضرت ممدوح سے متعارف ہونے، پھر خدمت میں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی، اس طویل مدت میں کبھی ایک مرتبہ یہ نہیں دیکھا کہ حضرت ممدوح کو کسی پر غصہ آ رہا ہو، یا اس کے متعلق ڈانٹ یا تنبیہ کے معمولی الفاظ بھی کہے ہوں، حلم و کرم، اور حیاء و مروت کے مجسمہ تھے، بڑے بڑے زبان دراز دشمنوں سے بھی سابقے پڑے، مگر اس مرد خدا کی زبان پر ادب و تعظیم کے سوا دوسرا لفظ چلتا ہی نہ تھا۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر ج ۱۔ص ۲۷۲)

امارت یا خدمت:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ کچھ لوگ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ کسی سفر پر روانہ ہوئے، میں بھی ان کے ساتھ تھا، سفر کے آغاز میں حضرت مولانا نے فرمایا کہ اپنے میں سے کسی کو امیر بنالو، ہم نے عرض کیا کہ حضرت! امیر تو متعین ہیں، فرمانے لگے اگر مجھے امیر بنانا چاہتے ہو تو پھر مکمل میری اطاعت کرنی ہوگی، ہم نے کہا ان شاء اللہ ضرور، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب سامان اٹھانے کا مرحلہ آتا، تو مولانا خود آگے بڑھ کر نہ صرف اپنا بلکہ دوسروں کا بھی سامان اٹھا لیتے، ہم لوگ سامان اٹھانے پر اصرار کرتے تو فرماتے میں امیر ہوں، میرے حکم کی اطاعت ضروری ہے، اس کے بعد سارے سفر کا یہی حال رہا، کہ جب کوئی مشقت کا کام ہوتا تو مولانا آگے بڑھتے، اور ہم مداخلت کرتے تو امیر کا حکم سنا کر خاموش کر دیتے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر ج ۱۔ص ۲۷۸)

سادگی اور بے تکلفی:

مولانا مملوک علی صاحب جو کہ مولانا محمد یعقوب صاحب کے والد اور مولانا رشید احمد

صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب کے استاذ ہیں، دہلی میں سرکاری مدرسہ دارالبقاء میں ملازم تھے، دہلی سے نانوتہ جاتے ہوئے، راستہ میں کاندھلہ پڑتا تھا، مولانا مظفرحسین صاحب نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ کاندھلہ میں مل کر جایا کرو، مولانا مملوک علی صاحب نے کہہ دیا تھا کہ تکلف نہ کرنا، صرف ملنے کے لئے کچھ دیر ٹھہر جایا کروں گا، چنانچہ گاڑی راستہ ہی میں چھوڑ کر ملنے آتے، مولانا پہلے معلوم کرتے کہ کھانا کھا چکے یا کھاؤ گے؟ اگر کہا کہ کھا چکے تو کچھ نہیں، اور اگر نہ کھائے ہوتے تو کہہ دیتے کہ میں کھاؤں گا، تو پوچھتے کہ رکھا ہوا لاؤں یا تازہ پکواؤں، چنانچہ ایک بار فرمایا کہ رکھا ہوا لادو، اس وقت صرف کھچڑی کی کھرچن تھی، اسی کو لے آئے، اور کہا کہ رکھی ہوئی یہی تھی، انہوں نے کہا کہ بس یہی رکھ دو، پھر جب رخصت ہوتے تو ان کی گاڑی تک پہونچانے جاتے، یہ ہمیشہ کا معمول تھا۔ (قصص الاکابر۔ص ۴۱)

دیکھ بھائی سالک!:

مفتی شفیع صاحب قدس سرہ نے فرمایا کہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری لاہور تشریف لائے، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب بھی ہمراہ تھے، اور میں بھی ساتھ تھا۔ اس زمانہ میں مہر اور سالک مرحوم پنجاب کے مشہور صحافی اور اہل قلم مانے جاتے تھے، ان حضرات نے حضرت شاہ صاحب اور علامہ عثمانی کی تشریف آوری پر اخبارات میں یہ سرخی لگائی کہ ''لاہور میں علم وعرفان کی بارش''۔ اور پھر ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔

اثناء گفتگو سود کا مسئلہ چل نکلا، مولانا سالک مرحوم نے علامہ عثمانی سے یہ سوال کیا کہ موجودہ بینک انٹرسٹ کو سود قرار دینے کی کیا دلیل ہے؟ علامہ عثمانی نے اس کا جواب دیا، مگر انہوں نے پھر کوئی سوال کرلیا، اسی طرح سوال وجواب کا یہ سلسلہ کچھ دراز ہوگیا، علامہ عثمانی قدس سرہ ہر بار مفصل جواب دیتے مگر وہ پھر کوئی اعتراض کردیتے، وہ اپنی گفتگو میں ان لوگوں کے وکالت کررہے تھے جو یہ کہتے ہیں کہ اگر بینکوں کے سود کو علما جائز قرار دیدیں تو مسلمانوں کے حق شاید مفید ہو۔ حضرت شاہ صاحب مجلس میں تشریف فرما تھے، حضرت کی عادت چونکہ یہ تھی کہ شدید ضرورت کے بغیر نہیں بولتے تھے، نہ اپنا علم جتانے کا معمول تھا، اس لئے علامہ عثمانی کی گفتگو کو کافی سمجھ کر خاموش بیٹھے تھے، لیکن یہ بحث لمبی ہونے لگی تو مداخلت کی اور بے تکلفی سے فرمایا:

''دیکھ بھائی سالک! تم ہو سالک، میں ہوں مجذوب، میری بات کا برا نہ ماننا، بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا جہنم بہت وسیع ہے، اگر کسی شخص کا وہاں جانے کا ارادہ ہو تو اس میں کچھ تنگی نہیں، ہم اس کو روکنے والے کون؟ ہاں البتہ اگر کوئی شخص ہماری گردن پر پاؤں رکھ کر جہنم میں جانا چاہے گا تو ہم اس کی ٹانگ پکڑ لیں گے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ۱۔ ص ۲۵۸)

ان کے مشیر ہم تھے ہمارے مشیر تم:

شاہ صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ایک ہندو شاعر نے بڑے سہل ممتنع انداز میں حضرت علی کے زمانے کے مشاجرات کا سبب نظم میں بیان کیا ہے۔

ایک روز مرتضیٰ سے کسی نے یہ عرض کی　　اے نائب رسولِ امیں! دام ظللکم
بو بکر اور عمر کے زمانے میں چین تھا　　عثمان کے بھی عہد میں لبریز تھا یہ خم
کیوں آپ ہی کے عہد میں جھگڑے یہ پڑ گئے　　اپنی تو عقل ہوگئی اس مسئلے میں گم
کہنے لگے یہ بات کوئی پوچھنے کی ہے؟　　ان کے مشیر ہم تھے ہمارے مشیر تم

(البلاغ مفتی اعظم نمبر۔ ج ۱۔ ص ۲۵۹)

☆☆☆☆☆☆

گدڑی میں لعل

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کے علمی مقام، ان کی رفعت شان اور جلالت قدر سے کون ہے جو ناواقف ہوگا، لیکن اسی کے ساتھ واقعہ یہ ہے کہ وہ سادگی و بے نفسی اور بے تکلفی وانکساری کی اس منزل پر تھے، کہ اہل نظر بھی ابتدا میں دھوکہ کھا جاتے، اور انہیں یہ احساس نہ ہوتا کہ جس ہستی کو ہم اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں، یہ علم وعمل کے کسی خاص مرتبہ پر فائز ہے، علماء دیوبند کے احوال کے ثقہ ترین راوی جو براہ راست حضرت نانوتوی سے بیعت کا تعلق رکھتے ہیں، یعنی امیر شاہ خان صاحب، اس سلسلہ کا ایک دلچسپ اور سبق آموز قصہ سناتے ہیں، پورا قصہ ارواح ثلاثہ میں مذکور ہے، ہم الفاظ میں کسی قدر تصرف کے ساتھ اسے نقل کرتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ ملیح آباد لکھنؤ کے رہنے والے ایک بزرگ حکیم عبدالسلام جو بہت خوش بیان اور صاحب علم تھے، ان سے خان صاحب کے روابط تھے، انہیں حضرت نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے ملاقات کا بے حد شوق تھا، خان صاحب سے اصرار کرتے کہ جب تم حضرت نانوتوی کی خدمت میں جاؤ تو مجھے بھی ساتھ لے چلو، لیکن امیر شاہ خان صاحب اس سے پہلوتہی کرتے، وہ فرماتے ہیں کہ:

مجھ بدنصیب کے دل میں ایک خیال جم گیا تھا، وہ یہ کہ حکیم صاحب بہت خوش بیان اور گویا آدمی ہیں، نواب واجد علی کے طبیب خاص رہ چکے ہیں، اور حضرت مولانا کی خوش بیانی اور پر گوئی یا تو وعظ میں ہوتی ہے، یا سبق پڑھانے میں، اور معمول کی گفتگو ان کی قصباتی ہوتی ہے، اور یہ زمانہ مولانا کی علالت کا تھا، اور اسباق نہ ہوتے تھے، اس لئے ایسا نہ ہو کہ مولانا سے ملنے کے بعد یہ ان کو خاطر میں نہ لائیں، اور ان سے بد اعتقاد ہو جائیں، اور اختلاف خیال کے سبب میرے اور ان کے لطف صحبت میں رخنہ واقع ہو۔

اسی خیال کی کشمکش میں خان صاحب ایک بار دیوبند ہو بھی آئے، حکیم صاحب کو معلوم ہوا تو بہت ناخوشی کا اظہار کیا، اور تاکید بلیغ کی کہ اب کے بار ضرور ساتھ لے لینا، دوسری مرتبہ خان صاحب کا پھر پرگرام بنا، لیکن اس وقت بھی انہوں نے اطلاع نہ کی، کسی طرح حکیم صاحب کو پتہ لگ گیا، بیگ لے کر خود ہی اسٹیشن پر تشریف لے آئے، اب مجبوری تھی، تین آدمیوں کا قافلہ دیوبند کے لئے روانہ ہوا، خان صاحب، حکیم صاحب اور ایک صاحب اور محمد خان نامی خورجہ کے رہنے والے، دیوبند پہونچے تو آفتاب غروب ہو چکا تھا، مغرب کی نماز پڑھ کر حضرت نانوتوی کی خدمت میں حاضری کے قصد سے چل پڑے، ان دنوں مولانا اپنے شاگرد رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے مکان پر رونق افروز تھے، جب مولانا کے مکان کے قریب پہونچے، اور فاصلہ تقریباً پچاس قدم کا رہ گیا تو خان صاحب حکیم صاحب کے ساتھ محمد خان کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے، تاکہ پہونچنے سے پیشتر حکیم صاحب کا ضروری تعارف کرادیں، اس وقت مولانا کے بدن پر جو لباس تھا، اس کا حال سننے کے لائق ہے، سر پر میلا اور پھٹا عمامہ، سردی کا زمانہ تھا، اس لئے دھوتر کی نیلی رنگی ہوئی مرزئی پہنے ہوئے تھے، اس میں بٹن کے بجائے بند لگے ہوئے تھے، اس کے نیچے کرتا نہ تھا، اور انگرکھا، ایک رضائی اوڑھے ہوئے تھے، وہ بھی نیلی تھی، اور اس میں مومی گوٹ لگی تھی، جو پھٹی ہوئی بھی تھی، اور کہیں کہیں سے بالکل اڑی ہوئی، خان صاحب نے پہونچتے ہی عرض کیا کہ حکیم عبدالسلام صاحب زیارت کے لئے آرہے ہیں، مولانا نے سمجھا کہ یہ مولانا عبدالسلام صاحب ہسوی ہیں، جو حضرت شاہ احمد سعید صاحب کے خلیفہ اور مولانا عبدالغنی صاحب مجددی (استاذ حضرت نانوتوی) کے شاگرد ہیں، خان صاحب نے بتایا کہ یہ وہ نہیں ہیں، مولانا حسین احمد صاحب ملیح آبادی کے فرزند حکیم عبدالسلام صاحب ہیں، حضرت سمجھ گئے، اتنے میں حکیم صاحب بھی آگئے، جس وقت حکیم صاحب پہونچے ہیں، اس وقت مجلس کا رنگ یہ تھا کہ دروازہ کے سامنے مولانا ذوالفقار علی صاحب (والد محترم حضرت شیخ الہند) بیٹھے ہوئے تھے، ان کے برابر میں ایک دوسرے عالم مظفر نگر کے تھے، مولانا ایک طرف چارپائی سے کمر لگائے تشریف فرما تھے، اور مولانا کے برابر میں دیوبند کے ایک صاحب اور بیٹھے تھے، جن کی داڑھی اور لباس بہت ہی خوش وضع اور شاندار تھا، اس مجلس میں مولانا کے شاگرد مولوی عبدالکریم پنجابی بھی تھے،

سب لوگ حکیم صاحب کے اعزاز میں کھڑے ہوگئے، حکیم صاحب مولانا کو پہچانتے نہ تھے، شاندار لوگوں سے مصافحہ کرتے رہے، مگر حضرت مولانا کی جانب التفات نہیں کیا، خان صاحب نے جب تعارف کرایا تب مولانا کی جانب متوجہ ہوئے، اور مولانا کے قریب بیٹھ کر نہایت طلاقت لسانی اور خوش بیانی کے ساتھ گفتگو شروع کردی، ساری مجلس ہمہ تن گوش بن گئی، عشاء کی نماز تک مسلسل ان کی گفتگو جاری رہی، کبھی لکھنؤ کے منظروں کی کیفیت کا نقشہ کھینچتے، کبھی اپنے استاذ مرزا حسن علی محدث کے حالات بیان کرتے، اسی گفتگو میں عشاء کا وقت ہوگیا، اس پوری مجلس میں مولانا نے بجز کبھی کبھی "جی ہاں" اور "بجا ہے" کے اور کچھ نہیں فرمایا، صبح پھر مولانا کی خدمت میں یہ لوگ حاضر ہوئے، اس وقت بھی مجلس پر حکیم صاحب کی خوش بیانی چھائی رہی، تیسرے پہر حکیم صاحب نے دارالعلوم کی سیر کی، اور تھوڑی دیر اسباق میں بیٹھے، البتہ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی صدر مدرس کے درس میں زیادہ دیر تک بیٹھے رہے، خان صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ دیکھا کہ حکیم صاحب پر اب تک مولانا کے حالات منکشف نہیں ہوئے تو مجھے اس کا بہت صدمہ ہوا، میں نے کوشش کی کہ کوئی علمی گفتگو ہو، اور مولانا کچھ کہیں، میں نے مولوی محمود حسن صاحب سے کہا کہ تم کوئی علمی بات دریافت کرو، اور مولوی عبدالکریم سے بھی، مگر ہر ایک نے یہی کہا کہ مولانا کی طبیعت اچھی نہیں ہے، اگر حکیم صاحب معتقد ہوجائیں تو کیا؟ اور غیر معتقد ہوجائیں تو کیا؟ ہم تو مولانا کو تکلیف نہ دیں گے، تمہارا جی چاہے تو خود پوچھ لو، میں نے بہت اصرار کیا، اسی میں تکرار بھی ہوگئی، مگر ان صاحبوں نے نہ مانا، حکیم صاحب نے مدرسین کے اوپر تبصرہ کرتے ہوئے، محمد خان سے کہا کہ مولوی محمد یعقوب صاحب حدیث ایسی پڑھاتے ہیں، جیسے میرے والد پڑھاتے ہیں، مگر مرزا حسن علی محدث جیسی نہیں پڑھاتے، اور حضرت مولانا کی جانب اشارہ کرکے کہنے لگے، یہ صاحب تو "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" کے مصداق ہیں، خان صاحب فرماتے ہیں کہ جب یہ بات معلوم ہوئی تو مجھے بہت ملال ہوا، اور میں نے مولوی محمود حسن کو بھی برا بھلا کہا، اور مولوی عبدالکریم سے تو لپاڈگی ہوگئی، خان صاحب نے پھر زور دیا کہ مولانا سے کوئی علمی بات پوچھو، انہوں نے پھر وہی جواب دیا کہ ہم تو مولانا کو تکلیف نہ دیں گے، خواہ حکیم عبدالسلام معتقد ہوں یا غیر معتقد۔

خدا کی شان دیکھئے اسی روز سہارن پور سے ایک صاحب علم مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ ایک پادری نے قرآن پر اعتراض کیا ہے کہ قرآن میں توریت وانجیل کے متعلق تحریف کا دعویٰ کیا گیا ہے، اور قرآن میں اس کا بھی اقرار ہے کہ خدا کے کلام کو کوئی بدل نہیں سکتا، یہ قرآن کا صریح تناقض وتعارض ہے، یہ سن کر مولانا کو جوش آیا، اور جواب میں تقریر شروع فرمادی، اور آٹھ بجے سے کھانے کے وقت تک تقریر فرمائی، آنے والا تو جواب لے کر چلا گیا، ظہر کے بعد حکیم صاحب نے پھر یہی مضمون چھیڑا، اور مولانا نے ظہر سے عصر تک یہی مضمون بیان کیا، پھر مغرب کے بعد سے عشاء تک، اسی مضمون پر بیان چلتا رہا، عشاء کے بعد پھر یہی مسئلہ چھڑ گیا، اور حضرت مولانا کی تقریر کا سلسلہ بارہ بجے تک چلتا رہا، حکیم صاحب نہایت ذوق وشوق سے اور انبساط وانہماک کے ساتھ تقریر سنتے اور سر دھنتے رہے، ان زبان سے "بجا ہے حضور، بجا ہے حضور" کے علاوہ اور کچھ نہیں نکلا، مولانا کو کھانسی کا مرض تھا، مگر آج قدرت کی یاوری دیکھئے دوران تقریر نہ تو کھانسی اٹھی، اور نہ تقریر کی برجستگی میں کوئی خلل واقع ہوا، حکیم صاحب تو بیٹھے رہتے، مگر خان صاحب نے باصرار وبتکرار اٹھنے کو کہا، جب حکیم صاحب اٹھے، تو وہاں سے ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہوئے اٹھے، اب تو حکیم صاحب مولانا کے نہایت معتقد ہو گئے، خان صاحب کو ان کی کیفیت کی تبدیلی کا علم اسی وقت ہو چکا تھا، مگر اس وقت نہیں چھیڑا، خان صاحب فرماتے ہیں کہ صبح کے وقت حکیم عبدالسلام اور ہم سب روانہ ہوئے، حکیم صاحب کو پہونچانے کے لئے مولوی محمود حسن، حافظ احمد، مولوی عبدالکریم اور دوسرے اشخاص اسٹیشن تک آئے، اسٹیشن پہونچ کر میں نے حکیم عبدالسلام کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے، اور کہا کہ پرسوں جو کچھ آپ نے محمد خان سے فرمایا تھا، وہ میں سن چکا ہوں، اب فرمایئے مولانا کو کیسا پایا؟ اس پر حکیم صاحب نے فرمایا کہ جواب سنو! میری آرزو یہ ہے کہ حق تعالیٰ مجھے اتنی قوت دے کہ مرزا حسن علی محدث کو، اپنے باپ کو، مولانا اسماعیل شہید کو، اور فلاں فلاں علماء کو ان کی قبروں سے زندہ کر کے لاؤں، اور ان کو مولانا کی تقریر سنواؤں، اور ایک شعر سناؤں۔

ایں است کہ خوں خوردۂ ودل بردہ بسے را　　　بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

یہی وہ شخص ہے جس نے کتنوں کا دل چھین لیا ہے، اگر کسی کو تاب نظر ہو تو بسم اللہ آئے، اور دیکھے۔ (ارواح ثلاثہ۔ ص ۱۶۹)

☆☆☆☆☆☆

مصافحہ کیا اور مسلمان ہو گیا

عرصہ ہوا، مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے مجاز حضرت قاری حبیب احمد صاحب مرحوم کی خدمت میں الہ آباد ایک مرتبہ حاضری ہوئی، مجلس میں سیدنا شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کا تذکرہ آ گیا، حضرت قاری صاحب نے ارشاد فرمایا کہ:

راجپوت لڑکا:

ایک صاحب مغربی یوپی کے کسی مدرسہ کی سفارت کے لئے ہر سال الہ آباد آیا کرتے تھے، اور میرے پاس ہی ان کا قیام رہتا تھا، ایک بار وضو کرنے کے واسطے جب انہوں نے آستین سمیٹی تو ان کے ہاتھوں پر زخم کے متعدد نشانات نظر آئے، میں نے دریافت کیا کہ نشانات کیسے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ لمبی داستان ہے، اطمینان سے سناؤں گا، دوسرے وقت انہوں نے بیان کیا کہ میں پنجاب کا راجپوت زمیندار تھا، انگریزی دور میں جب زمینداری باقی تھی، میرے پاس زمینیں بہت تھیں، اور میں خود اپنی نگرانی میں کاشت کراتا تھا، گیہوں کی فصل جب تیار ہو جاتی، کوٹھیاں غلہ کے بوروں سے بھر جاتیں، اور انہیں فروخت کر کے اچھی خاصی دولت ہو جاتی، تو میں چند ہم مزاج دوست احباب کو ساتھ لے کر ہندوستان کے مشہور مقامات پر تفریح کے لئے نکل جاتا، ہر سال نئی نئی جگہیں جاتے، مہینہ بھر کی سیر کے بعد واپسی ہوتی۔

اسلامی جاذبیت:

ایک بار جی میں آیا کہ مسلمانوں کے مشہور مقامات دیکھنے چاہئیں، چنانچہ دو تین احباب کی رفاقت میں دلی، آگرہ وغیرہ کے لئے چل پڑا، سب جگہیں دیکھ کر ہم لوگ واپس ہو رہے تھے

کہ کسی نے کہا دیوبند میں مسلمانوں کا ایک بڑا مدرسہ ہے، ارادہ یہ ہوا کہ اسی سفر میں اسے بھی دیکھ لیں، چنانچہ دیوبند پہونچ گئے، تعلیم کا زمانہ تھا، ہر طرف چہل پہل تھی، طلبہ کتابیں لے کر ادھر سے ادھر درسگاہوں میں آجا رہے تھے، یہ منظر بھلا معلوم ہوا، ہم لوگ درسگاہوں کے پاس کھڑے ہو ہو کر درس کے مناظر بھی دیکھتے رہے، چلتے چلتے ایک ایسی درسگاہ کے سامنے پہونچے، جو نسبۃً بڑی تھی، اور طلبہ بھی زیادہ تھے، اور جو مولانا صاحب پڑھا رہے تھے، وہ بڑے شخص معلوم ہو رہے تھے، صورت عجیب پر کشش تھی، ہمارے قدم وہیں رک گئے، تھوڑی دیر کھڑے ہو کر درس سنتے رہے، پھر اندر جا کر بیٹھ گئے، سبق ختم ہوا تو مولانا صاحب اٹھ کر باہر آئے، بہت سے لڑکے ان سے مصافحہ کرنے لگے، میرے جی میں بھی بے اختیار آیا کہ ہاتھ ملا لوں، لیکن ہندو ہونے کی وجہ سے طبیعت ہچکچائی، مولانا صاحب کی کشش غالب آ گئی، سب طلبہ جب مصافحہ کر چکے تو میں نے بھی ہاتھ بڑھا دیا، اور ڈرتے ڈرتے مصافحہ کر لیا، مصافحہ جیسے کیا ویسے ہی دل میں ایک جوش اٹھا، اور بے ساختہ میں نے اس کا اظہار بھی کر دیا، کہ مولانا صاحب مجھے مسلمان کر لیجئے، اتنا سننا تھا کہ مولانا صاحب کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے، اور برجستہ وہیں زمین پر میرا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئے، ایک قدم بھی آگے نہ بڑھے، اور مجھے کلمہ پڑھا دیا، الحمد للہ علی احسانہ۔ یہ تھے شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہ دار العلوم کے صدر مدرس!

نئی زندگی:

کلمہ پڑھانے کے بعد مجھے اپنے گھر لائے، میرے ساتھی عجیب کشمکش میں پڑ گئے، میں نے انہیں کہہ سن کر رخصت کر دیا، اور خود حضرت کے پاس ٹھہر گیا، حضرت مدنی نے چند روز اپنے یہاں رکھ کر مظفر نگر کے ایک مدرسہ میں بھیج دیا، وہاں کے مہتمم کے نام ایک رقعہ لکھ دیا، انہوں نے میری بڑی عزت کی، اور میری تعلیم کا نظم کر دیا، میں قرآن شریف اور اردو کی تعلیم حاصل کرنے لگا، اسی دوران ایک مرتبہ میرے بھائیوں نے کسی حیلے سے مجھے گھر بلا لیا، میں چلا گیا، ان لوگوں نے مجھے مرتد ہو جانے کی ترغیب دی، میں نے انکار کر دیا، ادھر سے اصرار تھا، اور میری جانب سے انکار! بالآخر انہوں نے مجھے مارنا شروع کیا، پھر بھی میں اپنے انکار پر قائم رہا، تو انہوں نے چھری سے میرے تمام بدن کو قیمہ کر دیا، اور اٹھا کر میدان میں ایک گڑھے میں مردہ سمجھ کر پھینک دیا، مجھے

دیر کے بعد ہوش آیا، اور کسی طرح بھاگ کر مظفر نگر پہونچ گیا، حضرت مدنی نے میرا علاج کرایا، ایک مدت میں اچھا ہوا، تعلیم اس کے بعد چلتی رہی، قرآن شریف پڑھ لیا، اردو زبان سیکھ لی، اتنا علم حاصل ہو گیا کہ اب خود سے مسئلہ کی کتابیں پڑھنے اور سمجھنے لگا۔

فیضان رحمت:

مدرسہ کے مہتمم بہت خوشحال اور دین دار شخص تھے، ان کی ایک لڑکی نابینا حافظ قرآن تھی، اس کی شادی نہیں ہو رہی تھی، مہتمم صاحب فکر مند تھے، ایک بار وہ دیوبند گئے، حضرت سے عرض کیا کہ جس نومسلم کو آپ نے مدرسہ میں بھیجا ہے، اگر وہ آمادہ ہوں تو میری لڑکی سے ان کا نکاح کر دیں، لڑکی کا پورا خرچ زندگی بھر میں برداشت کروں گا، اور وہ بھی میری کفالت میں رہیں گے، حضرت نے فرمایا بہت اچھا، اور فوراً میرے نام ایک رقعہ لکھ کر ایک آدمی کو میرے پاس بھیجا کہ ابھی چلے آؤ، میں حاضر ہوا، میری تعلیم کی تفصیلات پوچھیں، میں نے سب عرض کر دیں، فرمایا ماشاء اللہ آپ نے ضرورت بھر پڑھ لیا، اب ایک کام کریں گے؟ میں نے کہا حضرت! میں تو آپ کا غلام ہوں، جو فرمائیں، میں حاضر ہوں، حضرت نے حافظ قرآن کی بہت سی فضیلتیں ارشاد فرمائیں، اور فرمایا کہ ان مہتمم صاحب کی ایک لڑکی حافظ قرآن ہے، مگر نابینا ہے، اگر آپ منظور کریں تو اس کے ساتھ آپ کا نکاح کر دیا جائے، میں نے عرض کیا حضرت مجھے کوئی عذر نہیں ہے، مجھے تو آپ کا ہر ارشاد دل وجان سے منظور ہے، بس کیا تھا، اسی مجلس میں حضرت نے عقد نکاح کر دیا۔

رشتے میں برکت:

اللہ تعالیٰ نے اس رشتہ میں ایسی برکت دی کہ اب میرے کئی لڑکے ہیں، اور سب حافظ قرآن، عالم دین اور دار العلوم دیوبند کے فاضل ہیں، بہت آرام سے گزر بسر ہوتی ہے، دین سے بھی حق تعالیٰ نے نوازا ہے، اور دنیا بھی خوب عطا کی ہے، مجھے سفارت کرنے کی ضرورت نہیں، صرف مدرسہ کی خدمت کے شوق میں یہ کام کرتا ہوں، اب غالباً ان صاحب کا انتقال ہو گیا ہے، رحمه الله رحمة واسعة۔

☆☆☆☆☆☆

رشیدین

جامعہ عربیہ اشرفیہ نیا بھوجپور بہار کی مشہور درسگاہ علم ہے، یہ ادارہ صوبہ بہار کے ان چند مستثنیٰ اداروں میں سے ہے، جو حکومتی امداد کے ’’زریں قفس‘‘ سے اب تک آزاد ہیں، حکومت بہار نے دینی تعلیم کی سرپرستی کا دام برنگ زمین بچھا کر بیشتر مدارس عربیہ پر مالی امداد کے دانے ڈال رکھے ہیں، اورارباب مدارس ان دانوں کی حرص میں جال کے اندر گرفتار ہوتے چلے جارہے ہیں، کچھ سر پھرے اور دیوانے اب بھی خال خال ایسے ملتے ہیں، جنھوں نے اپنے دامن کو حرص وہوس کی آلودگی سے بچائے رکھا ہے، انہیں دیوانوں میں سے جامعہ عربیہ اشرفیہ بھوجپور کے کارکن حضرات بھی ہیں۔

۴؍محرم ۱۴۰۵ھ کو شام کے وقت مدرسہ کے نائب مہتمم مولانا عبدالجلیل صاحب مدرسہ دینیہ غازیپور میں تشریف لائے، اس وقت یہ خاکسار مدرس تھا بعد نماز مغرب دریائے گنگا کے ساحل پر واقع مدرسہ دینیہ کی عمارت شوکت منزل کی بالائی چھت پر ایک مختصر مجلس میں مولانا نے دو بزرگوں حضرت مولانا عبدالرشید رانی ساگری، وحضرت مولانا عبدالرشید بھوجپوری رحمہما اللہ کے سبق آموز واقعات سنائے، جنہیں خاکسار نے دوسرے وقت قلمبند کرلیا، وہ ہدیۂ ناظرین ہے

جامعہ اشرفیہ نیا بھوجپور کے بانی حضرت مولانا عبدالرشید صاحب بھوجپوری تھے، مولانا، حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے مسترشد اور حضرت مولانا عبدالرشید صاحب رانی ساگری علیہ الرحمۃ کے تلمیذ رشید تھے۔

رشید اول:

حضرت مولانا عبدالرشید صاحب رانی ساگری حضرت مولانا محمد علی مونگیری قدس سرہ

کے خلفاء میں ایک امتیازی مقام کے مالک تھے، لیکن تواضع وفنائیت کے اس مقام پر فائز تھے کہ پہچاننا دشوار تھا، مولانا کا قیام ابتداءً کلٹی ضلع بردوان میں تھا، بعد میں رانی ساگر جو ضلع بھوجپور میں واقع ہے، تشریف لائے، تو ان کے شاگرد مولانا محمد اسحاق صاحب (والد محترم مولانا عبدالجلیل صاحب) نے عرض کی، حضرت! بھوجپور شہر یہاں سے قریب ہے، وہاں کے مسلمان جہالت و گمراہی میں غرق ہیں، چوری ڈکیتی بطور پیشہ کے کرتے ہیں، نماز روزہ اور دین داری سے کوسوں دور ہیں، علم دین کی روشنی نام کو بھی نہیں، ظلمتوں کے سایے بہت گہرے ہیں، اگر آپ توجہ فرمائیں تو مسلمانوں کی کچھ اصلاح ہو، مولانا اس وقت خاموش تو رہے، چار پانچ روز کے بعد تنہا اٹھے، اور بھوجپور جانے والے ایک یکہ پر سوار ہوئے، یکہ بان نے پوچھا کس بھوجپور جائیں گے، نئے یا پرانے؟ فرمایا بھائی میں یہ نہیں جانتا، جہاں مسلمان زیادہ آباد ہوں، وہاں لے چلو، اس نے نیا بھوجپور جامع مسجد کے پاس مولانا کو اتار دیا، ظہر کی نماز کا وقت ہوا تو تھوڑے سے نمازی آئے، ان میں سے کوئی مولانا کا شناسا نہ تھا، ان لوگوں نے مولوی صورت دیکھ کر مولانا کو امامت کے لئے آگے بڑھا دیا، نماز کے بعد کسی نے اپنی مقامی زبان میں کہا ''مولبی صاحب! لَیُکا پڑھبَ''، یعنی مولوی صاحب لڑکوں کو پڑھائیں گے، مولانا نے فرمایا کیوں نہیں، ضرور پڑھائیں گے، اس نے پھر کہا ''سن لا کھائے کے ملی، پیسہ نا ملی، ہوسکَ تو پڑھاوا'' (سن لیجئے! کھانے کو ملے گا، پیسہ نہیں ملے گا، اگر یہ صورت قبول ہو تو پڑھایئے) فرمایا کہ آدمی پیسہ کھانے ہی کے لئے لیتا ہے، جب کھانا مل جائے گا تو پیسہ کی کیا ضرورت؟۔

حکیمانہ انداز:

پھر مولانا وہیں مسجد میں رہ پڑے، پانچوں وقت کی نماز پڑھاتے، اور بچوں کو تعلیم دیتے، جب بچے اچھی طرح مانوس ہوگئے، تو ایک روز ان بچوں سے فرمایا:

بچو! یہ بتاؤ کہ کوئی غیر آدمی تم لوگوں کی ماؤں کا بال پکڑ کر گھسیٹے، تو تم لوگ کیا کروگے؟

بچوں نے بیک زبان کہا کہ ہم اس کو جان سے ماردیں گے۔

مولانا شاباشی دیتے ہوئے فرمایا، بچو! ایک بیٹے کو اپنی ماں سے ایسا ہی تعلق اور محبت ہونی چاہئے، لیکن بچو! یہ بتاؤ کہ تم لوگوں کی مائیں نماز نہیں پڑھتیں، مرنے کے بعد فرشتے اگر ان

کے بال پکڑ کر گھسیٹیں تو تم لوگ کیا کرسکو گے، اس کا بھی کچھ انتظام ہونا چاہئے کہ نہیں؟۔

مولانا کی یہ بات بجلی کی ایک رو تھی، جو سب بچوں میں آناً فاناً دوڑ گئی، ان کے سامنے ایک نیا موضوع آ گیا، بات جو دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی، دوسری طرف دلوں کی تہوں میں اتر گئی، بچوں نے اسی وقت جا کر اپنی ماؤں سے کہہ دیا کہ تم لوگ نمازیں پڑھو، اور اگر نہیں پڑھتیں تو ہم کھانا نہیں کھائیں گے، ماؤں کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی، شام کو مرد جب گھر آئے تو عورتوں نے کہا کہ:

''ببوا کھانا نا کھیلس پتا نا کا مولبی صاحب کہل باٹیں'' (یعنی بچے نے کھانا نہیں کھایا، معلوم نہیں مولوی صاحب نے کیا کہہ دیا) مرد مولانا کی خدمت میں پہونچے، اور دریافت کرنے لگے کہ آپ نے کیا کہہ دیا ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ میں نے نماز پڑھنے کے لئے کہا ہے، یہ نہیں کہا کہ کھانا چھوڑ دو، لیکن اصلاح کی ابتداء ہوگئی، بچوں کی محبت میں ماؤں نے نماز پڑھنی شروع کردی، پھر مرد متأثر ہوئے، مولانا کی حکیمانہ تلقین جاری رہی، دلوں کا لوہا گرم ہوتا، اور موقع کے مناسب مولانا چوٹ لگاتے رہتے، رفتہ رفتہ دین کے آثار پھیلنے لگے۔

خدا کی غیبی امداد:

بھوجپور میں غازیپور کے بدعتی پیروں کا پنجہ گڑا ہوا تھا، وہ آتے اور نذرو نیاز حاصل کرکے لے جاتے، اور جاہل مرید بدعت و جہالت کی تاریکی میں اور زیادہ ڈوب جاتے، ان پیروں نے مولانا کے اثرات محسوس کئے، انہوں نے محسوس کیا کہ علم دین کی شمع اب روشن ہو چلی ہے، ان لوگوں نے تاڑا کہ شاید کوئی وہابی آ گیا ہے، انہوں نے اپنے جاہل مریدوں کو ورغلایا، اور وہابی مشہور کرکے انہیں مولانا کا مخالف بنا دیا، اور اس مخالفت کی آگ کو اس حد تک ہوا دی کہ ایک جمعہ کو جاہلوں نے یہ طے کرلیا کہ آج مولانا کو جمعہ نہیں پڑھانے دینا ہے، اگر مولانا آج ممبر کی جانب بڑھے تو انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

اس بات کی خبر بھوجپور کے رئیس مولانا عبدالرشید بھوجپوری کے والد محترم عبدالغفور خان صاحب کو ہوئی، وہ سخت کشمکش میں مبتلا ہوئے، کہ وقت کم ہے کون سی تدبیر کی جائے کہ یہ جھگڑا فرو ہو، خان صاحب کو بروقت ایک تدبیر سوجھ گئی، ایک شخص کو پانچ سو روپئے (خیال کرلیجئے آج سے

نصف صدی پہلے کے پانچ سو روپے چاندی کے) دے کر داروغہ کے پاس بھیجا، اور اسے صورت حال کی اطلاع دی، داروغہ نے پوچھا خطبہ کی اذان کتنے بجے ہوتی ہے، جانے والے نے بتا کہ ایک بجے، داروغہ نے کہا جایئے میں دیکھ لوں گا، ادھر اہل بدعت کی فوج لاٹھی بلم اور تلواروں سے مسلح ہو کر آ گئی کہ آج فیصلہ کرنا ہے، ادھر داروغہ ٹھیک ۱۲ بج کر ۵۵ منٹ پر مسجد کا محاصرہ کر چکا تھا، اور جب ایک کا گھنٹہ بجا تو وہ مسجد کے اندر داخل ہو گیا، اس نے مسجد میں دیکھا کہ جا بجا ہتھیار رکھے ہوئے ہیں، پوچھا کہ مسجد میں ہتھیاروں کا کیا کام؟ یہ کہہ کر سب ہتھیار ضبط کر لئے، اور اعلان کر دیا کہ مولانا نماز پڑھائیں گے، اور اگر کسی نے ان کا بال بیکا کیا تو میں پورے بھوجپور کو پھونک دوں گا، اس اعلان کے سنتے ہی ہر طرف سناٹا چھا گیا، مولانا نے باطمینان نماز پڑھائی۔

سازگار حالات:

بعد میں عبدالغفور خان صاحب نے آپ سے عرض کیا کہ حضرت! آپ نائب رسول ہیں، اور یہ لوگ آپ کے درپے آزار ہیں، یہاں کسی اور صاحب کو بچوں کی تعلیم کے لئے رکھ دیں، اور آپ میرے گھر پر تشریف رکھیں، وہاں سے ارشاد وہدایت کا فریضہ انجام دیں، ان شاء اللہ آپ پر کوئی آنچ نہ آنے دوں گا، آپ کی حرمت وآبرو کے لئے اگر مجھے ساری دولت وثروت کی قربانی دینی پڑے گی تو بخوشی منظور ہے، اور اگر نوبت آ گئی تو میں بھوجپور سے پٹنہ تک آپ کے قدموں تلے روپئے بچھا دوں گا، مگر آپ کی حرمت ضائع نہ ہونے دوں گا۔

رشید ثانی:

چنانچہ مولانا نے اطمینان سے ارشاد وہدایت کا کام خان صاحب کے گھر رہ کر کرنا شروع کر دیا، مولانا کا حلقہ ارادت وسیع ہونے لگا، عبدالغفور خان صاحب کے صاحبزادے عبدالرشید اس وقت انگریزی تعلیم حاصل کرتے تھے، اب انہیں علی گڈھ بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے جانا تھا، تیاریاں ہو رہی تھیں، ایک دن مولانا نے فرمایا، خان صاحب! عبدالرشید کو اللہ کا بیرسٹر بنایئے، خان صاحب مولانا کے عقیدت مند تو تھے ہی، عرض کیا کہ بچہ آپ کا ہے، آپ کو اختیار ہے، جیسا فرمائیں، تعمیل ارشاد ہوگی، مولانا نے سب تیاریاں علی گڈھ کی منسوخ کرا دیں، اور سراپائے غرق انگلش کو عربی تعلیم کے ساحل پر کھڑا کر دیا، عربی شروع کرا دی گئی، پھر انہیں ساتھ

لے کر اپنے شاگرد مولانا محمد اسحاق صاحب کے پاس پہونچے، اور فرمایا، مولوی اسحاق! یہ لڑکا تمہارے سپرد ہے، اچھی طرح پڑھاؤ، چنانچہ مولانا محمد اسحاق صاحب نے پوری توجہ اور کوشش کے ساتھ پڑھانا شروع کردیا، اور صاحبزادے عبدالرشید اسی لگن اور جدوجہد کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول ہوگئے۔

مولانا عبدالرشید صاحب ایک رئیس گھرانے کے فرد تھے، زمانہ طالب علمی میں ہر وقت مدرسہ کے دروازے پر ذاتی سواری کھڑی رہتی تھی، صبح کو کپڑے کا جو جوڑا زیب تن ہوتا، شام کو وہ اتر جاتا، اور اس کی جگہ دوسرا لباس آجاتا، تاہم تعلیم میں بہت محنت کرتے، مولانا محمد اسحاق صاحب فرماتے کہ عبدالرشید رہتا تو رئیسانہ ٹھاٹ سے ہے مگر پڑھنے کا بھی حق خوب ادا کرتا ہے۔

دستار نیابت

تعلیم آہستہ آہستہ آگے قدم بڑھاتی رہی، آخر وہ وقت آیا کہ رسمی طور سے آپ فارغ التحصیل ہوگئے، دستار بندی کے لئے صوبہ بہار کے نامور عالم دین ومجاہد ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد صاحب تشریف لائے، دستار باندھتے وقت فرمایا کہ میاں عبدالرشید! یہ دستار فضیلت نہیں دستار نیابت ہے، اس کی لاج رکھنا، نہ جانے ان الفاظ میں کون سی آگ تھی، جس نے رئیس صاحبزادہ عبدالرشید کے سارے رئیسانہ ٹھاٹ کو جلا کر خاکستر بنادیا، اور اس آگ ہی سے مولانا عبدالرشید کندن بن کر نمودار ہوئے۔

نیا بھوجپور کچھ اپنی اور کچھ والدہ کی رقم لے کر ایک عربی مدرسہ کی بنیاد ڈالی، بعد میں اور لوگ بھی اس کے تعاون کے لئے آگے بڑھے، اس طرح جامعہ اشرفیہ قائم ہوا، مولانا کو مکاتب و مدارس قائم کرنے کا عجب ذوق تھا، جگہ جگہ جامعہ اشرفیہ کی شاخیں کھولیں، فرماتے تھ کہ جی یہ چاہتا ہے کہ تین سو ساٹھ مدرسے کھل جائیں، تاکہ سال کا ہر وز ایک مدرسہ میں گذرے، اور اسی میں دم نکل جائے۔

مرد مؤمن کی آخری سانسیں:

ایک بار ایک جگہ سے دوسری جگہ تبلیغ وہدایت کے پروگرام کے تحت تشریف لے جارہے تھے، ساتھ میں اور رفقاء بھی تھے، سائیکل سے سفر ہورہا تھا، راستہ میں فم معدہ میں درد ہوا، یہ

درد مولانا کو کبھی کبھی ہوا کرتا تھا، سائیکل سے اتر گئے، ہم سفر رفقاء نے سمجھا کہ استنجاء کی ضرورت ہوگی، اس لئے اترے ہیں، پیچھے مڑ کر دیکھا تو مولانا زمین پر لیٹے ہوئے ہیں، لوگ گھبرا گئے، فرمایا کہ درد ہو رہا ہے، اب میں سائیکل سے چلنے کے قابل نہیں، بیل گاڑی کا انتظام کرو، اور جہاں کا پروگرام ہے وہاں کہلوا دو کہ ارادہ منسوخ، مجھے بھوجپور لے چلو، چنانچہ بیل گاڑی پر چلے، کچھ دیر خاموش چلتے رہے، تھوڑے وقفہ کے بعد دو یا تین بار بآواز بلند' اللہ اللہ' کہا اور خاموش ہو گئے، ساتھیوں نے سمجھا کہ آرام ہو گیا ہے، نیند آ گئی، ایک گاؤں میں پہونچ کر آرام کی غرض سے اتارنا چاہا تو جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا، لوگ متحیر تھے، ایک حکیم صاحب بلوائے گئے، انہوں نے دیکھتے ہی بھرائی آواز میں کہا اب کیا ہو سکتا ہے؟ مولانا ہم لوگوں کو چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون

جسد بے جان بھوجپور لایا، اور وہیں تدفین ہوئی، مولانا کی عمر اس وقت کل ۴۸/سال کے قریب تھی، اس تھوڑی سی مدت میں مولانا نے بڑا کام انجام دیا۔

اللہ کا بیرسٹر:

کسی جلسہ میں غالبًا کوچس یا کواتھ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی تشریف لائے تھے، مولانا عبدالحمید صاحب اعظمی نے عرض کیا کہ مولوی عبدالرشید جمعیۃ علماء کا کام تندہی کے ساتھ نہیں کرتے، حضرت مدنی نے اپنے مخصوص لہجہ میں فرمایا، کہ آپ ان کی شکایت کرتے ہیں، یہ تو اللہ کے بیرسٹر ہیں، حضرت رانی ساگری کی زبان سے جو جملہ ابتدا میں نکلا تھا، حضرت مدنی کی زبان سے آخر میں اس کی تصدیق ہوگئی، سبحان اللہ! بڑوں کی بڑی باتیں۔

☆☆☆☆☆☆

ازمثنوی مولانائے روم رح

مرشد رومی کی خدمت میں

۵ / ۱ / ۱۴۰۸ھ

ادب:

آج مرشد رومی کی مجلس عالی میں رسائی نصیب ہوئی، مولانا ایک بادشاہ کا واقعہ سنارہے تھے، جو کسی کنیز پر عاشق ہو گیا تھا، پھر وہ باندی سخت بیمار ہوئی، اطباء نے ہر چند علاج ومعالجہ کیا، مگر کوئی دوااس کے لئے وجہ شفا نہ بن سکی، بادشاہ سخت آزردہ وغمگین تھا، آخرش اس نے بارگاہ الٰہی میں بغایت تضرع وزاری دعا کی، اسے خواب میں بتایا گیا کہ صبح ایک مرد حق آئے گا، اس کے ہاتھ میں باندی کا علاج ہے، بادشاہ صبح جھروکے پر بیٹھا منتظر تھا، ناگاہ ایک بزرگ صورت نورانی چہرہ، مرد خدا آتا ہوا نظر آیا، مولانا فرماتے ہیں کہ بادشاہ نے ازراہ تواضع وادب کسی خادم ودربان کو استقبال کے لئے نہیں بھیجا، بلکہ اپنی تمام جاہ وحشمت سے قطع نظر خود ہی دوڑ پڑا، مولانا کو اس کی یہ تواضع، یہ اشتیاق، اورادب واحترام کی یہ ادا اس درجہ پسند آئی کہ مولانا کو وجد آ گیا، اور غایت کیفیت میں فرماتے ہیں:

از خدا جوئیم توفیق ادب　　　بے ادب محروم گشت از فضل رب

بے ادبی:

ہم خدا سے ادب کی توفیق مانگتے ہیں، کیونکہ بے ادب آدمی حق تعالیٰ کے فضل وکرم سے محروم رہ جاتا ہے، بے ادبی انسان کو ہر خیر سے محروم کردیتی ہے، بے ادبی کے باعث ہاتھ میں آئی ہوئی نعمت بھی چھن جاتی ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر مولانا کا ارشاد ہے:

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد　　　بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

بے ادبی کرنے والا صرف اپنے ہی کو برباد نہیں کرتا، بلکہ وہ اس کی وجہ سے ساری دنیا

میں آگ لگا دیتا ہے، اگر بے ادبی کا اثر اس کی ذات تک محدود ہوتا تو پھر غنیمت تھا، مگر وہ تو نہ جانے کتنے لوگوں کی محرومی وہلاکت کا باعث بنتا ہے، مولانا اس بات کو مثال سے سمجھاتے ہیں، کہ دیکھو:

مائدہ ازآسماں در می رسید بے شراء و بیع و بے گفت وشنید
درمیان قوم موسیٰ چند کس بے ادب گفتند کو سیر وعدس
منقطع شد خوان و ناں از آسماں ماند رنج زرع و بیل و داسماں

گستاخ قوم:

بنی اسرائیل پر بے محنت ومشقت اور بے دام ودرم من وسلویٰ نازل ہوتا تھا، لیکن چند لوگوں نے بے ادبی اور گستاخی کی، اور لگے فرمائش کرنے، کہ لہسن اور مسور ہمیں چاہئے، اس گستاخی کی سزا یہ ملی کہ من وسلویٰ کا سلسلہ بند ہوگیا، اور پھر کھیتی باڑی کی کوہ کنی باقی رہ گئی، یہ سلسلہ عرصۂ دراز تک بند رہا، دنیا من وسلویٰ کی نعمت سے محروم رہی، عرصۂ دراز کے بعد:

باز عیسیٰ چوں شفاعت کرد حق خواں فرستاد و غنیمت بر طبق
مائدہ از آسماں شد عاہدہ چونکہ گفت انزل علینا مائدہ
باز گستاخاں ادب بگذاشتند چوں گدایاں زلہ ہا برداشتند
کرد عیسیٰ لا بہ ایشاں را کہ ایں دائم است وگم نہ گردد اززمیں
بدگمانی کردن و حرص آوری کفر باشد پیش خوان مہتری
زاں گدا رویان نادیدہ زار آں در رحمت برایشاں شد فراز

نبی کی برکت:

عیسیٰ علیہ السلام کی دعا وسفارش سے پھر آسمان سے خوان اترنے کی ابتداء ہوئی، لیکن یہاں بھی گستاخ اپنی بے ادبی سے باز نہ آئے، گداگروں کی طرح ٹکڑے بچا بچا کر رکھنے لگے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی بہت خوشامد کی کہ یہ دسترخوان دائمی ہے، کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے، اس لئے اسے بچا بچا کر نہ رکھو، شاہی دسترخوان پر حرص وطمع اور بدگمانی کرنا سخت بے ادبی ہے، مگر وہ باز نہ آئے، تو ان گداگروں کی گستاخی کی وجہ سے رحمت کا دروازہ پھر بند ہوگیا۔

نان وخواں از آسماں شد منقطع بعد ازاں زاں خواں نشد کس منتفع

گستاخی کے نتائج:

اب ہمیشہ کے لئے آسمانی دسترخوان سمیٹ دیا گیا، چنانچہ اس واقعہ کے بعد آسمان سے نازل ہونے والا کھانا کسی کو نصیب نہ ہوسکا، یہ نحوست اور محرومی کیوں ہے؟ کیا اس کی وجہ بے ادبی اور گستاخی کے علاوہ اور بھی کچھ ہے؟ مولانا اتنے ہی پر بس نہیں کرتے، گستاخی اور شوخ چشمی کے نتائج بد سے ڈراتے ہوئے مثالوں میں اور بھی عموم پیدا کرتے ہیں کہ چند لوگوں کی ناکردنی کی وجہ سے دنیا کس طرح گرفتارِ بلا ہوتی ہے، فرماتے ہیں:

ابر ناید از پے منع زکوٰۃ وز زنا افتد وبا اند جہات

ہر چہ آید بر تو از ظلمات غم آں بہ بے باکی وگستاخی ست ہم

ہر کہ بے باکی کند در راہ دوست رہزن مرداں شد ونامرد او ست

بد ز گستاخی کسوف آفتاب شد عزازیلے ز جرأت رد باب

لوگ جب زکوٰۃ کی ادائیگی میں بخل کرتے ہیں، تو بادل برسنا چھوڑ دیتا ہے، اور قحط پڑجاتا ہے، زنا کی کثرت ہوتی ہے تو ہر طرف وبائیں پھوٹ پڑتی ہیں، تمہارے اوپر غم واندوہ کی جو بدلیاں چھاتی ہیں، وہ بھی سمجھ لو کہ گستاخی اور بے باکی کا نتیجہ ہے، خدا کی راہ میں جو شخص بے باکی اختیار کرتا ہے، وہ خود تو نامرد ہے، لیکن بے شمار مردوں کی ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے، آفتاب تو تم دیکھتے ہو کہ اس میں گرہن لگتا ہے، جانتے بھی ہو ایسا کیوں ہوتا ہے، گستاخ اور بے باک لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے، دیکھو شرارت زمین پر ہوئی، اور اس کے اثرات آسمان تک جا پہونچے، یہ جرأت بے جا ہی کا انجام بد ہے کہ عزازیل (ابلیس) ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہوگیا، ورنہ آدم کو سجدہ کرنے کا جو حکم الٰہی ہوا تھا، اسے مان لیتا، اور گستاخانہ سوال وجواب نہ کرتا، تو کیوں معتوب ٹھہرتا؟۔

ازادب پرنور گشت است ایں فلک وازادب معصوم وپاک آمد ملک

ادب کا انعام:

آسمان نے ادب کا وطیرہ اختیار کیا کہ فرمان الٰہی کے سامنے ہمیشہ جھکا رہا، تو آفتاب و

ماہتاب کے قمقمے عطا ہوئے، تا کہ وہ روشن رہے، اور ادب ہی کا اثر ہے کہ فرشتہ کو معصوم اور پاکیزہ بنا دیا گیا۔

اس تلقین کے بعد مولانا پھر واقعہ بیان کرنے میں مشغول ہو گئے، مگر تلقین ادب کس قدر موثر، دلچسپ اور دل پر دستک دینے والی ہے۔ **قدس سرہٗ**

☆☆☆☆☆☆

نمونے کے انسان

(بزرگان دین کے واقعات وحکایات کا مجموعہ)

[حصہ دوم]

از

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ (م: ۲۸ر ستمبر ۲۰۱۳ء)
(بانی: مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ، ضلع مئو یوپی)

ترتیب
محمد عرفات اعظمی

فہرست (حصہ دوم)

’’حیات مصلح الامت‘‘ سے ماخوذ واقعات

حضرت مولانا عیسی صاحب نوراللہ مرقدہ کے واقعات

حضرت مولانا قاری صدیق صاحب نوراللہ مرقدہ کے واقعات

حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی نوراللہ مرقدہ کے واقعات

''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' سے متفرق واقعات

’’مدارس اسلامیہ۔مشورے وگزارشیں‘‘ سے ماخوذ واقعات

’’تذکرہ شیخ ہالیجوی‘‘ سے ماخوذ واقعات

''حضرت چاندشاہ صاحب اوران کا خانوادہ تصوف'' سے ماخود واقعات

''ذکر جامی'' سے ماخوذ واقعات

''حکایت ہستی'' سے ماخوذ واقعات

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نور اللہ مرقدہ کے واقعات

بروایت دیگراں

”حیات مصلح الامت“ سے ماخوذ
عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ کے واقعات

احتیاط وتقوی:

حضرت فرماتے تھے کہ:

”زمانۂ قیامِ دیوبند میں جب میرا تعلق حضرت تھانوی سے ہوا، اور حضرت کی جانب سے مجھ پر جو شفقت ہوئی، اس کا حال لوگوں کو معلوم ہوا، اور حضرت مولانا مدرسہ کے سرپرست بھی تھے، اس لئے اکثر مدرسہ کے کاغذات لے کر تھانہ بھون کوئی شخص جاتا تھا اور حضرت کی رائے لیکر یا دستخط کرا کے واپس ہوتا تھا، تو اس تعلق کے بعد حضرت مہتمم صاحب نے یہ خدمت میرے سپرد کردی، چنانچہ جب کوئی ضرورت پیش آتی تو مجھے بلا کر فرماتے کہ مولوی صاحب! تھانہ بھون جاؤ گے؟ یہاں اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں، آستانۂ شیخ کی حاضری ہو اور نہ صرف حکم بلکہ مصارف سفر بھی ملیں تو بھلا اس موقع کو میں کب چھوڑتا، عرض کرتا کہ حضرت ضرور جاؤں گا، پھر حضرت مہتمم صاحب مدرسہ کے کاغذات مرحمت فرما دیتے، اور اس سلسلے میں کچھ ہدایات فرماتے، سب کو سمجھ کر حضرت مولانا سے عرض کرتا اور کام مکمل کر کے واپس آجاتا۔

ایک مرتبہ حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ نے کاغذات دیکر فرمایا کہ مولوی صاحب اس دفعہ تو آپ ہی کو تھانہ بھون جانا ہے، چنانچہ کرایہ اور زادِ راہ کے لئے کچھ رقم مرحمت فرمادی، جب تھانہ بھون پہونچا اور حضرت سے ملا تو حضرت نے فرمایا کہ آپ کا کھانا میرے گھر سے آئے گا، میں نے عرض کیا حضرت! مہتمم صاحب نے مجھے پیسہ دیا ہے، خانقاہ سے کھالوں گا حضرت زحمت نہ فرمائیں، فرمایا کہ نہیں پیسے رکھئے، پھر کام آئیں گے، کھانا میرے ہی یہاں سے آئے گا، چنانچہ

میں کام ختم کر کے دیوبند واپس آیا اور کاغذات کے ساتھ ساتھ پیسے بھی واپس کئے ،فرمایا یہ کیسے؟ اس پر میں نے صورت حال بتائی کہ کھانے میں خرچ ہوا ہی نہیں ۔فرمایا اجی تم ہی ایسے شخص ہو کہ اس طرح سے آمد وخرچ کا حساب دیتے ہو، ورنہ تو کسی نے بھی اب تک ایسا نہیں کیا، اچھا خیر خرچ نہیں ہوا، نہ سہی، اب یہ رقم تم ہی رکھ لو، حضرت فرماتے قہر درویش بر جانِ درویش **الامر فوق الادب** ،اس وقت ادباً کچھ نہ کہہ سکا، پیسے رکھ لئے ۔فرماتے تھے کہ الحمدللہ حضرت مولانا تھانوی کو بھی مجھ سے تعلق تھا اور مجھ پر اعتماد واعتبار بھی تھا، چنانچہ حضرت مولانا بھی اپنی خصوصی تحریر اور مخصوص خطوط دیوبند میرے ہی ذریعہ سے بھیجتے تھے۔

مادرزادولی:

قیامِ دیوبند کے عرصہ میں ایک واقعہ پیش آیا، وہ یہ کہ حضرت کے حجرے کے سامنے احاطۂ مولسری میں ایک کنواں تھا، جو آج بھی ہے۔ایک مرتبہ جماعت کھڑی ہو چکی تھی ،حضرت کو وضو کے لئے پانی کی ضرورت تھی ،بعض لوگوں نے دیکھا کہ حضرت کنویں کے پاس تشریف لے گئے اور لوٹے کو ہاتھ سے کنویں میں ڈالا اور پانی بھر کر نکال لیا، حالانکہ کنواں گہرا ہے، عام طور سے رسی ڈول کے ذریعہ پانی نکالا جاتا ہے۔اس واقعہ کی تصدیق آپ کے رفیق درس مولانا حکیم سیّد محفوظ علی صاحب برادر نسبتی علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے بے تکلفی کے ان الفاظ میں کی ہے کہ:

''ہاں بھائی ! مولوی وصی اللہ کا کیا کہنا ، وہ تو مادرزاد ولی تھا ، چنانچہ کبھی کبھی احاطۂ مولسری کے کنویں سے یونہی ہاتھ ڈال کر پانی نکال لیتا تھا، ہم لوگ اس کو جانتے تھے۔ انتہی بلفظہ

بے نظیر ایثار:

مولانا بشیر احمد صاحب غالب پوری جب دیوبند تشریف لے گئے تو چونکہ شرح جامی کے معیار کی تعلیم نہیں ہوئی تھی ،اس لئے مدرسہ میں داخلہ نہ ہو سکا، اتفاقاً گھر واپس ہونے کے لئے کرایہ بھی نہیں تھا، اس لئے بڑی الجھن میں پھنس گئے، اعظم گڈھ کے دوسرے طلبہ کی زبانی مولانا بشیر احمد صاحب کی پریشان حالی کی اطلاع ہوئی، تو انھیں اپنے حجرہ میں بلایا اور تسکین اور حوصلہ افزائی کے بعد فرمایا کہ کھانے کی طرف سے آپ بالکل بے فکر رہیں، میرا دوپہر کا پورا کھانا اور شام کا آدھا آپ کو مل جایا کرے گا، آپ ایک سال کے اندر اپنی علمی کمزوری کو دور کریں، چنانچہ حسب

وعدہ مکمل ایک سال تک آپ نے ایک وقت کے نصف کھانے پر اکتفا کر کے دوسرے کی مدد کی۔ ایثار وقربانی کے اس سے اہم اور بڑے واقعات پیش کئے جاسکتے ہیں، لیکن جس دور میں مولانا نے یہ قربانی پیش کی ہے شاید اس عہد کی قربانیوں میں اس کی مثال نہیں دی جاسکے گی۔

عجیب واقعہ:

ایک عجیب واقعہ مولوی محمد صاحب نے سنایا، وہ یہ کہ ایک بار بہت سخت قحط پڑا تھا، برسات کا موسم گذرتا جارہا تھا، مگر بارش کا ایک قطرہ زمین پر نہیں آیا، خلق خدا پریشان تھی، تین دن تک نمازِ استسقاء پڑھی گئی، دعائیں کی گئیں، دودن حضرت والا نے دعاء کی اور نماز استقساء پڑھائی، اور ایک دن حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوری نے، مگر بارش نہیں ہوئی، بعض ناخداترس رضا خانی جماعت کے افراد نے طنز وطعنہ شروع کیا کہ دیوبندیوں نے تین دن تک سر پٹکا مگر بارش نہیں ہوئی، اس سے لوگوں کو بہت ایذاء ہوئی۔ ایک دن حضرت والا اپنی مسجد میں حجرے کی طرف منہ کئے بیٹھے تھے، محلّہ کے چند افراد اور موجود تھے، قاری سمیع اللہ صاحب نے عرض کیا کہ:

مولانا صاحب! ایک بات کہنی ہے، حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

کہئے! انھوں نے کہا۔

ڈر معلوم ہوتا ہے، فرمایا۔

ڈر کی کیا بات ہے؟ کہئے! کہنے لگے۔

تین دن ہم لوگوں نے دعا مانگی، مگر بارش نہیں ہوئی، بریلوی لوگ طعنہ دے رہے ہیں، اتنا سننا تھا کہ حضرت نے خاموش ہوکر گردن جھکا لی اور تقریباً دس منٹ تک جھکائے بیٹھے رہے، معلوم نہیں اپنے کریم پروردگار سے کیا مناجات اور عرض ونیاز کی، دس منٹ کے بعد جو سر اٹھایا تو کسی کو نگاہ ملانے کی تاب نہ تھی، آنکھیں بالکل سرخ تھیں، تمام لوگ ہیبت زدہ ہوگئے، قاری سمیع اللہ صاحب متأسف ہوئے کہ میں نے کیوں سنادیا؟ دوتین منٹ کے بعد جب اس کیفیت سے افاقہ ہوا تو فرمایا:

”حافظ صاحب! اگر آسمان سے ایک قطرہ بارش کا نہ گرے اور اللہ تعالیٰ امرتی (ایک

طرح کی مٹھائی) کھانے کو دیں تو کیا حرج ہے'' یہی جملہ بار بار دہرایا، اس وقت تو لوگوں کو کچھ محسوس نہ ہوا، مگر چند ہی روز کے بعد حضرت کے اس جملہ کا مطلب سمجھ میں آنے لگا، کاروبار جو بالکل ٹھپ تھا، کھلا، اور ایسا کھلا کہ گھروں میں دولت پانی کی طرح بہنے لگی۔ کپڑے کے جن تھانوں میں ساٹھ ستر روپئے کی بچت ہوتی تھی، ان میں پانچ پانچ سو کی بچت ہونے لگی، یہ حال تین سال تک قائم رہا۔ گویا تین دن کی دعاؤں کی قبولیت کا ظہور تین سال قائم رہا، پھر کاروبار حسب معمول آ گیا۔

مرشد کا پیغام اور مولانا کی صاف گوئی:

''زمانۂ قیام تھانہ بھون میں جب ہمارے حضرت کو خلافت ملی تو اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد وہاں ایک صاحب تھے جو غالباً حضرت حکیم الامت کے قریبی عزیز بھی ہوتے تھے، ان کی یہ خواہش ہوئی کہ اپنی صاحبزادی کی نسبت ہمارے حضرت سے کر دیں، اگر چہ دنیوی رسم ورواج کے مطابق ان کا خاندان اور حضرت کا خاندان الگ الگ تھا، لیکن انھوں نے حضرت والا کی دینداری اور تقویٰ کی وجہ سے اس پہلو سے صرف نظر کر کے خواجہ عزیز الحسن صاحب سے عرض کیا کہ وہ اس مسئلہ میں کچھ سلسلۂ جنبانی فرمائیں، خواجہ صاحب نے مشورہ دیا کہ آپ خود اس خیال کو مولوی وصی اللہ صاحب سے براہ راست ظاہر کر دیجئے، اور اگر یہ آپ کے نزدیک مناسب نہ ہو تو پھر حضرت اقدس کو واسطہ بنائیے، چونکہ یہ خواہش ان کے دل میں گھر کر چکی تھی اس لئے حضرت تھانوی سے انھوں نے ہمت کر کے اپنا مدعا عرض کر ہی دیا، اور ساتھ ہی یہ بات بھی بتادی کہ سارا خرچ اپنی لڑکی کا اپنے ہی ذمہ رکھوں گا جب تک مولوی صاحب کہیں برسر روزگار نہ ہو جائیں، ان پر اس کا کچھ بار نہ ہوگا۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ آپ کی خاطر سے میں ان سے کہہ تو سکتا ہوں، لیکن میرے نزدیک مناسب یہی ہے کہ آپ خود گفتگو کر لیں، میرا اور ان کا تعلق آپ کو معلوم ہے، ایسا نہ ہو کہ میرے مشورہ کو وہ حکم کا درجہ دے کر اپنی رائے ختم کر دیں، اور نکاح مجبوراً انھیں کرنا پڑے، تاہم وہ صاحب اسی پر مصر رہے کہ حضرت فرمادیں۔

حضرت مولانا تھانویؒ نے ایک دن حضرت کو بلا کر فرمایا کہ میں اس وقت آپ کو صرف ایک صاحب کا پیغام پہونچانا چاہتا ہوں، جو نہ تو میرا حکم ہے اور نہ اس پر آپ مجبور ہیں، میں صرف

ایک واسطہ ہوں، قبول عدم قبول کا آپ کو پورا اختیار ہے، اور آپ کے اطمینان کے لئے یہ بھی کہتا ہوں کہ آپ اگر اس بات کو رَد کردیں گے تو مجھے ذرہ برابر ناگواری نہ ہوگی۔ اس کے بعد ان صاحب کی خواہش کا اظہار فرمایا، ہمارے حضرت نے ذرا تامل کے بعد عرض کیا کہ ابھی تو میرا ارادہ نکاح کا ہے ہی نہیں، اور اگر ہوگا تو میری والدہ موجود ہیں، ان کے مشورہ سے کروں گا، اور اپنے ہی خاندان میں کروں گا۔

حضرت نے فرمایا جزاک اللہ آپ کی اس صاف گوئی سے طبیعت بہت خوش ہوئی۔

یہ ملنگ لوگ..........:

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے ۱۹۴۹ء میں دوسری بار جب فتح پور کے قصد سے سفر کیا ہے، اس وقت مئو سے کوپا گنج تک یکے چلتے تھے، مولانا موصوف یکے سے تشریف لے جارہے تھے، یکے والے سے مولانا نے فرمایا کہ اگر کوپا گنج سے آگے فتح پور کے راستے میں جہاں تک یکہ جاسکتا ہے پہنچادو، تو جوکرایہ تم مانگو گے خوشی سے دوں گا اور تمہارا احسان بھی مانوں گا، اس یکہ پر ایک نوجوان تعلیم یافتہ ہندو بھی تھا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ فتح پور کس کے پاس جائیں گے؟ میں نے کہا وہاں ہمارے ایک بزرگ رہتے ہیں، میں بس ان سے ملنے جارہا ہوں، اس نے کہا اچھا وہ جو فتح پور کے شاہ صاحب ہیں، آپ ان کے درشن کرنے جارہے ہیں، میں نے کہا ہاں میں ان کے درشن کرنے جارہا ہوں، میں نے اس نوجوان سے پوچھا آپ ان کو جانتے ہیں؟ اس نے کہا میں نے بس ان کا نام سنا ہے، مجھے بھی ان کے درشن کرنے کا بہت شوق ہے، میں نے کہا آپ کو ان کے درشن کرنے کا کیوں شوق ہے؟ اس نے کہا میں کانپور کا رہنے والا ہوں، میرے ہاں رنگ کا بیوپار ہوتا ہے، میں اس سلسلے میں ملک بھر میں گھومتا پھرتا ہوں، ہزاروں ہندوؤں، مسلمانوں سے میرا واسطہ پڑتا ہے، یہاں کوپا میں ہمارے ایک بیوپاری حاجی صاحب ہیں، وہ بڑے ایمان دار، سچے اور دھرمی آدمی ہیں، مہاتما ہیں، ایسا آدمی میں نے کہیں نہیں دیکھا، نہ ہندوؤں میں نہ مسلمانوں میں۔ میں نے ان سے ایک دفعہ پوچھا تھا کہ تم میں ایسی سچائی اور ایمان داری کہاں سے آئی؟ تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ مجھ میں تو کوئی اچھائی نہیں ہے، میں تو بہت گندہ آدمی ہوں، ہاں ہمارے یہاں سے قریب ہی

فتح پورتال نرجا ایک گاؤں ہے، اس میں ایک بزرگ ہمارے مولانا صاحب ہیں، میں ان کے پاس آتا جاتا ہوں، اگر تمہیں میرے اندر کچھ اچھائی نظر آتی ہے تو ان کا اثر ہوگا، اور بھی کئی آدمیوں سے میں نے ان مولانا صاحب شاہ صاحب کا ذکر سنا ہے، اس لئے مجھے بھی ان کے درشن کرنے کا شوق ہے، اس نوجوان نے اپنی یہ بات ختم کرتے ہوئے بڑے جوش سے کہا کہ میرا تو ایمان دھرم ہے کہ میرے ملک کا بگاڑ جب ہی ٹھیک ہوگا جب یہ ملنگ (یعنی درویش لوگ) ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیں گے۔

گلستاں بوستاں کا سبق:

جن دنوں حضرت والا کا قیام وطن کے بعد گورکھپور میں تھا، تو وہاں 'میاں صاحب مسلم انٹر کالج گورکھپور' کے ایک اردو فارسی کے مدرس مولوی شکیل احمد صاحب عباسی بھی حضرت والا کی مجلس میں تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے خود حضرت والا سے اپنا واقعہ عرض کیا کہ کل جب میں یہاں سے حضرت کی مجلس سے واپس گھر جارہا تھا تو راستہ میں ایک دوست ملے، انھوں نے پوچھا مولوی صاحب اس وقت کہاں سے تشریف لارہے ہیں؟ میں نے برجستہ کہا کہ گلستاں بوستاں کا سبق پڑھ کر آرہا ہوں، دیکھا کہ اس جملہ کو انھوں نے بہت تعجب کے ساتھ سنا، کہنے لگے کہ آپ نے تو نہ جانے کتنوں کو گلستاں بوستاں پڑھا دیا ہوگا، یہ آپ کیا فرمارہے ہیں کہ میں اس کا سبق پڑھ کر آرہا ہوں؟ میں نے جب ان کو متحیر دیکھا تو خود ہی اپنے قول کی شرح کی اور کہا کہ بھائی میرے! میں اس وقت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کی مجلس سے آرہا ہوں، اور حضرت نے تمام مجلس گلستاں بوستاں ہی سنائی ہے، اور اس سلسلے میں ایسی ایسی باتیں بتائی ہیں کہ کیا کہنا، سبحان اللہ میں نے اس سے قبل اس انداز سے اس کا مطلب کسی سے نہیں سنا تھا، حضرت سے سننے کے بعد میں نے سمجھا کہ جواب تک اس کو پڑھا پڑھایا تھا وہ کچھ نہیں تھا، دراصل گلستاں بوستاں ان حضرات سے پڑھنے کی کتاب ہے، اور بڑوں کے پڑھنے کی کتاب ہے۔ ہم لوگوں نے جو بچوں کے حوالے کردیا، حق یہ ہے کہ شیخ سعدی پر ظلم ہے۔ اسی کو میں نے کہہ دیا ہے کہ گلستاں بوستاں پڑھ کر آرہا ہوں۔

غیر معمولی بات:

حضرت مولانا، حکیم حفیظ اللہ صاحب کی دکان پر تشریف رکھتے تھے، حکیم صاحب پان کھاتے تھے، حضرت کو بھی پان پیش کیا، حضرت والا پان نہیں کھاتے تھے، ان کی خاطر سے کھالیا اور اندر بیٹھے بیٹھے اس کی پیک جو منہ سے باہر پھینکی تو راستہ میں ایک غیر مسلم جو اس وقت وہاں سے گذر رہا تھا اس پر پڑ گئی، وہ قوم کا شاید چمار تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت والا فوراً باہر نکلے اور اس کو روک کر اس سے معذرت کی اور معافی مانگی ۔ یہ وہ دور تھا کہ یہ رعایا لوگ تھے، میاں لوگوں کا بڑا احترام کرتے تھے، اور ان سے بہت ڈرتے تھے، حضرت مولانا کا معافی مانگنا اس کو بہت عجیب سا معلوم ہوا، اس نے کہا نہیں مولانا صاحب! کوئی بات نہیں ہے، میں خود معافی مانگتا ہوں، فرمایا نہیں زبان سے کہہ دو کہ میں نے معاف کیا، غرض اس سے کہلوالیا تب سکون ہوا، اور اس کے بعد سے پھر حضرت والا نے پان بالکل ترک فرمادیا۔

لعاب دہن کی برکت:

ایک دن گھر میں والدہ مکرمہ صبح کو اٹھیں، وضو کرنے کے لئے لوٹے میں پانی لیا اور مسواک اٹھا کر منہ میں ڈالی ہی تھی کہ ایک بھڑ نے جو شاید مسواک پر بیٹھی ہوئی تھی، زبان پر ڈنک ماردیا، والدہ مکرمہ پریشان ہوکر بلبلا اٹھیں، تھوڑی دیر میں پوری زبان ورم آلود ہوکر منہ سے باہر لٹک آئی، والدہ کی اس تکلیف کی خبر حضرت کو ہوئی تو بے چین ہوگئے۔ حافظ عبدالمنان صاحب کو بلایا اور کچھ پڑھ کر اپنا لعابِ دہن ان کی انگلی پر لگا دیا، اور کچھ ان کے کان میں فرمایا، اور رفیع اللہ چچا سے فرمایا کہ ان کو لے جاؤ، چنانچہ دونوں گھر آئے، یہاں والدہ تکلیف سے سخت پریشان تھیں، حافظ صاحب نے حضرت کا لعاب دہن زبان پر مل دیا، والدہ کو فوراً سکون ہوگیا اور تھوڑی دیر میں ورم تحلیل ہوگیا۔ حافظ صاحب جانے لگے تو والدہ نے کہلا بھیجا کہ جاؤ بھیا (مولانا) سے دعا کہنا اور کہہ دینا کہ اب ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ (بروایت جناب رفیع اللہ چچا)

اخلاق کی فتح:

حضرت والا فرماتے ہیں کہ:

میری بستی میں ایک مولوی صاحب رہتے ہیں جو دوسرے مسلک کے لوگوں میں سے

ہیں، چنانچہ اطراف میں میلاد وغیرہ پڑھنے جایا کرتے ہیں۔ایک دفعہ قریب ہی کی بستی میں میلاد پڑھ کر واپس آرہے تھے کہ راستے میں میرے ایک آدمی نے جو اسی بستی کا تھا، ان سے کچھ پوچھا، انھوں نے کچھ جواب دیا، اس پر اس نے پھر کچھ کہا، غرض بات بڑھ گئی اور ان مولوی صاحب نے چھڑی سے اس کو مار دیا۔ وہ بھی جوان آدمی تھا اس نے مولوی صاحب کو اٹھا کر پٹک دیا، اور غالباً کچھ مارا بھی، میں ان دنوں مئو میں تھا، یہاں دوسرے فریق کو بہت اشتعال ہوا اور اندیشہ ہوا کہ فساد ہو جائے گا، ایک آدمی سائیکل سے فوراً میرے پاس پہونچا اور کہا کہ دو واقعے کی اطلاع کرنے آیا ہوں۔ایک تو یہ کہ گاؤں میں پولیس آئی ہے اور گھر گھر ہتھیاروں کی تلاشی لی جارہی ہے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ سب کو محفوظ رکھے۔اور دوسرا واقعہ اس سے بڑھ کر ہے وہ یہ کہ فلاں شخص نے فلاں مولوی صاحب کو پیٹ دیا ہے، اس کی وجہ سے دوسری جماعت کے لوگ بہت مشتعل ہیں، اور معلوم نہیں اس وقت گاؤں کا کیا حال ہوگا، میں نے کہا پہلی بات کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ عزت و آبرو کی حفاظت فرمائے۔اور دوسرے واقعے کے سلسلہ میں تم یہ کرو کہ ان مولوی صاحب کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ بات وہاں تک (یعنی حضرت مولانا تک) پہونچ گئی ہے، اور اس شخص نے آپ کو نہیں مجھ کو مارا ہے، اب اس کا بدلہ ہمارے ذمہ ہے، اور ان کی مسجد پر کھڑے ہو کر زور سے اعلان کر دو کہ اس واقعہ کا فیصلہ اب مولانا کریں گے، اب آپ لوگ قطعی مشتعل نہ ہوں، اگر انصاف نہ ہوا تو پھر جو چاہے کیجئے گا، پھر میں مئو سے کوپا آیا، وہاں وہ مجرم صاحب بھی تشریف لائے، سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ سب کے سامنے ان پر بہت خفا ہوا اور خوب مارا، اور کہا کہ تم سے کیا مطلب تھا؟ اگر انھوں نے اپنی تقریر میں کچھ کہا بھی تھا تو میں اس کا رد کرتا یا نہ کرتا، اس کا تعلق تو مجھ سے تھا، تم نے ان کو کیوں مارا، اور ان کی توہین تم نے کیوں کی؟ لوگوں نے جو اس کو دیکھا تو یقین آگیا کہ میں واقعی اس سے ناخوش ہوں، اور اس سے ان کے اشتعال میں بہت کچھ کمی آگئی، پھر میں نے ان صاحب سے کہا کہ جاؤ اور مولوی صاحب کا پاؤں پکڑ کر ان سے معافی مانگو اور اس کا تتمہ یہ ہے کہ پالکی پر ان کو اپنے گھر لے جا کر ان کی دعوت کرو تب میں معاف کروں گا ورنہ نہیں۔ چنانچہ وہ صاحب گئے اور معافی مانگی، انھوں نے معاف کر دیا، لوگوں نے کہا آپ نے اتنی جلدی معاف بھی کر دیا، کہنے لگے بھائی اس شخص نے ایسے طور پر مجھ سے معافی مانگی کہ مجھے

معاف کرنا ضروری ہوگیا، اور میں معاف کرنے پر مجبور ہوگیا۔ پھر اس نے دعوت کے لئے کہا تو ان کے گھر کی عورتوں نے کہا کہ اسی گاؤں سے کل پٹ کر آئے ہو اور آج وہیں دعوت کھانے جاؤ گے، یہ تو بڑی بے غیرتی کی بات ہے، تو کہنے لگے بھائی عورتیں منع کرتی ہیں، اس نے کہا اچھا کھانا میں یہیں لاؤں گا، اور دعوت کرنی تو مجھے ضروری ہے۔ اس لئے کہ ہمارے حضرت کی معافی اسی پر موقوف ہے، خیر اس کو منظور کرلیا، وہ گھر گیا اور عمدہ کھانے پکوا کر لایا اور ان کے گھر دے آیا۔ اور دوسرے دن جب وہ برتن لینے گیا تو مولوی صاحب وہی کھانا کھا رہے تھے، کہنے لگے دیکھو جی تمہارے ہی یہاں کا بچا ہوا کھانا اس وقت بھی کھا رہا ہوں، غرض وہ بالکل راضی ہوگئے اور ایک اتنا بڑا فتنہ جس کو سن کر میں اول وہلہ میں تو سمجھا تھا کہ اب ایسی آگ لگ گئی ہے کہ اس نے تو اب تک کی میری ساری محنت ہی خاکستر کر کے رکھ دی ہے، لیکن الحمدللہ کہ وہ فتنہ فرو ہوگیا، اور اپنے بعد اپنا کوئی اثر بھی نہیں چھوڑا، اس سے میں نے سمجھا کہ یہ اخلاق کی فتح ہے، یہی سکھلاتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ لوگ اس طور پر کام کریں۔

غیرتِ دینی:

گورکھپور کے دورانِ قیام ایک واقعہ ایسا گذرا ہے جس سے حضرت کی اعلیٰ درجہ کی دینی غیرت کا ظہور ہوتا ہے، ایک بار حضرت کی طبیعت سخت علیل ہوئی۔ بیماری ایسی تھی کہ اس میں جسم کا پانی خشک ہوگیا، حضرت پر غشی طاری ہوگئی، کسی طرح ہوش نہ آتا تھا، ایک غیر مسلم ڈاکٹر جو مولوی ثناء اللہ مرحوم کا گویا گھریلو طبیب تھا، اس کا مشورہ ہوا کہ حالت بہت نازک ہے، پانی بدن میں چڑھانا ضروری ہے، ورنہ معاملہ خطرناک ہے اس نے ہاتھ میں رگ تلاش کی مگر نہ مل سکی، پاؤں میں تلاش کی وہاں بھی نہیں مل رہی تھی، بڑی مشکلوں سے رگ دستیاب ہوئی۔ رات بھر میں کئی بوتل پانی چڑھایا گیا بالآخر حضرت کو ہوش آگیا اور آنکھیں کھول دیں، رات میں بھی ڈاکٹر بار بار آیا، صبح کے وقت جب ڈاکٹر آیا تو حضرت ہوش میں تھے، اس نے برجستہ کہا:

”کہئے مولانا صاحب! رات تو آپ چل دیئے تھے، میں نے آپ کو بچالیا“۔

حضرت نے یہ جملہ سننے کو تو سن لیا، مگر چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا، اس وقت تو نہ بولے، جب ڈاکٹر چلا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں اس ڈاکٹر کی دوا نہیں کروں گا، ایک خوراک بھی اس کی

لکھی ہوئی دوا نہ کھاؤں گا، اور فرمایا کہ جب اس نے یہ جملہ کہا تو میرے دل پر ایک تیر سا لگا، میں نے اپنے جی میں کہا کہ اب ہم لوگوں کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ کفار ہمارے سامنے ایسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ غرض اس شدید بیماری میں حضرت نے اس کی دوا نہ کھائی، دوسرے ڈاکٹروں کا علاج ہوا، اور حضرت کو اللہ تعالیٰ نے شفا عطا فرمائی۔

بھائی میں تو ایک طالب علم قسم کا آدمی ہوں:

حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب کٹرہ الہ آبادی، مجاز حضرت والا راوی ہیں کہ:

حضرت کا معمول ایک وقت میں ہر جمعہ کو کٹرہ آنے کا تھا۔ کٹرہ میرے یہاں کچھ دیر استراحت فرماتے اور جمعہ کی نماز پڑھ کر فوراً روشن باغ واپس ہوجاتے، ساتھ میں عموماً قاری محمد مبین صاحب ہوتے اور کبھی کبھی مولوی عبدالمجید صاحب اسرار کریمی پریس والے بھی ہوتے، روشن باغ سے کٹرہ کا فاصلہ تین میل کے قریب ہے، حضرت رکشے سے تشریف لے جاتے تھے۔ ایک بار حضرت والا مولوی عبدالمجید صاحب کو ساتھ لیکر کٹرہ تشریف لائے، بستر لگا دیا گیا، آپ استراحت فرمانے کے لئے لیٹ گئے۔ مولوی عبدالمجید صاحب کے پاس کچھ دنوں پہلے ایک چھوٹی سی کار تھی جو کبھی کبھی حضرت کے لئے بھی استعمال ہوتی تھی۔ میں نے وہیں جہاں حضرت لیٹے تھے مولوی عبدالمجید صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کی کار کیا ہوئی؟ انھوں نے بتایا کہ فروخت ہوگئی، میں نے کہا کہ حضرت کے لئے ایک کار ہوتی تو بہت اچھا تھا۔ اتنی دور سے رکشہ سے تشریف لانا باعث تکان ہوتا ہے، کار ہوتی تو جب اور جہاں منشا ہوتی تشریف لے جاتے، حضرت نے سنا تو بولے:

''بھائی میں تو ایک طالب علم قسم کا آدمی ہوں، میرے لئے تو مسجد کا ایک حجرہ بھی کافی ہے، اگر بچیوں کا ساتھ نہ ہوتا تو یہ مکان وغیرہ بھی جو تم دیکھ رہے ہو، ہرگز میں نہ لیتا مگر ان کے حقوق کی ادائیگی کے خیال سے لے لیا ہے۔ تم لوگ کاروار کی کیا بات کررہے ہو؟۔

قاری صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت نے اس کے بعد ہم لوگوں کی طرف سے رخ پھیر کر کروٹ بدل لی اور پھر ادھر رخ نہیں کیا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حضرت کو یہ بات ناگوار گزری ہے۔

خدمت خلق:

مولوی محمد نعمان صاحب معروفی راوی ہیں کہ:

ایک مولوی صاحب جو حضرت تھانوی سے بیعت تھے اور اطراف فتح پور کے ایک قصبہ (غالباً گھوسی) کے ایک مدرسہ میں مدرس تھے اور ہمارے حضرت کے زیر تربیت تھے ان کا واقعہ ایک صاحب نے نقل کیا کہ ایک مرتبہ مولانا مرحوم کے یہاں مہمانوں کی آمد کچھ زیادہ ہوئی اور تنگدستی کی حالت تھی۔ایک صاحب فتح پور جا رہے تھے ان کے توسط سے مولانا صاحب نے حضرت کی خدمت میں سلام کہلا بھیجا اور دعا کی درخواست کی کہ حضرت دعا فرمائیں اس وقت مہمانوں کی آمد زیادہ ہے، گرمی کا زمانہ تھا مولوی صاحب مرحوم دوپہر کو اپنی جائے قیام پر آرام فرما رہے تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا مولوی صاحب مرحوم نے اندر سے آواز دی کون ہے؟ حضرت نے فرمایا دروازہ کھولو مولوی صاحب نے دروازہ کھولا تو ہکا بکا رہ گئے، حضرت نے فرمایا کہ لو یہ گٹھری ہے اس میں کچھ غلہ ہے جب یہ ختم ہو جائے تو اطلاع کرنا، پریشانی کی کوئی وجہ نہیں اور بیٹھے بھی نہیں فوراً واپس تشریف لائے۔

انھیں مولوی نعمان صاحب کی روایت ہے کہ:

ایک مولوی صاحب کا بیان ہے کہ اکثر مجھے پریشانی اور تنگدستی رہتی تھی، جب فتح پور جاتا تو فوراً اطمینان ہو جاتا ایک مرتبہ کئی وقت کا فاقہ تھا تو حضرت نے بغیر کچھ کہے ہی دس کا نوٹ دیا اور فرمایا کہ ابھی گھر چلے جاؤ اور فوراً مجھے واپس فرمایا۔

بے نظیر احتیاط:

عبدالباری بھائی جو حضرت کے بھتیجے ہیں کہتے کہ حضرت والا کبھی کبھی پورہ معروف جاتے وقت مجھے بھی ہمراہ لے لیتے تھے میں چھوٹا بچہ تھا۔وجہ یہ تھی کہ راستہ میں غیر مسلموں کی چھوٹی آبادی جس کو اس طرف ''پروا'' کہتے ہیں پڑتی تھی اور راستہ آبادی کے بیچ سے ہو کر جاتا تھا دیہات کی عورتوں میں بالخصوص غیر مسلموں کی نیچ قوم کی عورتوں میں خواہ بوڑھی ہوں، جوان ہوں کچھ حیا و شرم تو ہوتی نہیں۔سردیوں میں اپنے اپنے دروازوں کے باہر دھوپ میں نکل کر نیم عریاں سی بیٹھی رہتی تھیں اور باہم خوب ہنسی ٹھٹھا کرتی ہوتی تھیں، سر سینہ، بازو حتی کہ ران تک ان کی کھلی

رہتی تھی، اب اس راستہ سے گزرنا حضرت کے لئے قیامت سے کم نہ تھا۔اس لئے حضرت یہ کرتے تھے کہ جب ایسا مقام قریب آتا تو مجھ فرماتے کہ عبدالباری تم آگے چلو اور میری لاٹھی پکڑ لو اور اس کا پیچھے کا سرا خود حضرت پکڑ لیتے اور آنکھیں اپنی بند کر لیتے جس طرح نابینا لوگ چلا کرتے ہیں۔یہی برابر حضرت کا معمول تھا جب اس جماعت کے پاس گزرتے تو وہ باہم ایک دوسرے سے کہتیں کہ ہے ہے دیکھوتو بابا کیسے اچھے ہاتھ پاؤں کے ہیں اور بیچارے اندھے ہو گئے ہیں۔حضرت آگے بڑھ کر مجھ سے فرماتے کہ عبدالباری تم نے سنا وہ سب کیا کہہ رہی تھیں۔کم بخت میرے اندھے ہونے پر ترس کھا رہی تھیں یہ نہیں جانتیں کہ اس کا سبب ہم ہی لوگ تو ہیں۔

تقوی کی برکت:

حضرت والا کی طبیعت تقویٰ کی ایسی خوگر تھی کہ مشتبہ اور غیر یقینی چیزوں سے از خود غیب سے بھی حفاظت کے سامان ہو جاتے تھے۔اللہ کا یہ بھی انعام اس کے خاص بندوں پر اکثر رہا ہے کہ جب وہ اپنے ارادہ واختیار سے تقویٰ کی بھٹی میں اپنے نفوس کو پگھلاتے ہیں تو پھر قدرت بھی ایسے انتظامات فرماتی رہتی ہے کہ ان کے پاس کوئی ناجائز امر گزر نہ سکے۔حضرت مولانا کے ایک عمر رسیدہ عزیز تھے انھوں نے ایک مرتبہ حضرت کی دعوت کی، حضرت نے اخلاقاً انکار نہیں فرمایا مگر ان کی آمدنی میں کچھ تردد تھا، حضرت والدہ کے پاس آئے اور کہا اماں! میں نے چچا کی ناراضگی کے خیال سے کچھ نہیں کہا، اب آپ اس سے بچایئے انھوں نے کہا کہ اسی وقت ہم پر ڈال دیتے، میں خوش اسلوبی سے اس کو ٹال دیتی، خیر کہو تو اب جاؤں ان کے یہاں؟ حضرت نے بعض مصالح کی بنیاد پر روک دیا، کھانے کے وقت آدمی بلانے کے لئے آیا، حضرت تشریف لے گئے کھانے پر بیٹھے اور چند ہی نوالے کھائے تھے کہ طبیعت مالش کرنے لگی، دسترخوان سے اٹھ گئے اور اپنے مکان تشریف لے گئے، قے ہوگئی اور جب تک سب کھایا ہوا گر نہیں گیا متلی تھمی نہیں، اس کے بعد سے والدہ کسی کی دعوت منظور ہی نہیں کرتی تھیں اور مزید احتیاط یہ شروع کر دی کہ اس کے بعد حضرت کے لئے غلہ مخصوص طریقہ سے الگ رکھنے لگیں، اور گھر کا کھانا بھی احتیاط کے ساتھ پکایا جانے لگا۔

ایسا ہی ایک واقعہ بالکل بچپن میں کانپور میں پیش آیا، حافظ محمد زکریا صاحب کہتے ہیں مولوی عبدالقیوم صاحب نے حضرت کے استاذ زادے حافظ حفیظ اللہ کے واسطے سے بیان کیا ہے

کہ حضرت جب کانپور محلّہ ٹپکا پور میں پڑھتے تھے تو ایک دفعہ مدرسہ کے طلبہ کی دعوت ہوئی سب کے ہمراہ حضرت بھی دعوت میں چلے گئے مگر جیسے ہی پہلا لقمہ منھ میں ڈالا کہ طبیعت مالش کرنے لگی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قے ہو جائے گی، کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور کسی طرح وہاں سے واپس آئے اس کے بعد سے پھر اس قسم کی کسی دعوت میں کہیں بھی تشریف نہیں لے گئے وہ دعوت کسی میت کے ایصال ثواب کے سلسلہ کی تھی۔

حیرت انگیز واقعہ:

ایک حیرت انگیز واقعہ سنئے۔ راوی مولانا حکیم بشیر الدین صاحب کوپا گنج والے ہیں، انھوں نے راقم الحروف سے براہ راست یہ واقعہ نقل کیا ہے ان کا بیان ہے کہ میرا چھوٹا بچہ حفیظ الرحمٰن جب اس کی عمر تقریباً تین برس کی تھی، جاڑے کا موسم تھا، میں فتح پور خانقاہ میں حاضر تھا یہاں گھر میں کوئی عورت لحاف میں ٹانکے لگا رہی تھی اور دو تین بڑی بڑی سوئیاں پاس میں رکھے ہوئی تھیں بچہ کھیلتا ہوا قریب آیا اور ایک سوئی منھ میں رکھ کر نگل گیا، اس کی بہن ہائیں ہائیں کرتی رہ گئی، اتنی دیر میں سوئی حلق کے نیچے اتر گئی گھر میں پریشانی شروع ہوگئی لیکن بچے کو ابھی کسی تکلیف کا احساس نہیں ہوا، فوراً ایک آدمی فتح پور دوڑا گیا، حکیم صاحب شام تک گھر آگئے، ابھی تک بچہ کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی، رات ہونے کو آئی تو تکلیف کا احساس ہوا، بچہ ایک پہلو پر اکڑ گیا کسی دوسری جانب حرکت دینے سے بے اختیارانہ چیخ اس کے منھ سے نکل پڑتی تھی، حکیم صاحب کہتے ہیں کہ رات بھر میں اور اس کی والدہ باری باری اسی پہلو پر اسے گود میں لئے رہے۔ طبیعت مضطرب تھی کہ کیا کیا جائے؟ تکلیف حد سے بڑھتی جارہی تھی، حکیم صاحب نے صبح فتح پور حضرت کے پاس بوتل میں پانی دے کر آدمی بھیجا کہ حضرت سے اس پر دم کرالاؤ، نیز حضرت سے عرض کرو کہ آپریشن کے بغیر معاملہ بنتا ہوا نظر نہیں آتا پٹنہ یا لکھنؤ بچہ کو لے کر جانے کا خیال ہے آپریشن سے سوئی نکلوائی جائے گی، حضرت نے پانی پر دم کر دیا اور فرمایا کہ اسے پلاؤ اور میں دعا کرتا ہوں، بچہ کو کہیں لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت کے معمول کے خلاف یہ بات تھی، ظاہری علاج و معالجے کی ضرورت پر ہمیشہ ترغیب دیتے تھے کبھی روکتے نہ تھے، اب جو روکا ہے تو کوئی خاص بات ہے چنانچہ حکیم صاحب نے اپنا ارادہ بدل دیا دن بھر وہ پانی

پلاتے رہے تکلیف اسی حال میں باقی رہی رات آئی تو پھر وہی منظر تھا۔ باری باری ایک پہلو میں گود میں لئے رہتے، تقریباً آدھی رات گزری تھی کہ حکیم صاحب کو محسوس ہوا کہ بچے کو نیند آ گئی ہے حکیم صاحب نے رضائی لپیٹ کر اسے مسند کی طرح بنالیا اور اس پر بچے کو اسی کروٹ پر لٹا دیا جس پہلو پر اسے کچھ سکون رہتا تھا، بچہ آرام سے سو گیا، رات بھر سوتا رہا، صبح اسے بھوک لگی دو دن سے کوئی چیز منھ میں نہیں گئی تھی۔ حکیم صاحب نے گرم گرم دودھ پلا دیا، دودھ کا پینا تھا کہ پاخانہ کی حاجت محسوس ہوئی لیکن پھر ڈرتا بھی رہا کہ تکلیف ہوگی، تھوڑی دیر کے بعد جب پاخانہ کا تقاضہ زیادہ ہوا تو حکیم صاحب نے گھر کے آنگن ہی میں اسے بیٹھا دیا، بیٹھنا تھا کہ پہلے وہی سوئی باہر نکل آئی، گھر والوں کی مسرت کی انتہا نہ رہی حکیم صاحب نے سوئی دھو کر ساتھ لی اور فتح پور حاضر ہو گئے اور حضرت کو دکھایا، حضرت کو تعجب ہوا کہ اتنی بڑی سوئی صحیح سالم باہر نکل آئی اور شکم میں کوئی زخم نہیں پیدا کیا، عصر کی نماز کے بعد تنہائی میں حضرت نے فرمایا کہ جانتے ہو میں نے کیا دعا کی تھی، عرض کیا کہ حضرت فرمائیں، فرمایا میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ:

''یا اللہ چھوٹا بچہ ہے سوئی نگل گیا ہے، ڈاکٹر ایک جگہ کاٹیں گے وہاں نہ ملے گی دوسری جگہ پھاڑیں گے اس طرح بچہ کا تو قیمہ بن جائے گا، آپ کی قدرت بہت بڑی ہے آپ اگر چاہیں تو بغیر کسی زحمت کے سوئی باہر نکل جائے گی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی''۔

حضرت کی برکت:

چودھری حبیب الرحمان صاحب مرحوم جو اپنی عرفیت حبن بھائی سے مشہور تھے، الہ آباد سے تین میل کے فاصلے پر ایک بستی بمرولی نامی ہے، وہیں کے رہنے والے تھے، حضرت کے بڑے عاشق اور مخلص خادم تھے کبھی کبھی حضرت بمرولی ان کے یہاں تشریف لے جاتے اور کئی کئی روز قیام فرماتے۔ ایک بار کا واقعہ بیان کرتے ہیں، یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ حضرت والا نے الہ آباد میں اپنا ذاتی مکان نہیں خریدا تھا حسن منزل میں آپ کا قیام تھا ایک شخص کی کسی بے عنوانی پر حضرت کو کبیدگی ہوئی اور آپ بمرولی تشریف لے گئے، ایک بجے رات کو حضرت نے حبن بھائی کو بلایا اور فرمایا کہ میرا یہ خط لیکر اسی وقت شہر چلے جاؤ اور فلاں صاحب کو دیکر فوراً جواب لیکر آؤ، حضرت نے استفسار فرمایا کہ اسی وقت جا سکتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا کہ ضرور، حضرت نے ایک

اور صاحب سے بھی فرمایا کہ تم بھی ساتھ میں چلے جاؤ، گاؤں سے باہر نکل کر ان صاحب سے حبن بھائی نے کہا کہ آپ کہاں تکلیف کریں گے آپ یہیں رہئے میں اکیلا چلا جاؤں گا، باہر سڑک پر آئے ایک بجے کا عالم ہر طرف سناٹا چھایا تھا، شہر جانے کے لئے اس گئی رات میں سواری کا تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا، پیدل ہی چل کھڑے ہوئے ابھی چند قدم چلے تھے کہ نصرت غیبی آپہونچی، پیچھے سے ایک جیپ کی آواز سنی، جیپ ان کے پاس آکر ٹھہر گئی، اس میں ایک فوجی افسر بیٹھا ہوا تھا، اس نے ان سے پوچھا کہ مولانا کہاں جارہے ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ شہر جارہا ہوں، اس نے انھیں گاڑی پر باصرار بیٹھالیا، حبن بھائی اسے پہچانتے نہیں تھے، شہر پہونچ کر خلد آباد تھانہ کے قریب حبن بھائی نے اترنا چاہا، اس نے کہا آپ کو الہ آباد میں کس جگہ پہونچنا ہے؟ چودھری صاحب نے حسن منزل بتایا اس نے کہا چلئے میں آپ کو وہیں چھوڑ دوں گا، چنانچہ اس نے ان کو بالکل دروازہ پر لاکر اتاردیا، جن صاحب کو خط دینا تھا انھیں خط دیکر زبانی جواب حاصل کرکے فوراً پلٹے، اب سوچ رہے تھے کہ یہاں سے کوئی سواری ملنی مشکل ہے، پیدل ہی لوٹنا ہوگا، یہی سوچتے ہوئے بازار نخاس کہنہ تک پہونچے، وہاں دیکھتے ہیں کہ ایک تانگہ والا یکہ وتنہا بازار میں آواز لگائے جارہاہے بمرولی، بمرولی، انھیں بڑی حیرت ہوئی اس وقت اور بمرولی کی سواری موجود، تانگہ پر بیٹھ گئے اور اس نے ہوا کی رفتار سے انھیں بمرولی پہونچادیا، انھوں نے کرایہ دینا چاہا اس نے انکار کردیا، کہنے لگا مجھے تو یہاں تک آنا ہی تھا میں سوچ رہا تھا کہ کوئی شخص مل جائے تو لیتا جاؤں، آپ مل گئے، کرایہ کی کوئی ضرورت نہیں یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا، یہ سارا کام ایک گھنٹہ میں ہوگیا۔

حضرت کی برکت:

مولانا عبدالرحمان صاحب جامی بیان کرتے ہیں کہ حضرت والا کا قیام جب فتح پور میں تھا تو مجلس بعد نماز ظہر ہوتی تھی، اطراف کے لوگ مجلس میں آیا کرتے تھے، مئو سے قاری ریاست علی صاحب مرحوم اور ان کے رفقاء بھی ساتھ ہوا کرتے تھے، مجلس کے بعد عصر کی نماز پڑھ کر یہ لوگ فوراً لپکے ہوئے تیزی سے کوپا گنج کی جانب روانہ ہوجاتے، وہاں سے فورا مئو کے لئے ٹرین مل جاتی تھی اور یہ حضرات مغرب بعد مئو پہونچ جاتے، اس وقت کوپا سے مئو تک سواریوں کی سہولت نہ تھی، ٹرین نہ ملنے کی صورت میں آدمی کو یکہ کی سواری اختیار کرنی پڑتی جو تکلیف دہ بھی ہوتی تھی اور

وقت بھی اس میں بہت لگتا، ایک دن عصر کی نماز پڑھ کر حضرت والا نے قاری ریاست علی صاحب کا ہاتھ پکڑا اور گفتگو کرتے ہوئے اپنے کمرے میں لے گئے اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے، قاری صاحب کے رفقاء گھبرا رہے تھے کہ ٹرین نہیں ملے گی اور رات ہو جانے پر کوپا سے مئو تک کے لئے یکے بھی نہ مل سکیں گے، بہت پریشانی ہوگی اور حضرت کو کوئی ضروری بات کرنی تھی، وقت گزرتا جارہا تھا یہ یقین ہو گیا کہ اب تو گاڑی ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں، خاص طریقے پر کوئی یکہ وغیرہ طے کرنا پڑے گا، اس شش و پنج میں آدھ گھنٹہ سے زیادہ گزر گیا، پھر حضرت والا قاری صاحب کو لئے ہوئے نیچے آئے اور شبلی موذن سے......جو قاری صاحب کے رفقاء میں تھے...... فرمایا کہ قاری صاحب کو لیکر جاؤ اور تیز تیز جاؤ ورنہ گاڑی چھوٹ جائے گی، انھوں نے اپنے دل میں کہا کہ گاڑی تو چھوٹ چکی تاہم حضرت کا ارشاد تھا بہت تیزی سے لپکے ہوئے کوپا گنج پہونچے تو معلوم ہوا کہ گاڑی اب سے کوئی آدھ گھنٹہ پہلے اپنے وقت پر پلیٹ فارم سے چھوٹ چکی ہے، لیکن چند ہی قدم چل کر رک گئی اور ابھی تک رکی ہوئی ہے یہ لوگ جلدی جلدی ٹکٹ لے کر اس پر سوار ہو گئے، سوار ہونا تھا کہ ٹرین چل پڑی۔

کھلی کرامت:

حضرت والا کے چھوٹے داماد جناب مولانا ارشاد احمد صاحب کی روایت ہے کہ جن دنوں حضرت کو نکسیر کی شکایت تھی الہ آباد ہی میں قیام پذیر تھے، حکیم مسعود صاحب اجمیری مرحوم اور دوسرے اطباء کا علاج چل رہا تھا، صورت حال یہ تھی کہ ہر تھوڑی دیر کے بعد نکسیر کا دورہ ہوتا اور بہت زیادہ خون ناک کی راہ سے نکل جاتا، اطباء عاجز تھے حضرت کو گفتگو اور ہر طرح کی حرکت سے منع کر دیا گیا تھا۔ اسی دوران کبھی کبھی وقفہ طویل ہوتا تو حضرت والا ضروری باتیں فرما دیتے، کبھی مواخذہ اور عتاب کا سلسلہ بھی چل پڑتا۔ ایک دن حکیم اجمیری مرحوم صاحب نے حضرت سے عرض کیا کہ جب تک صحت نہ ہو جائے تعلیمی و اصلاحی مواخذوں سے بھی پرہیز فرمایا جائے ورنہ خون کا آنا بند نہ ہوگا، انھوں نے کہنے کا انداز ایسا اختیار کیا تھا جو حضرت کو پسند خاطر نہ ہوا، حضرت نے فرمایا کہ اچھا اگر میں یہ سلسلہ جاری رکھوں اور خون نہ آئے تو؟ انھوں نے عرض کیا کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا، حرکت ہوگی تو خون آئے گا۔ انھوں نے سوال و جواب کی صورت اختیار کر لی، حضرت

نے فرمایا کہ اچھا دیکھئے کیسے خون آتا ہے، حکیم صاحب تو وہاں سے چلے گئے اور ادھر خون کا آنا بالکل بند ہوگیا، اور پھر نکسیر نام کو بھی نہیں پھوٹی، دوسرے دن حکیم صاحب نے دستہ بستہ معافی چاہی اور عرض کیا کہ میں اولیاء کی کرامت کا منکر نہیں ہوں، میری گفتگو تو طبی اصول کی بنیاد پر تھی یہ تو آپ کی کھلی ہوئی کرامت ہے۔

ایسے ہی حضرت کے قیام فتح پور کے ابتدائی دور کا واقعہ ہے کہ حضرت کے خادموں میں سے ایک صاحب جوراجگیری کا کام کیا کرتے تھے ایک بار ایک دیوار پر سے نیچے گر پڑے اور پنڈلی کی ہڈی پھٹ گئی، تکلیف حد سے زیادہ تھی، لوگ دوڑے ہوئے حضرت کے پاس لائے آپ نے جہاں درد تھا وہاں ہاتھ پھیر کر کچھ دم کیا اور فوراً مئو لے جانے کا حکم دیا، حکیم سعید مرحوم ہڈیوں کے مشہور معالج تھے انھیں دکھایا گیا، انھوں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا کہ ہڈی بالکل صحیح وسالم ہے کہیں سے بھی ٹوٹی پھٹی نہیں ہے، ادھر ان کا درد بھی کم ہوگیا تھا تاہم لوگوں کو یقین نہیں آیا، ایکسرے کرانے پر معلوم ہوا کہ ہڈی پھٹی یقیناً تھی، چنانچہ ہڈی پر اس کی علامت موجود ہے مگر اب بالکل صحیح وسالم ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ایک صاحب سنا رہے تھے، غالباً بمبئی کا ذکر ہے کہ ایک لڑکے کے شکم میں اندر ایک خطرناک پھوڑا ہوگیا، ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز کیا، اور لڑکا ہسپتال میں داخل ہوگیا، آپریشن کی مقررہ تاریخ سے ایک روز پہلے لڑکے کے والد حضرت والا کی خدمت میں دعاء کے لئے حاضر ہوئے اور ایک گلاس میں پانی پیش کیا کہ حضرت دم کردیں تاکہ بچے کو پلادیا جائے، حضرت نے دم کردیا وہ پانی بچے کو پلادیا گیا دوسرے دن آپریشن سے پہلے ایکسرے لیا گیا، ایکسرے میں پھوڑا غائب! ڈاکٹروں کو حیرت ہوئی، دوبارہ ایکسرے ہوا لیکن پھوڑے کا نام و نشان نہیں، ہسپتال کے سبھی ڈاکٹر جمع ہوگئے، سب حیرت زدہ رہ گئے کہ کل تک شکم میں ایسا پھوڑا تھا کہ بغیر آپریشن کے اس کے تحلیل ہونے کا تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا، آج وہ کہاں غائب ہوگیا؟ بچے کے والد سے پوچھا کہ کل سے آج تک تم نے بچے کو کوئی دوا ہم لوگوں کے لاعلمی میں کھلائی ہے؟ اس نے انکار کیا، پھر جب اس کے سامنے صورت حال آئی تو اس نے بتایا کہ دوا تو نہیں البتہ ایک بزرگ سے پانی پڑھوا کر پلایا تھا، ڈاکٹروں نے کہا بس یہی بات ہے پھر غالباً وہ ڈاکٹر صاحبان

حضرت والا کی قیام گاہ پر آپ کی زیارت کے لئے حاضر بھی ہوئے۔

دعا کا اثر:

ہمارے ایک دوست ضلع بھاگلپور بہار کے رہنے والے اپنا ایک واقعہ بیان کر رہے تھے کہ جب وہ دارالعلوم مئو میں طالب علم تھے، اس وقت حضرت والا الہ آباد میں تشریف فرما تھے، گھر سے خط آیا کہ ان کی بھابی کے سر میں شدید درد ہفتوں سے ہے، چھوٹے بڑے تمام ڈاکٹر اور طبیب عاجز آچکے ہیں، درد کسی طرح کم نہیں ہوتا، خط میں تھا کہ تم فوراً الہ آباد حضرت کی خدمت میں چلے جاؤ اور حضرت سے دعا کراؤ، وہ فوراً الہ آباد کے لئے چل پڑے، طبیعت میں آزادی اور بے باکی بہت تھی بغیر ٹکٹ ہی ٹرین پر سوار ہو گئے، صبح سویرے الہ آباد پہونچے، ان کا بیان ہے کہ جب میں حضرت کے دراقدس پر پہونچا تو مجلس ہو رہی تھی میں بھی چپکے سے ایک گوشہ میں جا بیٹھا، میرے بیٹھتے ہی حضرت فرمانے لگے کہ لوگ مدرسوں میں پڑھتے ہیں اور بزرگوں کی مجلس میں بھی جاتے ہیں، لیکن معاملات سے لاپروائی کا یہ حال ہے کہ بغیر ٹکٹ ریل پر سوار ہو جاتے ہیں، پھر اسی موضوع پر دیر تک سلسلۂ بیان جاری رہا، مولوی صاحب کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ آخر انھیں کس نے بتا دیا؟ بہر کیف جب مجلس ختم ہوگئی تو انھیں خیال ستانے لگا کہ اب حضرت کے روبرو جاؤں تو کیونکر جاؤں؟ تاہم جانا ضروری تھا، جی کڑا کر کے خدمت میں حاضر ہوا، حضرت بہت عنایت وشفقت سے میری جانب متوجہ ہوئے، میں نے عرض مدعا کیا، حضرت نے فوراً دعا کی اور جب میں رخصت ہونے لگا تو نہایت آہستگی سے دس روپیہ کا نوٹ نکال کر مجھے دیدیا اور فرمانے لگے کہ ٹکٹ لے لینا، میں نہایت شرمندہ ہوا اور حضرت کا مبارک عطیہ لے کر فوراً باہر آگیا، میرے پاس پہلے سے رقم موجود تھی، اب جو حضرت کی عطا فرمودہ رقم بھی مل گئی تو گھر تک جانے کا کرایہ مہیا ہوگیا۔ میں براہ راست گھر چلا گیا، وہاں پہونچا تو بھابی ٹھیک ہو چکی تھیں، میں نے دریافت کیا کہ درد کب سے موقوف ہے؟ انھوں نے ٹھیک وہی وقت بتایا جس وقت حضرت دعا فرما رہے تھے۔

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا:

ہمارے دوست جناب حافظ قاری شبیر احمد صاحب دربھنگوی راوی ہیں کہ دربھنگہ ہی کے ایک صاحب عبدالمنان نامی بہت ذہین اور ذکی شخص تھے، مشکوٰۃ تک عربی پڑھ کر انگریزیت

کا رخ اختیار کرلیا تھا، اس ماحول میں بدلے اور ایسا بدلے کہ الحاد کے جہنم میں جا گرے، خدا کا انکار، رسالت کا انکار، اسی حالت میں عمر کا ایک بڑا حصہ گزر گیا بمبئی میں رہتے تھے بہت خوشحال تھے، بیٹے دوسرے ممالک میں ملازمت کرتے تھے، دولت کی کمی نہ تھی، جن دنوں حضرت بمبئی میں مقیم تھے ان کا ایک نواسہ سخت بیمار تھا۔ دوا علاج سے عاجز آچکے تھے، کسی نے مشورہ دیا کہ مولانا مستجاب الدعوات ہیں ان سے دعا کراؤ، وہ خدا ہی کے قائل نہ تھے، دعا کے کیا قائل ہوتے؟ انکار کر دیا، مگر مجبوری سب کچھ کراتی ہے مجبوراً دعا کیلئے حاضر خدمت ہوئے، حضرت کی خدمت میں پہونچے تو حضرت کمرے میں تنہا ٹہل رہے تھے، انھیں دیکھتے ہی جھپٹے اور فرمایا کہ میں دیر سے آپ کا انتظار کررہا ہوں، آیئے، حضرت نے معانقہ فرمایا اور ایک بار نہیں پانچ بار معانقہ فرمایا، حضرت کے ہر معانقہ پر ان کی کیفیت بدلتی جارہی تھی، آخری معانقہ کے بعد حضرت والا نے ان کا ہاتھ جو پکڑا ہے تو وہ دھاڑیں مار کر رونے لگے اور دل میں دین حق کے خلاف جتنی ظلمتیں تھیں یکایک سب دور ہوگئیں، اور خدا کا نور سینے میں بھر گیا۔ کہنے لگے حضرت اب یہ ہاتھ نہیں چھوڑ سکتا، اس کے بعد ان کی زندگی قابل رشک حد تک پاکیزہ ہوگئی تھی۔ حافظ شبیر احمد صاحب کا بیان ہے کہ میں ان سے ملا ہوں اکثر وہ اپنے حجرے میں رویا کرتے تھے انھیں نے یہ واقعہ حافظ صاحب کو سنایا تھا، سناتے وقت بھی ان کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں، اب ان کا انتقال ہوگیا۔ **رحمہ اللہ**

اخلاص کسے کہتے ہیں؟:

ایک دفعہ بعض وقتی حالات کی بنا پر حضرت والا نے دو تین ماہ تک بمرولی میں قیام فرمایا، قیام طویل ہونے کی وجہ سے باہر سے آنے والے مہمان اور ذاکرین وشاغلین وہیں پہونچتے۔ انھیں دنوں مئو سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی بھی تشریف لائے اور غالباً تین دن بمرولی میں قیام فرمایا۔ حضرت نے چودھری حبیب الرحمٰن صاحب کو بلا کر فرمایا کہ آپ کے ہم نام ایک مولانا صاحب اعظم گڈھ سے تشریف لائے ہیں، آپ انہیں پہچانتے ہیں؟ چودھری صاحب نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا ان کے پاس جایئے اور میری طرف سے ان سے دریافت کیجئے کہ اخلاص کسے کہتے ہیں؟ چودھری صاحب کہتے ہیں کہ میں گیا تو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لیٹے

ہوئے تھے۔میں نے جا کر حضرت کا پیغام پہونچا دیا۔میرے منہ سے حضرت کا سوال سنتے ہی مولانا اٹھ کر بیٹھ گئے۔اور دونوں ہاتھ سے اپنا سر پکڑ لیا اور ایک دو منٹ تک سر جھکائے کچھ سوچتے رہے۔غالباً مولانا پر حضرت کا اصل منشا مکشوف ہوا۔اور مولانا نے سمجھا کہ حضرت والا اس سوال کے ذریعے کوئی اہم علم عطا فرمانا چاہتے ہیں۔یا کسی ضروری امر کی جانب توجہ دلانی مقصود ہے۔ ورنہ اخلاص کے لفظی معنیٰ کون نہیں جانتا۔اس لئے قدرے تأمل کے بعد فرمایا کہ حضرت سے جا کر عرض کردیجئے کہ ''اخلاص اس کو کہتے ہیں کہ آدمی جس کا ہوجائے بس اسی کا ہو رہے''۔ چودھری صاحب کہتے تھے کہ میں نے حضرت والا سے جا کر مولانا کا یہ جواب نقل کردیا۔حضرت جواب سن کر مسکرائے۔جس سے میں نے اندازہ کرلیا کہ حضرت نے اس جواب کو پسند فرمایا۔

انداز دلبرانہ:

مولانا وقاری حبیب احمد صاحب الہ آبادی کا بیان ہے کہ میں مجلس میں حضرت والا کے قریب ہی بیٹھنے کی کوشش کرتا تھا۔اس تمنا میں کہ مخصوص جذبہ کی حالت میں لوگوں کے سر پر حضرت کا جو ہاتھ [ا] پڑا کرتا ہے، کاش وہ سعادت مجھے بھی حاصل ہوتی، چنانچہ ہونے لگی۔اس کے بعد سے تو یہ حال ہوگیا کہ اگر کسی دن مجھے ذرا دیر ہوجاتی اور کچھ دور بیٹھتا تو کبھی تو حضرت ہی اشارہ سے مجھے قریب بلا لیتے اور کبھی خفگی سے فرماتے اور دور بیٹھو کہیں چھینٹ نہ پڑ جائے۔لیکن شفقت و اکرام کا یہ عالم تھا کہ حضرت کے ہاتھ میں انگوٹھی تھی۔اس کی وجہ سے جب کبھی زور کا ہاتھ سر پر پڑ جاتا تو چوٹ لگ جاتی، مگر یہ دیکھا اور اس میں تخلف نہیں ہوا کہ بعد اختتامِ مجلس میں جب جانے کیلئے ملتا اور مصافحہ کرتا، تو حضرت کا ایک ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہوتا اور دوسرے ہاتھ سے میرا سر پکڑ کر اس کو اپنے سینے سے قریب کر کے میرے کان میں آہستہ سے فرماتے کہ قاری صاحب آپ کی بے ادبی ہوئی، معاف کیجئے گا۔قاری صاحب فرماتے ہیں کہ میں اس جملہ کو سن کر بس ذبح ہی تو ہوجاتا تھا۔

انوکھی دانائی:

ایک واقعہ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہ اپنی مجالس میں بکثرت بیان کرتے تھے۔خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ایک صاحب دل بزرگ جو زبردست عالم بھی تھے، مگر غریب

وفاقہ کش! ان کی خدمت میں ایک رئیس زادہ سبق پڑھا کرتے تھے، ایک روز صاحبزادے درس کے لئے حاضر ہوئے تو استاذ کے چہرے پر ضعف ونقاہت کے آثار نمایاں پائے، سمجھ گئے کہ کئی وقتوں کا فاقہ ہے، کھانا نہیں کھایا ہے، چہرے کی زردی فاقہ کی وجہ سے ہے، عرض کیا آج سبق پڑھنے کو جی نہیں چاہتا، اگر چھٹی کر دیں تو مہربانی ہوگی، یہاں صورت حال یہ تھی کہ آواز بھی پورے طور سے نہ نکل سکتی تھی، فوراً منظور فرمالیا۔ صاحبزادے گھر گئے اور عمدہ کھانے پکوائے اور خوان میں سجا کر خود اپنے سر پر رکھا اور لے کر حاضر خدمت ہوئے کہ تناول فرمالیں، استاذ بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں، مگر کھانے سے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ تم کو میرے فاقہ کا اندازہ ہو گیا تھا، جب تم یہاں سے رُخصت ہوئے ہو، اسی وقت میں سمجھ گیا تھا کہ تم ضرور کھانا لاؤ گے، اس کے بعد میری طبیعت میں انتظار سا پیدا ہو گیا تھا، اسی کا نام ''اِشراف'' ہے، اور حدیث میں اِشرافِ نفس کے بعد جو کچھ ملے اس کے قبول کرنے سے ممانعت وارد ہے، اس لئے باوجود سخت ضرورت کے معذور ہوں۔ اب صاحبزادے کی دانائی ملاحظہ فرمایئے، اصرار بالکل نہیں کیا، چپکے سے خوان اٹھایا اور چل دیئے۔ استاذ نے تو یہی خیال کیا کہ واپس لے گئے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد دیکھتے کیا ہیں کہ خوان لئے ہوئے پھر چلے آرہے ہیں، آکر نہایت لجاجت سے عرض کیا کہ حضرت اب تو انتظار ختم ہو گیا تھا، اب قبول فرمالیجئے، اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ان بزرگ کو کیسی مسرت ہوئی ہوگی، اور دل کی گہرائیوں سے کتنی دعائیں نکلی ہوں گی اور کیا ان دعاؤں اور قبولیت کے درمیان کوئی حجاب رہا ہوگا؟ سبحان اللہ! اسے دانائی کہتے ہیں۔

خاک ڈالو لاکھ روپئے پر:

حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی ایک مرتبہ مجلس میں عشق الٰہی کا بیان نہایت جوش وخروش کے ساتھ کر رہے تھے، طبیعت پر خوشی ونشاط کا اثر ظاہر ہو رہا تھا، موقع پا کر ایک صاحب نے عرض کیا حضرت نواب صاحب رامپور فرما رہے تھے کہ ہمارے یہاں اس وقت کے تمام اہل فضل وکمال تشریف لا چکے ہیں، بس ایک حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب ابھی تک تشریف نہیں لائے ہیں اگر وہ کبھی قدم رنجہ فرمائیں تو انھیں ایک لاکھ روپیہ نذر میں پیش کرونگا۔ حضرت نے بڑی بے نیازی کے ساتھ فرمایا کہ خاک ڈالو لاکھ روپئے پر، اور داستان عشق ومحبت سنو۔ (حیات مصلح الامت ۳۰۹)

حاشیہ

(۱) حضرت پر بعض اوقات کچھ ایسی کیفیات کا ورود ہوتا تھا، جس کا ادراک کسی کو نہ ہوسکا، جذب وجلال کی ایک خاص شان ہوتی۔ یہ کیفیت مجلس میں بھی طاری ہوتی، تو حضرت کے قریب جو لوگ ہوتے حضرت والا کا ہاتھ ان کے سروں اور کندھوں پر پڑنے لگتا، ناواقف سمجھتے کہ مار رہے ہیں، واقفین سمجھتے کہ فیضانِ باطنی کی ایک راہ یہ بھی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

(ماخوذ۔از۔کھوئے ہوؤں کی جستجو)

حضرت مولانا عیسیٰ صاحب نوراللہ مرقدہ کے واقعات

تشابہ اختیار کرنے کی برکت:

حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب مدظلہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت مولانا عیسیٰ صاحب نوراللہ مرقدہ کہیں تشریف لے جارہے تھے کئی لوگ ساتھ میں تھے، میں نے کسی موقع پر عرض کیا کہ حضرت جب گفتگو کرتے ہیں، جب چلتے ہیں یا اور بھی کوئی کام کرتے ہیں تو بے ساختہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یاد آجاتے ہیں، حضرت کا ہر کام حضرت تھانویؒ کے بالکل مشابہ ہے۔قاری صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ عرض کیا اور حضرت تھانویؒ کا نام ان کے کان میں پڑا تو وہیں رُک گئے اور ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھے اور میری طرف رخ کر کے فرمایا: ''جی ہاں! ابتداءً میں نے بہ تکلف حضرتؒ کی نقل کی پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی رنگ میں ڈھال دیا''۔

جماعت کا اہتمام:

حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا الہ آباد پنشن لینے آتے تو ایک خاص جگہ ٹھہرا کرتے اور قاری صاحب کو اپنی آمد کی اطلاع کرتے ، یہ ان کی خدمت میں پہونچ جاتے ،مولانا خیریت دریافت کرنے کے بعد پہلا سوال یہ کرتے کہ نمازوں کی جماعت کے اوقات کیا کیا ہیں؟ پھر ہر نماز سے پانچ منٹ پہلے مسجد میں آجاتے حالانکہ قاری صاحب کی مسجد آپ کی قیام گاہ سے کافی فاصلہ پر تھی ،مگر اہتمام سے ہر نماز سے پہلے مسجد میں آپہونچتے ، جماعت کی نماز سے حضرت مولانا کو عشق تھا، آپ کی ہر مجلس میں نماز کی تاکید کا ذکر ضرور آتا۔

اتباع سنت کا اہتمام اور اس کی برکت:

پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت مولانا الہ آباد پنشن لینے آتے تھے، ایک بار تشریف لائے اور حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب مدظلہٗ حاضر ہوئے تو فرمایا ''جتنی اختیاری سنتیں ہیں سب پر اپنے اختیار سے اہتمام کے ساتھ عمل کرتا رہا ہوں مگر ایک سنت غیر اختیاری ہے، جی چاہتا ہے کہ اس پر بھی عمل ہو جائے، وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ۶۳ ر سال کی عمر میں ہوا ہے، میں چاہتا ہوں کہ ۶۳ ر سال میں میرا انتقال ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے لئے یہ آسان ہے کہ اس پر بھی عمل ہو جائے، ان پر فالج کا اثر ہوا اور اس کے بعد وقفہ وقفہ سے دو تین بار حملہ ہوا، بالآخر ۶۳ ر سال کی عمر میں وصال فرمایا۔ ایک سچے متبع سنت نے دل سے جو بات چاہی تھی اللہ تعالیٰ نے اسے پورا کر دیا۔ ؎

او چنیں خواہی خدا خواہد چنیں   می دہد یزداں مرادِ متقیں

☆☆☆☆☆☆

(ماخوذ۔از۔کھوئے ہوؤں کی جستجو)

حضرت مولانا قاری صدیق صاحب نور اللہ مرقدہ کے واقعات

دینی تڑپ:

ایک نورانی چہرہ، سفید داڑھی، اس میں قدرے سیاہ بال، آنکھیں بڑی بڑی شب بیداری کے اثر سے مخمور سی، نگاہیں جھکی ہوئی بلکہ گردن ہی تواضع سے خمیدہ۔ سر پر پنچ کلیا ٹوپی، لمبا کرتا، موزوں قد، گورا رنگ، خاموش خاموش سے، مصافحہ کیا اور قدرے توجہ سے کیا، پھر لوگوں کے ہجوم میں باہر تشریف لائے اور آہستہ آہستہ خانقاہ شریف کی طرف بڑھنے لگے اور لوگ روک روک کر مصافحہ کرتے رہے، میں بھی پیچھے پیچھے قدم بہ قدم تھا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ میری پہلی ملاقات ہے، مجھ سے کچھ انھیں واقفیت نہ ہوگی، ایک نوجوان اور گمنام مدرس کو وہ کیا جانتے ہوں گے، مگر کچھ دور چلنے کے بعد جب خانقاہ شریف قریب آئی اور لوگوں کا ہجوم کم ہوا، تو اچانک پیچھے متوجہ ہوئے، اور اس گنہ گار کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو قدرے ہٹ گئے اور آہستہ آہستہ کچھ فرمانے لگے، میں نے بغور سننے کی کوشش کی، فرمار ہے تھے کہ آج کل بہت سخت ضرورت ہے کہ دین کی خدمت کی جائے، آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی صلاحیتیں بخشی ہیں، پڑھانے کی، تقریر کرنے کی، لکھنے کی، وغیرہ آپ اپنی سب صلاحیتیں دین کی خدمت کے لئے لگا دیجئے۔ یہ حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی نور اللہ مرقدہ تھے۔

تواضع و بے نفسی:

ایک روز مغرب کے بعد کچھ طلبہ آئے اور انھوں نے بتایا کہ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب ریلوے اسٹیشن پر ملے تھے، انھوں نے آپ کو سلام کہا ہے، اور فرمایا ہے کہ میں نے سلّم کی ایک شرح لکھی ہے۔ اس کے بعد آؤں گا تو اس کا مسودہ لے کر آؤں گا، مولانا اسے دیکھ لیں تو اسے

شائع کرادوں گا۔

میں نے تفصیل پوچھی تو بتایا کہ وہ ٹکٹ لینے کے لئے لائن میں کھڑے تھے، میں نے کہا کہ تم لوگ جب موجود تھے، تو یہ خدمت تم لوگوں نے کیوں نہیں انجام دی؟ کہنے لگے کہ ہم لوگوں نے بہت کوشش کی مگر حضرت راضی نہ ہوئے۔ فرمایا کہ میرے ساتھ لگے رہو اور باتیں کرتے رہو۔ اسی دوران دریافت کیا کہ مولانا کیا پڑھاتے ہیں؟ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ فلاں فلاں کتابیں اور اسی میں سلّم کا بھی ذکر آیا۔ اسی پر فرمایا کہ میں نے سلّم کی شرح لکھی ہے۔

میں حیرت میں پڑ گیا کہ مولانا کس قدر متواضع ہیں۔ میرے پوچھنے پر طلبہ نے بتایا کہ سامان ساتھ میں کچھ نہ تھا، صرف ایک جھولا کپڑے کا تھا، جس میں شاید ایک جوڑا کپڑا تھا، ایک مصلیٰ تھا اور ایک لوٹا تھا، پاؤں میں جوتے نہ تھے چوڑے تسمہ کے ہوائی چپل تھے اور عام مسافروں کی طرح تنِ تنہا ٹکٹ لے رہے تھے، طلبہ نے اصرار کیا تو بھی اجازت نہ دی، البتہ ان کی خاطر یہ کیا کہ اپنے ساتھ لگا لیا اور افادات فرماتے رہے۔

اور ذرا، یہ بھی تواضع اور بے نفسی دیکھیں کہ ایک کہنہ مشق مدرس، جس نے نہایت محنت و کوشش سے اساتذۂ فن کے پاس علم حاصل کیا ہے اور بہترین استعداد بہم پہونچائی ہے پھر عرصہ سے اسی مشغلہ میں لگا ہوا ہے، اس نے فن منطق کے جامع مگر مشکل ترین متن کی شرح لکھی ہے، اور دکھانے کو کہہ رہا ہے ایک نو آموز مبتدی طالب علم کو! اور یہ بات ازراہِ تصنع نہ تھی، اور نہ از قبیل حوصلہ افزائی تھی، بلکہ واقعی یہی ان کا مزاج تھا کہ وہ خود کو چھوٹوں سے چھوٹا سمجھتے تھے۔

عبادت گزاری:

بنارس مظہر العلوم میں جلسہ تھا۔ میں اس وقت غازی پور میں مدرس تھا، شوق تھا کہ حضرت قاری صدیق صاحب کو غازی پور لاؤں، بنارس حاضر ہوا، امیدوار اور بھی تھے، لیکن حضرت کو محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی قدس سرہٗ کی خدمت میں پہونچنا تھا، میری درخواست منظور ہوگئی، کیونکہ غازی پور راستے میں ہے، ایک بجے کے بعد گاڑی وہاں سے نکلی غازی پور پہونچے تو صبح صادق ہونے میں ایک گھنٹہ باقی تھا اور لوگ تو سونے کے انتظام میں لگ گئے اور حضرت مسجد کے ایک گوشہ میں تہجد میں مشغول ہوگئے۔

عبادت گزاری:

جاڑے کا موسم تھا، ہم چار پانچ لوگ حضرت قاری صدیق صاحب کے ساتھ ایک کمرے میں آدھی رات کے بعد سوئے تھے، پروگرام یہ تھا کہ سویرے اٹھ کر اپنی فجر جماعت سے ادا کرکے بس پکڑنی ہے، میری آنکھ کھلی تو فجر کا وقت ہونے میں پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ پورا قافلہ سورہا تھا، میں سوچ رہا تھا کہ جگاؤں یا نہ جگاؤں؟ پھر فیصلہ کیا کہ نہیں جگاؤں گا، ان کا سونا دوسروں کے جاگنے سے افضل ہے، ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک صاحب کی آنکھ کھلی، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے، ان کے ہڑبڑانے سے حضرت مولانا بھی جاگ گئے، جاگنا تھا کہ بجلی کی تیزی سے بستر سے الگ ہوگئے اور اس نیت سے کہ ابھی بس اڈے جانا ہوگا، سب کے سامان سمیٹے اور فوراً مسجد چلے گئے، ہم لوگ بھی ذرا عجلت میں استنجاء ووضو سے فارغ ہوکر پہونچے تو دیکھا کہ حضرت مولانا ایک گوشے میں اطمینان سے نوافل پڑھ رہے ہیں، مجھے حیرت ہوئی کہ ان کے وقت میں کتنی برکت ہے!

خیر خواہی و دعا:

خدمت کی پہلی بنیاد دعا ہے اور حضرت قاری صدیق صاحب تو اللہ والے تھے ہی، بڑے اہتمام سے دعا کرتے تھے، بعض مرتبہ تو اس طرح دعا کرتے تھے کہ جس کیلئے دعا کرتے تھے اسے معلوم بھی نہ ہوتا اور مولانا اللہ تعالیٰ سے دعا کرکے اس کا کام پورا کرادیتے۔ ایک چھوٹی سی بستی میں پردھانی کا الیکشن تھا، اس جگہ عدد کے اعتبار سے مسلمان کم ہیں مگر وجاہت کے اعتبار سے یہی غالب ہیں، لیکن اب آزادی اور بے راہ روی کا زور ہے، اندیشہ تھا کہ غیر مسلم پردھان ہوجائے گا تو مسلمانوں کو نقصان پہونچے گا، پردھانی کیلئے ایک بااثر ہندو اور ایک فارغ دیوبند مولوی صاحب امیدوار تھے، اللہ کا کرنا کہ خلاف توقع مولوی صاحب اچھے ووٹوں سے کامیاب ہوئے، انھیں پردھان کی معیت میں میری حاضری حضرت کی خدمت میں ہوئی، میں نے عرض کیا کہ حضرت! یہ پردھان صاحب ہیں، حضرت کا چہرہ کھل اٹھا، فرمایا کہ مجھے کسی ذریعہ سے معلوم ہوگیا تھا کہ یہ پردھانی کے امیدوار ہیں۔ میں ان کیلئے برابر دعا کررہا تھا کہ یہ جیت جائیں، اللہ کا شکر ہے، پھر ان کو نصیحتیں کرنے لگے۔

ان مولوی صاحب نے حضرت کونہیں بتایا تھا، لیکن حضرت کوازخود فکر ہوئی اور بالآخران کی دعا سے کامیاب ہوگئے، حالانکہ امید کامیابی کی نہیں تھی۔

خیر خواہی و دعا:

میرے منہ کے اندر تالو میں ایک پھوڑا بہت پرانا تھا، اس میں کوئی تکلیف نہ تھی بس تھوڑا سا ابھرا ہوا تھا اور شاید بیس سال سے زیادہ سے تھا مگر کبھی علاج کی طرف توجہ نہیں ہوئی۔ اخیر میں اس سے کبھی کبھی پانی نکلنے لگا، تکلیف اب بھی نہ تھی مگر پانی کی وجہ سے شبہہ ہوا کہ اس کی وجہ سے وضو باقی رہے گا یا ٹوٹ جائے گا؟ ڈاکٹروں کو دکھایا تو بتایا کہ پھوڑا ہے، ایکسرے کروایا تو معلوم ہوا کہ تین دانت اندر سے متاثر ہیں، انھیں نکالنا پڑے گا، آپریشن قدرے دقت طلب ہے۔ میں اس کے علاج کے لئے بمبئی چلا گیا۔ اپنے بزرگ کرم فرما قاری ولی اللہ صاحب مدظلہٗ کی وساطت سے میں دانتوں کے سب سے بڑے ڈاکٹر کے پاس پہونچا دیا گیا۔ اس نے ساری تفصیل سنی، معائنہ کیا پھر ایکسرے کروایا۔ بہت پرانا پھوڑا ہونے کی وجہ سے وہ تذبذب میں تھا۔ دس پندرہ دن کی تحقیق وکاوش کے بعد اطمینان ہوا کہ صرف پھوڑا ہی ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ میں آپریشن کروں گا تو ۳۰/ ہزار روپے کے قریب صرف ہوں گے۔ فلاں اسپتال میں چلے جائیں وہاں بہت کم میں آپریشن ہوجائے گا۔ میرے بھیونڈی کے دوستوں نے مخالفت کی اور کہا کہ بھیونڈی چلئے وہاں ایک مسلمان ڈاکٹر دانتوں بہت کا ماہر ہے، اسے دکھایا جائے، بھیونڈی آکر اسے دکھایا تو اس نے اولاً تو کہا کہ بے ہوش کرکے آپریشن کرنا ہوگا مگر عین آپریشن کے دن اس کی رائے یہ ہوئی کہ بغیر بے ہوش کئے محض اوپر کے جبڑے ماؤف کرکے آپریشن کردیا جائے، میں تو یہی چاہتا تھا، دو گھنٹے میں آپریشن کا عمل مکمل ہوا۔ بحمد اللہ آرام سے آپریشن ہوا اور کامیاب ہوا۔

واپسی کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت مولانا قاری صدیق صاحب کو میرے بمبئی جانے اور پھوڑے کا علم کسی ذریعہ سے ہوگیا تھا۔ وہ مضطرب تھے، ان کے ایک خصوصی عقیدت مند جو مجھ پر بھی کرم کرتے ہیں وہ مجھے بتارہے تھے کہ حضرت نے آپ کے متعلق پوچھا، میں نے لاعلمی ظاہر کی تو حضرت نے ناخوشی کا اظہار کیا کہ ان کے حالات سے باخبر رہنا چاہئے، اب معلوم ہوا کہ مشکل

معاملہ نہایت آسانی سے کیونکر حل ہوا؟ اس طرح حضرت مولانا لوگوں کی خدمت غائبانہ حاضرانہ دعاؤں کے ذریعہ کیا کرتے تھے۔

بخشش وعطیہ:

ایک بار چند دوستوں کے ساتھ حضرت مولانا قاری صدیق صاحب کے یہاں حاضری ہوئی، ان میں سے ایک صاحب نے راستے میں مجھ سے فرمائش کی کہ اگر حضرت آپ کو کچھ عنایت فرمائیں تو وہ مجھے دے دیجئے گا میں اسے بہ نیتِ برکت محفوظ رکھوں گا۔ میں نے کہا وہ زمانہ چلا گیا، اب میں آپ لوگوں کے خرچ پر جاتا ہوں تو حضرت کی طرف سے عطیہ کا سلسلہ بھی موقوف ہوگیا ہے۔ بات ختم ہوگئی۔ حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی، ہم لوگ ایک پرائیویٹ گاڑی سے گئے تھے، یہ وہم بھی نہ تھا کہ حضرت کی طرف سے کچھ بخشش ہوگی، چوبیس گھنٹے قیام رہا، جب حضرت سے رُخصت ہوکر گاڑی پر بیٹھ گئے اور گاڑی اسٹارٹ ہوگئی تو اچانک ایک صاحب دوڑے ہوئے آئے کہ حضرت بلا رہے ہیں۔ میں سوچنے لگا کہ کیا خاص بات ہے، اتر کے تیزی سے گیا، حضرت ایک طرف لوگوں سے کچھ فاصلہ پر تنہا کھڑے تھے، جیب میں ہاتھ ڈالا اور ۱۰۰/روپئے کا نوٹ نکال کر دینے لگے کہ اس سے گاڑی میں تیل ڈلوا لیجئے گا، میں نے معذرت کی کہ حضرت اس کی ضرورت نہیں ہے، حضرت اصرار فرما رہے تھے اور میں معذرت کر رہا تھا، حضرت نے فرمایا لے بھی لیجئے، اس پر اچانک راستے والی بات یاد آئی جس کی مجھ سے فرمائش ہوئی تھے، میری روح وجد میں آگئی، اللہ اکبر! کہاں کی بات کہاں تک آپہونچی؟ میں نے جھٹ وہ نوٹ لے لیا اور اسی طرح لئے ہوئے ان صاحب کے حوالے کر دیا کہ لیجئے آپ کی نیت وخواہش پوری ہوگئی، خلاف توقع اور خلاف معمول حضرت نے یہ روپیہ اب کی بار عنایت فرمایا ہے۔ حضرت کے یہاں بخشش وعطایا کے قصے چلتے ہی رہتے تھے۔ نہ جانے کتنے لوگ اس کے شاہد ہوں گے۔ حضرت اقدس کے قلب وروح میں حب مال یا حب جاہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

تواضع وفروتنی:

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد! حضرت اقدس قاری صدیق صاحب نے زندگی بھر اپنے کو خادم بنائے رکھا۔ اتنے عالی مرتبہ ہونے کے باوجود کبھی اس کا احساس نہیں ہوا کہ وہ بھی کوئی مرتبہ

رکھتے ہیں اوراس مرتبہ کے کچھ تقاضے بھی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب پہلی حاضری ہوئی تھی تو رات کے اخیر میں استنجا کے لئے بیدار ہوا، اور لوٹا لے کے آگے بڑھا کہ نل سے پانی لوں، چند قدم چلا تھا کہ تیزی سے ایک سایہ آتا ہوا محسوس ہوا، دیکھا تو حضرت تھے انھوں نے میرے ہاتھ سے لوٹا لے لیا کہ آپ کو معلوم نہیں ہوگا کہ نل کہاں ہے؟ میں پانی لا دیتا ہوں، میں ہکا بکا ہو گیا، پھر میں نے بڑی لجاجت سے عرض کی کہ مجھے معلوم ہے کہ نل کہاں ہے؟ میں گنہ گار تو ہوں مزید گنہ گار نہ بنایئے، خیریت گزری کہ حضرت کو ترس آ گیا اور لوٹا مجھے دے دیا۔ اسی سفر میں دیکھا کہ تمام خدام سامنے موجود ہیں، حضرت نے فرمایا کہ فلاں جگہ مہمانوں کے لئے پلنگ بچھا دیجئے اور جب تک کوئی پہونچتا حضرت خود ہی پہونچ کر پلنگ بچھانے لگے، خدام دوڑے اور حضرت سے پلنگ لے لی۔

عجب شان تھی اس مرد خدا کی:

خدمت کا ایک اور انداز ملاحظہ ہو، حضرت تو پیکر جمال تھے جدھر دیکھئے حسن عمل کا ایک جلوہ دکھائی دیتا تھا۔ میری پہلی حاضری حضرت مولانا جامی صاحب کے ساتھ ہوئی تھی، اس موقع پر حضرت نے باندہ کی ایک وسیع مسجد میں ہم لوگوں کے وعظ کا انتظام کیا تھا۔ جاڑے کا موسم تھا، شب میں گیارہ بجے کے قریب وعظ ختم ہوا، بارہ بجے ٹرین کا وقت تھا، ہم لوگوں نے پروگرام بنایا کہ ذرا چائے وغیرہ پی کر اسٹیشن چلیں، حضرت نے فرمایا کہ ٹرین کا کچھ ٹھیک نہیں کہ کب آئے؟ جاڑے کی رات ہے آپ لوگ پریشان ہوں گے، میں اسٹیشن جا کر معلوم کر کے آتا ہوں کہ وہ لیٹ تو نہیں ہے؟ ہم لوگ حیران کہ یا اللہ! آپ جائیں گے، ہاں ہاں میں جا کے ابھی معلوم کر کے آجاتا ہوں، ہمارے ساتھ حافظ سرور بھی تھے جو حضرت کے بہت چہیتے شاگرد ہیں اور بے تکلف بھی، حافظ سرور نے کہا کہ حضرت میں جا کر معلوم کر کے آتا ہوں، فرمایا تم سے نہیں بنے گا، میں ہی جا کر معلوم کروں گا، حافظ سرور نے کہا کہ ایک سائیکل منگوا دیجئے، فوراً چلا جاتا ہوں، سائیکل آ گئی، حافظ سرور صاحب نے اس پر سوار ہونا چاہا تو حضرت نے فرمایا کہ مجھے بھی بٹھا لو، سائیکل میں پیچھے کیریر نہیں تھا، حضرت آگے ہی سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھ گئے اور اسٹیشن گئے اور تھوڑی دیر میں معلوم کر کے آ گئے، فرمایا کہ گاڑی وقت پر ہے، لیکن آپ لوگ آرام کر لیجئے، صبح بس سے چلے جایئے گا۔ پھر یہ بات طے ہو گئی، واللہ عجب شان تھی اس مرد خدا کی۔

عندالناس محبوبیت:

میں نے حضرت کو شہروں میں بھی دیکھا، قصبات میں بھی دیکھا، چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بھی دیکھا، لوگ پروانہ وار ٹوٹے پڑتے تھے جیسے دلوں میں کسی نے پھونک دیا ہو کہ یہ شخصیت گو کہ تمہارے درمیان ہے مگر یہ کچھ اور ہی شے ہے۔ یہ مقبولیت مسلمانوں میں تو تھی ہی ان سے آگے بڑھ کر ہندوؤں میں بھی بڑی محبوبیت تھی۔ باندہ میں سنا کہ ہندو انھیں چھوٹا بھگوان کہتے تھے، میں نے یہ منظر خود دیکھا ہے کہ بڑے بڑے ذی وجاہت ہندو حاضر خدمت ہیں اور جتنی دیر وہ ہیں ہاتھ جوڑے ہوئے ہیں، حضرت منع فرماتے تو وہ ہاتھ نیچے کر لیتے مگر جوڑے ہی رہتے۔

شروع میں مدرسہ سے دو تین کلومیٹر کچا راستہ تھا، ایک بار ہمارے قافلے کو جس میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامؔی علیہ الرحمہ تھے، رُخصت کرنے کے لئے حضرت باندہ تک کے قصد سے نکلے۔ قبیل مغرب کا وقت تھا سب لوگ پیدل چل رہے تھے، طلبہ کا ہجوم بھی ساتھ تھا، ایک غیر مسلم بوڑھا بیل گاڑی پر چنوں کے پودوں کا ڈھیر لاد کر لا رہا تھا، بیل چل رہے تھے اور وہ بوڑھا اس ڈھیر کے اوپر لیٹا ہوا تھا۔ بیل گاڑی جب آگے بڑھی تو اسے احساس ہوا کہ حضرت ہیں تو بے اختیار اسی ڈھیر پر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور جب تک حضرت دور نہیں نکل گئے اسی طرح ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔

ہم لوگ جب سڑک کے قریب پہونچے ابھی دو تین فرلانگ کا فاصلہ باقی تھا کہ ایک بس مین روڈ سے باندہ کی طرف جاتے ہوئی نظر آئی، ڈرائیور کو احساس ہوا کہ حضرت ہیں، اس نے بس کو روک دیا اور منتظر رہا، حضرت نے فرمایا کہ سڑک پر پہونچ کر مغرب کی نماز ادا کی جائے گی، حضرت نے اشارہ کیا کہ تم چلے جاؤ مگر وہ کھڑا رہا پھر جب حضرت کا اشارہ مسلسل اس نے دیکھا اور اسے سمجھ میں آ گیا کہ یہ لوگ کچھ دیر ٹھہر کر نماز پڑھیں گے تو وہ روانہ ہوا، جیسے ہی ہم لوگ سڑک پر پہونچے ایک دوسری بس آ کر رکی، اسے بھی حضرت نے رُخصت کیا، نماز اطمینان سے پڑھی گئی، نماز سے فارغ ہونے کے تھوڑی دیر بعد تیسری بس آئی وہ بھی ٹھہری، حضرت اس بس میں سوار ہوئے، بس چلی، کنڈکٹر حضرت کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا، حضرت اس کو کرایہ دینے لگے کل سات آدمی تھے، اس نے ہاتھ جوڑ کر بڑی لجاجت سے کہا صرف آپ کا آشیرواد چاہئے، حضرت نے بہت اصرار کیا مگر اس نے کسی قیمت پر کرایہ لینا منظور نہیں کیا، اس نے یہ بھی کہا کہ گاڑی کے مالک

کا یہی حکم ہے۔

جب باندہ شہر پہونچے اور گاڑی سے اترے تو رکشہ والوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا کہ ہتھورا والے بابا ہیں، بہت سے رکشہ والے دوڑ پڑے اور انھوں نے بھی کسی طرح کرایہ لینا منظور نہیں کیا۔

عبادت کا ذوق:

ساری رات سفر کیا ہے، سڑک پر گاڑی کے ہچکولوں سے ہڈیاں چور چور ہیں، تکان سے بے حال ہیں نیند کی وجہ سے آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں، منزل پر پہونچتے ہیں تو تہجد کا وقت ہے، رفقاء سب خوابگاہ ڈھونڈھ رہے ہیں، بستروں پر گر رہے ہیں، اور حضرت لوٹا تلاش کر رہے ہیں، وضو کر رہے ہیں، اور پھر نماز میں اس طرح مشغول ہو جاتے ہیں، جیسے نہ انھوں نے سفر کیا ہے، نہ انھیں کوئی تکان ہے۔

ایک بار ایک مدرسہ کے جلسہ میں ۱۲/ بجے رات تک شریک رہے، وہاں سے اٹھے تو ایک صاحب اپنے گھر لے گئے، وہاں سے گاڑی پر بیٹھے تو دو بجے رات کو دوسرے صاحب اپنے گھر لے گئے، حضرت کی دلداری ہے کہ ہر ایک کے گھر بے تکلف جا رہے ہیں، پھر اٹھے تو ڈیڑھ گھنٹے گاڑی پر چل کر ایک قصبے میں پہونچے، سارا قصبہ چشم براہ تھا، لوگ انتظار اور شوق میں رات بھر سوئے نہیں تھے، ایک قافلہ قصبے سے ایک کلومیٹر پہلے منتظر تھا، حضرت کی گاڑی گزر گئی، وہ لوگ دوڑ پڑے، اور بھی قافلے جگہ جگہ راستہ دیکھ رہے تھے، حضرت قصبے کے اندر پہونچے تو پورا قصبہ مصافحہ کے لئے ٹوٹ پڑا، کہا گیا کہ مصافحہ بعد میں ہوگا۔ ابھی حضرت کو تھوڑی دیر آرام کرنے دیں۔ لوگ رک گئے، حضرت کمرے کے اندر تشریف لے گئے، باہر عشاق کا ہجوم تھا۔ حضرت نے ایک رفیقِ سفر سے کہا کہ مجھے تھوڑی مہلت مل جاتی، رفیق سفر نے کہا کہ حضرت آنکھ بند کر کے لیٹ جائیں، آگے میں سمجھا لوں گا، اتنا سنتے ہی حضرت بلا تامل اور بلا تاخیر لیٹ گئے، اب اس رفیق نے سمجھا کہ حضرت سو گئے ہیں۔ لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ اب دروازہ چھوڑ دیں، ہجوم ختم کر دیں لوگ ہٹ گئے اور حضرت واقعۃً نیند سے سو گئے، مگر شاید ۱۵/ منٹ گزرا ہو کہ حضرت تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے، وہ رفیق سفر ہکا بکا ہو گئے، حضرت آرام کیجئے، مگر اب آرام کہاں، وضو کیا، اور ہاتھ باندھ کر نماز میں مشغول ہو گئے۔

☆☆☆☆☆☆

(ماخوذ۔از۔کھوئے ہوؤں کی جستجو)

حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی نوراللہ مرقدہ کے واقعات

کسی کا دیکھ لینا درد کا کافور ہو جانا:

ایک بار ہم تین آدمی حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی کی خدمت میں حاضری کی نیت سے چلے۔الہ آباد پہونچ کر حضرت کی قیام گاہ کی طرف جاتے ہوئے ہمارے ایک ساتھی کے سینے میں درد شروع ہوا، سخت بے چینی اور گھبراہٹ پیدا ہوئی ،تھوڑی دور چل کر انھوں نے کہا کہ بجائے مولانا کے یہاں جانے کے مجھے اسپتال لے چلئے ،ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ اس وقت شاید حضرت کی خدمت میں حاضری نہ ہو سکے گی ،راستہ میں ڈاکٹروں کی تلاش ہونے لگی ،مگر وقت ایسا تھا کہ زیادہ تر مطب بند تھے ، ہم نے کوشش کی کہ کسی طرح حضرت کی خدمت میں پہونچ جائیں ،وہاں مشہور معالج ڈاکٹر ابرار احمد صاحب ملیں گے ان سے دوا لے لی جائے گی ،خیر بہزار دقت وہاں پہونچے ،مولانا مجلس میں تشریف فرما تھے ، دو تین آدمی اور وہاں موجود تھے، بندہ نے سلام ومصافحہ کرتے ہی ان کا حال عرض کیا ،اس وقت مریض کا چہرہ پُرسکون ہو چکا تھا ،حضرت نے بیتاب ہوکر پوچھا کیا اب بھی درد ہے؟ اور دو تین مرتبہ پوچھا پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر دم کیا ،آنکھیں بند کر کے خاموشی سے دعا کی اور معاً ڈاکٹر صاحب کو بلوایا لیکن اب مریض کو ڈاکٹر اور دوا کی ضرورت نہ تھی ،بعد میں انھوں نے بتایا کہ جیسے ہی میں نے داہنا قدم حجرۂ مبارکہ میں داخل کیا ابھی زمین پر رکھا بھی نہ تھا کہ یکا یک درد بالکل کافور ہو گیا ،ذرا بھی تکلیف باقی نہ رہی ،مولانا ہی کا شعر ہے۔ ؎

جو ہیں اہل محبت بس وہی اس کو سمجھتے ہیں کسی کا دیکھ لینا درد کا کافور ہو جانا

مولانا رحمتِ مجسم تھے، پیکر کرم تھے، ہر کس وناکس پہ یہ ابر رحمت برستا تھا، ہر دکھیارا ان

کے پاس پہونچ کر خود کو امان میں پاتا تھا، مولانا فرماتے ہیں۔

رحمت کا ابر بن کے جہاں بھر میں چھائیے عالم یہ جل رہا ہے برس کر بجھائیے

بے تکلفی وسادگی:

ملک کے ایک لیڈر جو عالم بھی تھے اور مسلمانوں کی خدمت میں ممتاز تھے، ایک بار مولانا محمد احمد صاحب کی خدمت میں آئے اور نیاز مندانہ آئے، اس وقت ان کی خدمات کا چرچا تھا، چونکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی بہی خواہی میں کوشاں تھے، اس لئے مولانا ان کے سامنے بچھے جارہے تھے، بے حد اکرام، بہت محبت، اور بہت دعائیں پیش کررہے تھے، پھر جب وہ رخصت ہونے لگے تب تو مولانا نے غضب ہی کردیا، تمام مریدین ومتوسلین کے سامنے لپک کر ان کی جوتیاں سیدھی کردیں، پورا مجمع سکتہ میں آگیا، وہ لیڈر بھی سخت پریشان اور پشیمان ہوئے، لیکن مولانا اس طرح مطمئن تھے، جیسے اپنا ضروری فرض انجام دیا ہو۔

بزرگوں کی نظر کا اثر:

ہمارے ایک دوست ہیں، صاحب استعداد اور ذی علم، طبیعت مناظرانہ پائی ہے، گمراہ فرقوں کا کامیاب تعاقب کرتے ہیں، ایک بار بہائی فرقہ کے کچھ لوگوں سے الجھ گئے اور ان کے دفتر میں جاکر للکار آئے، جب وہاں سے واپس آرہے تھے تو انھیں اپنے دل میں بڑا تغیر محسوس ہوا، ایسا لگتا تھا جیسے ایمان رخصت ہورہا ہے، وساوس کا ہجوم تھا، قلب ظلمات میں گھر گیا تھا یہ پریشان ہوگئے، سیدھے مولانا محمد احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، مولانا نے ایک نظر ڈالی اور سلام کا جواب دیا، پھر انھوں نے مصافحہ کیا، بس اتنے ہی سے دل روشن ہوگیا، تمام وساوس کافور ہوگئے۔

عالم ربانی:

الہ آباد میں انجمن اتحاد المسلمین کا پہلا جلسہ منصور پارک میں منعقد ہوا، اس میں، میں بحیثیت واعظ مدعو تھا، سعادت کے پیش نظر اور عادت کے مطابق سیدھا حضرت اقدس کی خدمت میں پہونچا، حضرت نے بڑی نوازش فرمائی، عشاء کی نماز کے بعد جلسہ میں تقریر کرنے سے پہلے پھر درخواست دعا کے لئے حاضر ہوا، حضرت نے دعائیں دے کر رخصت کیا، وعظ شروع ہوا تو

تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ حضرت بنفس نفیس تشریف لائے، آپ کو آتا دیکھ کر منتظمینِ جلسہ کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی، اور میں رُعب کی وجہ سے خاموش ہو گیا، فرمایا کہ آپ وعظ جاری رکھئے، میں سنوں گا، حضرت کی مرضی پا کر میں نے وعظ شروع کیا، اتحاد و اتفاق بین المسلمین پر وعظ ہوا، وعظ ختم ہوا تو حضرت تشریف لے گئے، دوسرے روز جب بعد نمازِ فجر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، تو بعض لوگ بشارت دینے لگے کہ حضرت والا آپ کے وعظ سے بہت خوش ہوئے ہیں، میں خدمت میں پہونچا تو حضرت کا چہرۂ مبارک گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا، حاضرین مجلس سے خطاب کر کے فرمایا کہ ''رات میں نے ایک عالمِ ربانی کا وعظ سنا'' اور پھر دعائیں دینے لگے۔

☆☆☆☆☆☆

’’کھوئے ہوؤں کی جستجو‘‘ سے متفرق واقعات (۱)

تحمل وبردباری:

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب کا صبح کو گھر کے اندر سے تشریف لانے کا ایک خاص وقت متعین تھا، ہم لوگ اور ہماری طرح کئی لوگ اس وقت سے ذرا پہلے مکان کے باہر وسیع صحن میں حاضر تھے، تھوڑی دیر میں حضرت باہر نکلے، آتے ہی پورے صحن میں ایک طائرانہ نگاہ ڈالی، ایک طرف ذرا فاصلہ پر ایک شخص بظاہر نہایت معمولی حیثیت کا، بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے الگ تھلگ بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت سیدھے اس کی طرف بڑھے، وہ دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ ہم نے دور سے دیکھا کہ حضرت بعد سلام ومصافحہ کے اس سے کچھ باتیں کرتے ہوئے نشست گاہ کی طرف تشریف لا رہے ہیں، دروازے کے قریب پہونچ کر اس سے پوچھا کہ کوئی کام ہے؟ اس نے نفی میں جواب دیا۔ مقصد صرف زیارت وملاقات بتایا، حضرت کمرے میں داخل ہوئے تو پھر اس سے پوچھا، اس نے اب بھی وہی جواب دیا، پھر آپ اپنی جگہ بیٹھ گئے، اور کچھ علمی باتیں کرنے لگے۔ قدرے وقفہ کے بعد پھر اس سے دریافت کیا کہ کوئی کام ہے؟ اس نے پھر نفی میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا بہت اچھا ملاقات ہوگئی، اب رخصت! یہ کہہ کر آپ نے مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ اب اس نے کہا کہ ایک تعویذ چاہئے، آپ نے فرمایا، بھائی میں نے کتنی بار آپ سے پوچھا، مگر آپ نے کچھ نہیں کہا، پھر میری طرف مخاطب ہوئے کہ کیا کریں، یہ حال ہے، لیکن اسے برداشت کرنا ہے، پھر اسے تعویذ عنایت فرمایا۔

بلا تردد مدد:

بعد عصر کی ایک شخص میلے کچیلے کپڑے پہنے، بے ہنگم صورت آیا، اور سلام کر کے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب سے لگ کر بیٹھ گیا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مسافر ہے اور سائل،

اپنے اہل وعیال کو لے کر کہیں دور سے آیا ہے، اور کہیں آگے جانا ہے، پیسے ختم ہو گئے ہیں، آپ نے اس کی پوری بات توجہ سے سنی، اور اس پر کوئی ردوقدح اور جرح نہیں کی، جیسا کہ عام طور سے ایسے اجنبی سائلوں سے کی جاتی ہے، آپ اس کی باتیں سن کر اٹھے، اور اندر جا کر ایک اچھی خاصی رقم لے کر تشریف لائے اور قدرے جھک کر دونوں ہاتھ سے نہایت تعظیم سے اسے پیش کی، اور لجاجت سے فرمایا کہ یہ میری طرف سے آپ قبول کرلیں، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائیں، یہ فرما کر اسے رخصت کیا۔

واللہ عجب شان ہے ان مردان خدا کی:

مولانا نفیس اکبر صاحب، حضرت اقدس کے قدیم ترین تلامذہ میں ایک نہایت بزرگ ہستی ہیں، وہ شروع ہی سے حضرت کے ساتھ ہیں، حضرت کے مدرسہ کے ابتدائی طالب علم اور پھر فراغت کے بعد وہیں مدرس ہیں، انھوں نے مدرسہ کا ہر دور دیکھا ہے، معلوم ہے کہ مدرسہ اپنے آغاز میں چند جھونپڑیوں پر مشتمل تھا، یہ جھونپڑیاں خود حضرت اقدس اور طلبہ مل کر بناتے تھے، بعد میں جب طلبہ بڑھے تو ضرورت ہوئی کہ کوئی مستقل تعمیر مدرسے کی ہو۔ ابتداءً تجویز ہوئی کہ چھ کمرے بنالئے جائیں۔ حضرت نے مولانا نفیس اکبر صاحب کو جو اس وقت مدرس ہو چکے تھے اور ان کے ساتھ دو اور صاحبوں کو کان پور بھیجا، وہاں حضرت مفتی محمود الحسن صاحبؒ اس وقت جامع العلوم میں مفتی اور شیخ الحدیث تھے، یہ لوگ حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں پہونچے، مدعا بیان کیا کہ مدرسے میں چھ کمرے بننے تجویز ہوئے ہیں، ایک کمرہ ہزار روپئے میں تیار ہوگا حضرت کوئی تحریر عطا فرمادیں اور اہل خیر کو اشارہ فرمادیں تو چھ ہزار روپئے جمع ہو جائیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے سن کر فرمایا کہ یہیں ٹھہرو، کھانا کھاؤ پھر بتاؤں گا، ان لوگوں نے دوپہر کا کھانا کھایا، حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ مولوی صدیق صاحب سے کہو کہ چندے کی فکر نہ کریں، یہ کہہ کر انھوں نے چھ ہزار روپئے نکالے اور ان حضرات کو دے کر واپس فرمادیا۔ اس مقدس اور بابرکت عطیہ سے ابتدائی چھ ابتدائی کمرے تعمیر ہوئے، اسی میں کا ایک کمرہ اخیر تک حضرت کی قیام گاہ رہا۔

تحقیق ومطالعہ کی عمر:

قصبہ بھتری ضلع غازی پور میں جمعیۃ علماء کی ایک کانفرنس تھی، اس میں قاضی اطہر

مبارک پوری صاحب تشریف لائے تھے، میرے ساتھ ایک ذی استعداد نو جوان عالم بھی تھے، جو مدرسہ دینیہ میں اس وقت مدرس تھے، قاضی صاحب سے ان کا تعارف ہوا، وہ ایک دن قاضی صاحب کے ساتھ رہے، انھوں نے اندازہ کرلیا کہ یہ عالم باصلاحیت ہیں، کسی وقت ان کو دیکھا کہ وہ ذکر بالجہر میں مشغول ہیں، قاضی صاحب نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ زمانہ علم میں پختگی پیدا کرنے اور مطالعہ میں انہماک کا ہے، ان سے کہو کہ تحقیق ومطالعہ کا اہتمام کریں، انھوں نے ذکر کی نفی نہیں کی، لیکن ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ اس انہماک میں کہیں علم سے نہ رہ جائیں۔

کلام الٰہی کی برکت:

مولوی کمال صاحب مرحوم دین کے گمنام خدمت گزاروں کے زمرہ کے ایک نادرۂ روزگار سپاہی تھے، صوبہ بہار کے ضلع دمکہ (سنتھال پرگنہ) کے ایک مخصوص خطے میں ان کی اصلاحی کوشش جاری تھی، ان کی اصلاحی کوششوں میں ایسے کئی مرحلے آئے، جو بہت نازک اور صبر آزما تھے مگر جب وہ ان سے عہدہ برآ ہوئے تو غبار چھٹ گیا، وہاں کے لوگوں سے سنا کہ اسی حلقے کے ایک قریبی موضع میں ایک شخص نسبتاً با اثر تھا، وہاں کے عام لوگوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے کچھ مال بھی زیادہ عطا فرمایا تھا، مولوی صاحب کے مخالفین میں وہ نمایاں تھا، اور اس کی مخالفت کی وجہ سے پورا گاؤں مولوی صاحب سے دور تھا، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کا اکلوتا بیٹا بیمار ہوا، وہ ٹی۔بی کے مرض میں مبتلا ہوا، اور وہ بھی ایسے دیہات میں، جہاں قریب میں کوئی قابل ذکر علاج کا انتظام نہیں، گھر والوں نے سمجھ لیا کہ یہ لڑکا ہاتھ سے گیا، حتی الامکان دوا وغیرہ کی گئی مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا، کسی نے مشورہ دیا کہ مولوی کمال الدین سے دعا کرائی جائے، مگر وہابی کو بلا کر اپنا ایمان کون خراب کرے؟ انکار کر دیا گیا، مگر بیٹے کی حالت گرتی گئی، بیٹے کی جان عزیز تھی، بہر حال مولوی صاحب سے کہا گیا کہ آ کر دم کریں، وہ بے چارے بے دم تھے، جھاڑ پھونک نہیں جانتے تھے، مگر یہ جانتے تھے کہ بیماری سے شفا دینا دوا کا کام نہیں اللہ کا کام ہے، اس لئے اللہ کا نام لے کر دم کرنے کیلئے پہونچ گئے۔ اور دم کرنے کا جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا، یوں کہئے کہ وہ خاص توفیق الٰہی تھی، بیماری سنگین، موت کا کھلا ہوا دروازہ، انھوں نے طے کیا کہ اللہ کے کلام سے اس دروازہ کو بند کرنا ہے، وہ مریض کے پاس بیٹھ گئے، حافظ نہ تھے، قرآن شریف کھول لیا اور تلاوت شروع کر دی تیس

پارے دن بھر میں پڑھ کر اس پر دم کیا اور یہ عمل ایک دن نہیں پورے چالیس دن کیا، چالیس دن کے بعد وہ بچہ ایسا ہوگیا، جیسے اسے کوئی بیماری ہوئی ہی نہ تھی بالکل تندرست ہو چکا تھا، میں نے جب اسے دیکھا تو وہ جوانی کی دہلیز پر تھا، اور اس کی صحت قابل رشک تھی، اسے تو جسمانی صحت حاصل ہوئی اور اس کے گھر والوں کو اللہ تعالیٰ نے رُوحانی صحت بخشی، وہی لوگ جوان کے شدید معاند تھے اب ان کے پُشت پناہ بن گئے۔

ایک دوسرے قریبی موضع میں ایک اور با اثر آدمی ان کا مخالف تھا، اور اس کی مخالفت بھی مؤثر ثابت ہورہی تھی، وہاں یہ حادثہ ہوا کہ اس کے نوجوان سولہ سال کے بیٹے کو سانپ نے ڈس لیا وہ شخص خود جڑی بوٹیوں کا معالج تھا، سانپ بچھو چونکہ اس علاقے میں بہت ہوتے ہیں، اس لئے اس کا ایک سے ایک علاج اور منتر جانتا تھا، مگر اپنے بیٹے پر اس کی سب تدبیریں فیل ہوگئیں، لڑکا بے جان ہوگیا، منکا (سر) ڈھلک گیا، کسی نے کہا کہ مولوی صاحب کو بلایا جائے، باوجود نہ چاہنے کے بیٹے کی جان کی خاطر انھیں بلایا، وہ آئے تو معاملہ بالکل دگرگوں تھا، زندگی کی کوئی علامت نہ تھی انھوں نے نیم کی ایک ٹہنی پتیوں سمیت لی اور اسے مریض کے جسم پر پھیرتے رہے، اور ایک آیت پڑھ پڑھ کر دم کرتے رہے، اور تقریباً تین گھنٹے تک دم کرتے رہے، یہ بڑا طویل اور صبر آزما کام تھا، مگر وہ یقین کی قوت تھی جوان سے یہ عمل کراتی رہی، اور بالآخر مریض تندرست ہوکر اٹھ بیٹھا، یہ ان کا ایسا احسان ہوا، بلکہ کرامت ہوئی کہ صرف وہ لڑکا اور اس کے اہل خاندان ہی نہیں بلکہ اطراف کے بیشتر لوگ ان کا دم بھرنے لگے، اور اس طرح اصلاح کی کوشش تیز تر ہوگئی۔

اللہ والوں کا رعب:

ایک اور عجیب واقعہ سنئے! اس واقعہ سے ان کے مخالفین ومعاندین میں ان کی دھاک بیٹھ گئی، اور وہ ان سے ڈرنے لگے، دنیاوی اعتبار سے اور دولت کے لحاظ سے وہاں ایک بڑا خاندان تھا، لیکن کمائی اس کی حرام کی تھی، سودخوری میں بدنام تھا۔ پورا خاندان دین سے دور تھا، اور دین داروں سے عناد رکھتا تھا، مولوی صاحب کی وجاہت بڑھتی دیکھی تو وہ گھرانا ان کا بدترین دشمن ہوگیا، اس کا ایک فرد جو اپنی غنڈہ گردی میں مشہور تھا اور ہمیشہ بندوق لئے رہتا تھا، اس سے سارا علاقہ کانپتا تھا، اس کو ان سے زیادہ چڑھ تھی، وہ ہمیشہ موقع کی تاک میں رہتا کہ ان کو ستائے، ایک

بار ایک قریبی ہاٹ میں جو ہفتہ میں ایک دن لگتی تھی، مولوی صاحب جارہے تھے، ہاٹ تک پہونچنے کے لئے تقریباً ایک میل تک غیر آباد زمین طے کرنی ہوتی ہے، یہ میدان ہی میں تھے کہ ایک طرف سے وہ شخص بھی بندوق لئے ہوئے آن پہونچا۔ تاحد نظر اس وقت کوئی آدمی نہ تھا، صرف یہی دونوں تھے، اس شخص نے بھری ہوئی بندوق کی نال ان کے سینے کی طرف سیدھی کر کے کہا کہ اچھا موقع ہے آج میں فتنہ کی جڑ ہی صاف کردوں، قریب تھا کہ وہ گولی چلا دے، انھوں نے قدرے چیخ کر کہا کہ ''مومن کی مثال تو موتی چور کے لڈو جیسی ہے کہ اگر ٹوٹ جائے تو بوندیاں ہیں اور بندھا رہے تو لڈو ہے اسی طرح مومن اگر مار دیا جائے تو شہید ہے اور بچ جائے تو غازی ہے، اس کا مرنا اور بچنا دونوں کامیابی ہے''۔ مولوی صاحب نے جب یہ بات کہی تو وہ ڈر گیا۔ اور بندوق جھک گئی یا چھوٹ کر گر گئی، اور، مولوی صاحب آہستہ آہستہ ہاٹ کی طرف چلے گئے، اور وہ بھی خاموشی سے بندوق لے کر اپنے گھر چلا آیا، اس واقعہ سے مولوی صاحب کی اور دھاک بیٹھ گئی

آپ کی تمام چیزوں میں بڑائی تسلیم مگر......:

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہ کی خدمت میں میرٹھ کے ایک شیخ الحدیث غالباً مولانا لائق علی صاحب تشریف لائے، بوڑھے آدمی تھے، حضرت سے ملے، مصافحہ ہوا، معانقہ ہوا اور اس کے بعد زور سے چیخ مار کر رونے لگے، حضرت ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے، ان کے اس بے تحاشا رونے سے حضرت متاثر ہوئے، چاہا کہ تھوڑی دیر کے لئے مولانا وہاں سے ہٹ جائیں، انیس بھائی موجود تھے، انھیں آہستہ سے اشارہ کر کے فرمایا کہ انھیں لے جاؤ اور چائے وغیرہ پلادو، انیس بھائی کہتے تھے کہ میں انھیں حضرت کے پاس سے اٹھالایا، گریہ کا طوفان تھم چکا تھا مگر سسکیاں باقی تھیں، انیس بھائی نے پوچھا کہ حضرت آپ اس زور سے کیوں روئے، انھوں نے بھرائی آواز میں جواب دیا کہ کہ بھائی میں گنہگار آدمی ہوں، حضرت کے چہرۂ اقدس پر نظر پڑی تو میرے سب گناہ ایک دم آئینہ ہوگئے، میں اپنی گنہگاری دیکھ کر ضبط نہ کرسکا، بھائی میں بڑا گنہگار ہوں یہ کہہ کر پھر رونے لگے۔ انیس بھائی نے دیکھا کہ یہ پھر سابقہ حال پر آگئے تو انھوں نے برجستہ کہا کہ حضرت آپ کی بڑائی بہت چیزوں میں تسلیم ہے، آپ بڑے عالم ہیں، بڑے بااخلاق ہیں، بڑے بزرگ ہیں، ان سب چیزوں میں ہم آپ کی بڑائی مانتے ہیں، لیکن یہ کیا کہ

سب بڑائیاں ہم آپ ہی کے لئے تسلیم کرلیں اور یہ بھی مان لیں کہ آپ ہی بڑے گنہگار بھی ہیں، جی نہیں، اس میں ہم آپ سے بہت بڑے ہیں۔

اس پر مولانا موصوف ہنس پڑے، پھر انیس بھائی نے انھیں اہتمام سے چائے پلائی۔

بزرگوں کی بات نہ ماننے کا انجام:

بزرگوں کی خدمت میں حاضری دینے کا انیس بھائی کو بہت شوق تھا، بھوپال میں ایک بزرگ شاہ عبدالخالق صاحب نقشبندی تھے، ان کی خدمت میں بھی یہ گاہے ماہے حاضر ہوا کرتے تھے ان کے یہاں چائے کا دور برابر چلتا رہتا تھا اور یکے بعد دیگرے پان کی گلوریاں بھی گردش میں رہا کرتی تھیں، ایک روز انھوں نے انیس بھائی کو پان پیش کیا، انیس بھائی کہتے ہیں کہ میں نے معذرت کی انھوں نے اصرار کیا کہ ایک کھالو، لیکن میں اپنے انکار پر جم گیا مگر وہاں سے نکلنے کے بعد میرا حال یہ ہوا کہ بے تحاشہ پان کی خواہش دل میں پیدا ہوئی، بھوپال میں پان کی دوکانیں قریب قریب ہیں، کہتے ہیں کہ میں نے ایک دوکان سے پان لے کر کھایا چند قدم کے بعد دوسری دوکان سے کھایا، اسی طرح لگاتار دن بھر پان کھاتا رہا۔ دوسرے دن حاضر ہوا تو پھر انھوں نے پان پیش کیا میں نے پھر انکار کیا کر دیا، اس روز کل سے زیادہ پان کا تقاضا رہا، دن بھر میں پچاسوں پان کھا گیا اور دن بھر پریشانی رہی، تیسرے دن میں خوب منہ صاف کر کے گیا تاکہ پان کا کوئی دھبہ دانتوں پر باقی نہ رہے، آج بھی انھوں نے پان پیش کیا اور میں نے حسب معمول انکار کر دیا، انھوں نے آہستہ سے کہا میاں! کھالو بہت پریشانی ہوتی ہے۔ انیس بھائی چونکے اور پان کھالیا، اس کے بعد پھر پان کی خواہش نہیں ہوئی۔ فرماتے تھے کہ میں نے اپنے دل میں سوچ لیا کہ بزرگوں کی بات مان لینے میں ہی خیریت ہے۔

لاطاعة لمخلوق فی معصية الخالق:

حکیم وصی صاحب نکاح وشادی کی رسوم کو اپنی دینداری اور خدا پر توکل کے جذبہ سے بالکل بیخ وبن سے اکھاڑنے پر تلے رہتے، اپنے بچوں اور بچیوں کے نکاح میں کوئی خلاف سنت رسم نہ ہونے دی، اور نہ ایسی شادیوں میں شریک ہوتے، جہاں خلاف شرع رسوم کی پابندی ہوتی، اس طرح کی دعوتوں سے بھی احتراز کرتے، مجلس نکاح میں شرکت کر لیتے، مگر بارات کے عنوان

سے جو دعوت کھلائی جاتی اس سے اجتناب کرتے، اور اس سلسلے میں وہ کسی کی پرواہ نہ کرتے۔
اس سلسلہ میں وہ یہاں تک پہنچتے تھے کہ بڑی سے بڑی نسبتوں کو ٹھکرادیتے، انھیں اپنی اولاد کے دنیوی مستقبل سے زیادہ اخروی مستقبل کی فکر رہا کرتی تھی۔ ویسے یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے محض اللہ کے واسطے جب اونچی نسبتوں کو ٹھکرایا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے بہتر انتظام فرمادیا۔
ایک روز بڑے لطف سے انھوں نے ایک صاحبزادی کے نکاح کی داستان سنائی:
''فرمانے لگے کہ گورکھپور میں ایک بڑے عہدہ دار جو مسلمان تھے، عرصہ سے تعینات تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، اور اسی صوم وصلوٰۃ کی پابندی کی وجہ سے حکیم صاحب کے مطب اور علاج کے واسطے سے ان کے روابط حکیم صاحب سے ہوئے، جو وقت گزرنے کے ساتھ پختہ ہوتے گئے، انھیں معلوم تھا کہ حکیم صاحب کی ایک بچی اب نکاح کی عمر کو پہنچ چکی ہے، ایک دن وہ بہت خوش خوش آئے اور ضلع کے ایک بڑے عہدہ دار کلکٹر یا نائب کلکٹر کے صاحبزادے کا پیغام لے کر آئے اور کہا کہ لڑکا بڑا تعلیم یافتہ ہے، اونچی ملازمت پاچکا ہے، اس کے ساتھ لڑکی کا رشتہ ہوجائے تو لڑکی کی زندگی ٹھکانے لگ جائے، حکیم صاحب نے غور سے ان کی بات سنی اور بہت خوشی کا اظہار فرمایا کہ آپ نے میری لڑکی کی فکر رکھی، لیکن صاحب بات یہ ہے کہ میں اپنی لڑکی کی شادی اپنی برادری میں کروں گا، برادری سے باہر نہیں کروں گا، وہ صاحب چونکے انھوں نے کہا کہ میں تحقیق کرچکا ہوں، جس برادری کے آپ ہیں اسی برادری کے وہ بھی ہیں، حکیم صاحب نے کہا جی نہیں ان کی اور میری برادری ایک نہیں ہے، میں ایک ملا آدمی ہوں، میں بھی نماز پڑھتا ہوں میرے بچے بھی نماز پڑھتے ہیں، میرے چہرے پر داڑھی ہے، میرے گھرانے کا ہر چہرہ باریش ہے، اور جہاں آپ میری بچی کا نکاح کرنا چاہتے ہیں، وہ گھرانا دین سے دور ہے، سنت سے دور ہے، وہ میری برادری میں نہیں ہے، اس کو سن کر وہ مایوس ہوئے لیکن انھوں نے حکیم صاحب کو سمجھایا اور اس نکاح کے فوائد بتائے، پھر اصرار کیا، اور اتنا اصرار کیا کہ حکیم صاحب نے بادل ناخواستہ ہاں کہہ دی، وہ صاحب لڑکے کے باپ کو لے کر آئے تاکہ بات پختہ ہوجائے، گفتگو ہوئی، حکیم صاحب نے کہا کہ رشتہ ہونے کیلئے ایک شرط ہے، اگر وہ آپ کو منظور ہو تو خیر ورنہ اس بات کو یہیں دفن کردیجئے، فرمایا کہ میرے گھر بارات نہیں آئے گی، میں اس رسم کی شریعت میں گنجائش نہیں پاتا،

ان صاحب نے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ بغیر بارات کے شادی کیسی؟ حکیم صاحب نے بتاکید مکرر فرمایا کہ بغیر بارات کے ہی نکاح ہوگا، میرے دروازہ پر خانۂ خدا (مسجد) موجود ہے، آپ بچے کو لے کر یہاں آجایئے، نماز پڑھیے، نماز کے بعد میں نکاح پڑھادوں گا جیسا وقت ہوگا، اس کے لحاظ سے کچھ خاطر مدارات کردوں گا، کھانے کا وقت ہوگا تو ماحضر پیش کردوں گا، کوئی اور وقت ہوگا تو چائے پلادوں گا، یہ بات ان صاحب کی کسی طرح سمجھ میں نہیں آرہی تھی، وہ حکیم صاحب کو بارات پر قائل کرنا چاہ رہے تھے اور حکیم صاحب اپنی رائے پر پختہ تھے، جو صاحب درمیان میں تھے، انھوں نے بچے کے باپ کی طرف سے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ حکیم صاحب! آپ جیسا فرماتے ہیں ویسا ہی ہوگا، حکیم صاحب نے پھر تاکید کردی کہ میرے پاس بارات ٹھہرانے کی جگہ نہیں ہے، اسے نہ لایئے گا، پھر تاریخ مقرر ہوگئی وہ صاحب باہر نکلے تو اپنے ساتھی سے بولے، ارے! بارات آئے گی، حکیم صاحب پر اس وقت مولویت سوار ہے، جب بارات آجائے گی تو دروازے کی عزت کا خیال کریں گے، بھلا کوئی آئی ہوئی بارات کو پلٹاتا ہے، اس وقت غبارے کی سب ہوا نکل جائے گی، وہ بیچارے نہیں سمجھ سکے کہ حکیم صاحب کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔

وہ تاریخ آگئی، حکیم صاحب اپنے مطب میں مریضوں کے جھرمٹ میں بیٹھے ہوئے ہیں، کوئی گیارہ بارہ بجے کا عمل رہا ہوگا، ایک شخص دوڑتا ہوا آیا کہ دروازے پر بارات آئی ہے، نوشہ کے والد آپ کو بلارہے ہیں، حکیم صاحب نے کہا کہ میرے دروازے پر بارات نہیں آئے گی، وہ کہیں اور کی بارات ہوگی، اس شخص نے باصرار تمام کہا کہ نہیں، وہ آپ ہی کے دروازے پر آئی ہے حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ میں باہر نکلا تو سو آدمیوں کی بارات تھی، دولہا سر پر پگڑی باندھے، ایک بڑے گھوڑے پر سوار ہے، گھوڑا قدم قدم اچھل رہا ہے، اور دولہا کے سر پر چھتر چھایہ ہے، جو برابر گردش میں ہے، دولہا کے والد بھی ہمراہ ہیں اور وہ درمیانی واسطہ بھی موجود ہیں، انھوں نے پوچھا کہ حکیم صاحب بارات کہاں ٹھہرے گی، اس وقت حکیم صاحب کے مکان سے کچھ فاصلہ پر کسی بھنگی کے یہاں شادی کا اہتمام تھا، وہ لوگ اپنی حیثیت کے لحاظ سے خیمہ وخرگاہ لگائے ہوئے تھے، باجہ مسلسل بج رہا تھا، حکیم صاحب نے اسی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ ہمارے یہاں ایسی جو بارات آتی ہے، وہ اس جگہ ٹھہرتی ہے، ان لوگوں نے سمجھا کہ حکیم صاحب کی رائے تبدیل ہوگئی

ہے۔اب نہ صرف یہ کہ بارات قبول ہے بلکہ اس کے لوازمات باجہ وغیرہ کا بھی انتظام کر رکھا ہے، بارات آگے بڑھ گئی، اور حکیم صاحب اپنے مطب میں جا کر حسب معمول پھر مریضوں کی مسیحائی میں لگ گئے، بارات بڑی شان سے بھنگیوں کے شامیانے تک پہونچی، بھنگیوں نے جب اپنے آقاؤں کو دیکھا تو ایک دم باجا بجانا روک کر ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے کہ حضور ادھر کہاں نکل آئے؟ ان صاحب نے کہا کہ کیا یہ حکیم صاحب کا شامیانہ نہیں ہے، بھنگیوں نے کہا نہیں حضور! یہاں ہم غریبوں کی بارات آنے والی ہے، اب تو یہ لوگ بہت چراغ پا ہوئے اور ادھر ہی سے بارات واپس لے گئے، حکیم صاحب خبر تک لینے نہیں گئے، بعد میں وہ ''واسطہ درمیاں'' بہت خفا ہوئے حکیم صاحب نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا کہ میں تو پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ میں اپنی برادری سے باہر اپنی بچی کا نکاح نہ کروں گا۔

ادھر تو یہ ہوا، ادھر گھر کے لوگ بھی حکیم صاحب پر ناراض ہوئے کہ اتنا اچھا رشتہ محض بارات کی وجہ سے رد کر دیا، حکیم صاحب کچھ جواب نہ دیتے، بس اللہ سے دعا کرتے کہ بارالٰہا! میں نے صرف دین کے واسطے یہ رشتہ کاٹا ہے، آپ کو قدرت ہے آپ اس کا نعم البدل عطا فرما دیجئے۔

اس کے بعد کی داستان سننے کے لائق ہے، ایک دو ہفتہ حکیم صاحب نے گھر والوں کی ناراضگی میں گزارا، ایک روز صبح کے وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، حکیم صاحب نے فون اٹھایا اور پوچھا کون؟ ادھر سے آواز آئی، وصی اللہ الہ آباد، حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب ہوں گے، کیونکہ حضرت کو ٹیلیفون وغیرہ سے کیا مناسبت؟ میں نے پوچھا کون وصی اللہ؟ ادھر سے آواز آئی آپ نہیں جانتے کہ پوچھ رہے ہیں اتنے میں انھوں نے پہچان لیا، عرض کیا حضرت؟ فرمایا ہاں جی! حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ اس آواز سے میرے اوپر لرزہ طاری ہوگیا، میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا حضرت کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ مولوی عبدالمجید (مالک اسرار کریمی پریس الہ آباد) کے یہاں سے آپ کو فون کر رہا ہوں، آپ کی وہ بچی ہے نا جو مجھے ابا کہتی تھی، اس کا نکاح کہیں طے تو نہیں کیا ہے، میں نے کہا نہیں حضرت! حضرت نے فرمایا میں نے اس کا ایک مناسب رشتہ دیکھا ہے آپ آجایئے، اگر پسند ہو جائے تو عقد ہو جائے۔

حضرت اقدس گورکھپور کے زمانۂ قیام میں عرصہ تک حکیم صاحب کے مکان پر رونق افروز رہے تھے، اس کی وجہ سے حضرت کے ساتھ ان کا تعلق بالکل خاندان جیسا تھا۔

قرآن سے شغف:

حاجی عبدالرحمان صاحب کی تلاوت کا معمول بھی خوب تھا، اور اس کی بڑی پابندی کرتے، علاوہ خاص خاص سورتوں کے پڑھنے کے، جن کے احادیث میں فضائل بیان کئے گئے ہیں، ایک پارہ پڑھنے کا روزانہ بالالتزام معمول تھا۔ اور وہ اس طرح کہ چاند کی پہلی تاریخ سے قرآن کا آغاز کرتے، کہ چاند کی جو تاریخ ہوتی، تلاوت کے پارے کا عدد بھی وہی ہوتا، اگر اگلا چاند ۲۹ر کا ہوتا تو اسی شب میں قرآن کے آخری جُز کی تلاوت پوری کرتے، اور پھر پہلی تاریخ کو پہلا پارہ پڑھتے، اس میں سفر وحضر میں کبھی تخلف نہ ہوتا، انھیں ہمیشہ مستحضر رہتا کہ آج چاند کی کون سی تاریخ ہے، صبح کو جو پارہ تلاوت میں رہا ہوتا، وہی تاریخ ہوتی۔

ہتھورا ثانی:

شیخوپور آنے کے بعد جب حضرت قاری حبیب صاحبؒ کی خدمت میں حاضری ہوئی تو دیر تک مدرسہ کے احوال، گاؤں والوں کے احوال، اساتذہ کے احوال پوچھتے رہے، میں نے یہاں کے ابتدائی حالات، یہاں کی بے سروسامانی، اساتذہ کا صبر واستقلال، طلبہ کے مجاہدوں اور تکلیفوں کا ذکر کیا، راستے کی صعوبت، آسائش زندگی کے فقدان کا تذکرہ کیا تو بہت دلسوزی کے ساتھ دعائیں کرتے رہے، اور ایک خاص کیفیت کے ساتھ فرمانے لگے کہ ”ان شاء اللہ ہتھورا ثانی بنے گا“۔

واللہ عجب شان ہے ان مردان خدا کی:

شیخ پور میں جب حضرت مولانا عبدالواحد صاحب مدظلہ کا قیام تھا تو کچھ لوگوں نے ایک گاؤں چلنے کی دعوت دی، وہ گاؤں شیخ پور سے قدرے فاصلے پر ہے، میں موجود تھا، داعی میرے طالب علموں میں تھے، میں نے ان کو ہدایت کی کہ موٹر سائیکل لیتے آئیں۔ اس پر حضرت بآسانی وہاں پہونچ جائیں، انھوں نے بات مان لی اور وعدہ کیا کہ موٹر سائیکل لے کر آؤں گا، مگر جانے کا وقت آیا تو دیکھا کہ ایک سائیکل ٹھیلہ لے کر آئے جو سواریاں نہیں بلکہ سامان ڈھونے کیلئے استعمال

ہوتا ہے، میں نے ان سے مواخذہ کیا،تو وہ کچھ بے تکے عذر کرنے لگے، مجھے بہت رنج ہوا کہ ان لوگوں کو بزرگوں کی ذرا بھی قدر نہیں، اگر ذرا فکر کئے ہوئے تو موٹر سائیکل نہ سہی رکشہ مل جاتا، میں نے انہیں ڈانٹا اور کہہ دیا کہ حضرت ٹھیلہ پر نہیں بیٹھیں گے، میں نے کچھ لوگوں سے کہا کہ موٹر سائیکل لاؤ اس وقت موٹر سائیکلیں اتنی عام نہیں تھیں۔ جتنی اب ہیں،تھوڑی محنت کے بعد ایک موٹر سائیکل مل گئی۔ میرے زجر وتوبیخ سے داعی متاثر تھے،حضرت بہت لجاجت اور عاجزی سے مجھ سے کہنے لگے کہ میں اسی ٹھیلے پر جاؤں گا، وہ اس بے تکلفی سے اس پر بیٹھنے کیلئے تیار تھے، جیسے یہ کوئی بہت عمدہ سواری ہو، یہ بات سن کر میں سناٹے میں آگیا، میں نے کوشش کی موٹر سائیکل جلد آجائے ،میں کسی طرح انہیں ٹھیلے پر بیٹھنے سے روکتا رہا، بارے موٹر سائیکل آئی ،اب حضرت مصر ہیں کہ آپ اس پر بیٹھئے ،میں ٹھیلے سے جاتا ہوں ، میں نے بضد ہوکر حضرت کو موٹر سائیکل پر بٹھایا، حضرت تشریف لے گئے، ٹھیلے پر دوسرے احباب بیٹھے۔

یہی حال کراچی میں تھا۔حضرت جس محلے میں پہلے رہتے تھے،اور وہاں کی مسجد میں ابتداء سے امامت فرماتے ہیں ، وہ مدرسے سے خاصے فاصلے پر ہے جب تک طاقت رہی، مدرسہ سے پیدل ہی تشریف لے جایا کرتے تھے ۔اب بڑھاپے میں گاڑی پر تشریف لے جاتے ہیں تو اپنے لئے انھوں نے ایسی گاڑی کا انتخاب کیا ہے جو سب گاڑیوں میں کمتر ہے۔ یہ خاکسار بھی حضرت کے ہمراہ اسی گاڑی سے آتا جاتا تھا، حضرت نے ہمیشہ باصرار اپنے اس حقیر مرید کو گاڑی میں ممتاز جگہ پر بیٹھایا۔اور خود کسی طرف بیٹھ جاتے ،اس میں میری تدبیر اور کسی اصرار کو کامیابی نہ ملی۔

حکیمانہ جواب:

ایک صاحب نے حضرت مولانا عبدالواحد صاحب سے سوال کیا کہ مجھے تلاوت قرآن سے بہت شغف ہے، اگر میں سارے ذکر واذکار کو چھوڑ کر تلاوت قرآن پر ہی اکتفا کروں تو کیا حرج ہے؟ حضرت نے بے ساختہ فرمایا کہ اگر آپ کہیں کہ میں تمام غذاؤں کو چھوڑ کر صرف گھی کھایا کروں تو کیا حرج ہے؟ اس پر حکیم اور ڈاکٹر کا جواب کیا ہوگا۔بس وہ خاموش ہو گئے۔

حضرت کا جواب بڑا حکیمانہ تھا،قرآن کی تلاوت کا مرتبہ بے شک بہت عظیم ہے۔لیکن

انسانی احوال کے اعتبار سے دوسرے اذکار واوراد کی بھی بڑی اہمیت ہے، قرآن کریم کے حق تلاوت کی ادائیگی کا راستہ بھی انہیں اورادواذکار سے ہموار ہوتا ہے، اس لئے محض تلاوت کی بات ہے تو بظاہر بہت خوشنما، مگر افادیت مکمل نہ ہوگی، جب تک دوسرے اورادواذکار معمول میں نہ ہوں حضرت کے جواب میں قرآن کی عظمت بھی پورے طور پر نمایاں اور دوسرے اذکار کی اہمیت بھی واضح ہے۔

کتابوں سے شغف:

حضرت مولانا محمد فاروق صاحب علم ومطالعہ کے بڑے شیدائی تھے، جو بھی اچھی اور معیاری کتاب ملتی، از اول تا آخر غور سے پڑھتے، اس سلسلے میں انھیں محققین کی کتابوں سے زیادہ لگاؤ تھا۔ مالی حالت بہت بہتر نہ تھی، اسلئے بیش قیمت کتابیں خرید نہیں سکتے تھے، تو اس کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ جن کتابوں کا ہونا اپنے پاس وہ ضروری سمجھتے تھے، انھیں محنت کر کے پوری نقل کر لیتے تھے۔ امام شاطبی کی ''الاعتصام'' کی انھیں بڑی ضرورت تھی، اس وقت یہ کتاب عام نہیں ہوئی تھی اس کی دو جلدیں ہیں، اور ہر جلد متوسط ضخامت کی ہے۔ ایک صاحب کے یہاں سے مطالعہ کیلئے عاریۃً مانگ کر لائے، اور وقت کچھ زیادہ متعین کرالیا، اور اسی فرصت میں اول سے آخر تک پوری کتاب نقل کر لی۔ مولانا کا خط بڑا پاکیزہ تھا، اور بڑا کمال یہ تھا کہ ان سے کتابت کی غلطی بالکل نہیں ہوتی تھی، کسی مشغولیت میں ہوں، حالات چاہے کتنا ہی خیال ودماغ کو منتشر کر رہے ہوں، مگر قلم ہاتھ میں لے لیتے تو بالکل یکسوئی ہو جاتی، اور بے تکلف لکھتے چلے جاتے، میں نے کئی ضخیم کتابیں ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہیں۔ بہت صحیح اور صاف تحریر! دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، طاش کبریٰ زادہ کی ضخیم کتاب جو کئی جلدوں میں ہے، ''مفتاح دار السعادہ'' اس کا مکمل ترجمہ کر کے خوش خط لکھ رکھا ہے۔

ان کی محنت اور استقامت قابلِ رشک ہے، اور حافظہ کی قوت کا یہ حال تھا کہ کتابوں کی عبارتیں ازبر تھیں، اور اس طرح بے تکان سناتے کہ کہیں تشابہ اور التباس کی نوبت نہ آتی۔ الہ آباد میں ایک صاحب بہت علم دوست تھے، ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب مرحوم، ان کے یہاں جمعہ کے روز شہر کے بعض اہل علم حضرات جمع ہوتے تھے، اور کسی علمی موضوع پر گفتگو ہوتی تھی،

یہ بندہ بھی اس میں شرکت کرتا تھا، مولانا الہ آباد تشریف لاتے اور جمعہ کا دن ہوتا تو ڈاکٹر صاحب ان کو بھی دعوت دیتے، ایسے ہی ایک جمعہ کو کسی موضوع پر بات ہورہی تھی، مولانا نے اپنی گفتگو کے لئے امام غزالیؒ کی ''احیاء علوم الدین'' کا حوالہ دیا اور ساتھ ساتھ اس کی عبارت پڑھنی شروع کی، اور پڑھتے چلے گئے۔ میرا اندازہ ہے کہ کم وبیش ایک صفحہ کی عبارت پڑھی اور پھر اس کی توضیح وتشریح کرنے لگے، میں ان کے حافظے کی قوت پر سخت حیرت زدہ ہوا۔

احتیاط وتقوی:

مفتی یاسین صاحب کے تقویٰ اور ذوقِ مطالعہ کے سلسلے میں ہمارے دوست مولانا عبد الرب صاحب اعظمی سناتے ہیں کہ ایک روز مغرب کی نماز کے بعد وہ کچھ رفقاء کے ساتھ ''مفتی صاحب'' سے ملاقات کیلئے مبارکپور پہونچے، معلوم ہوا کہ وہ گھر پر ہیں، دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ محلّہ کی مسجد میں مصروفِ مطالعہ ہیں، یہ لوگ حاضر ہوگئے، دیکھا کہ مسجد کے اندرونی حصے میں گرمی کی وجہ سے کرتا اتارے ہوئے، ایک معمولی چراغ کی روشنی میں کتاب دیکھ رہے ہیں، ان لوگوں نے سلام کیا، وہ چونک کر متوجہ ہوئے پھر چراغ اٹھایا اور اسے ساتھ لے کر گھر کی جانب چلے انھوں نے چراغ کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ یہ میرے گھر کا چراغ ہے، نماز کا وقت ختم ہوجاتا ہے، تو مسجد کا دیا بجھا کر اپنا چراغ جلالیتا ہوں، اور اس میں مطالعہ کرتا ہوں۔ اللہ اکبر! یہ تھی احتیاط اور یہ تھا تقویٰ! اور صرف اسی ایک معاملہ میں نہیں زندگی کے ہر معاملہ میں ''مفتی صاحب'' اسی اہتمام سے تقویٰ کو کام میں لاتے تھے۔

اللہ والے:

رمضان کے مہینے میں طبیعت کی خرابی کے باوجود بابو عزیز الرحمان صاحب روزے رکھتے رہے، اپنے معمولات بھی بقدر قوت ادا کرتے رہے، مگر ذہن سے خوف وخشیت کا غلبۂ حال ہٹتا نہ تھا۔ رمضان کی چھبیسویں شب میں رات کے سناٹے میں جبکہ تیماردار بھی سوگئے، اللہ جانے کون سی طاقت ان میں آگئی تھی کہ مکان کی اونچی دیوار جس پر شیشے کے ٹکڑے بھی لگے ہوئے ہیں، اور اس کی بلندی تک چڑھنے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے اور ان کی کمزوری کا یہ حال تھا کہ سہارے سے مشکل سے چل پاتے تھے، اس کمزوری میں کیا طاقت آگئی تھی کہ چھ فٹ کی دیوار پر چڑھے اور

باہر کود گئے، شیشوں سے ہاتھ زخمی ہوا، خون بہا، اس کے قطرے زمین پر گرے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ ادھر سے نکلے ہیں، پھر کہاں کہاں گئے، کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی۔

سحری کیلئے گھر کے لوگ اٹھے اور انہیں نہیں پایا تو ڈھونڈھ شروع ہوئی، دن بھر تلاش کئے گئے، کہیں سراغ نہیں ملا، رات گئے تک تلاش جاری رہی۔ دوسرے روز یعنی ۲۷ ؍رمضان کو دس بجے دن میں معلوم ہوا کہ محلّہ بدرقہ میں ایک کنویں کے اندر گرے ہوئے ہیں۔ اللہ جانے کب گرے تھے۔ اندازہ تو یہی ہے کہ جس رات وہ گھر سے نکلے تھے، اسی رات یہ حادثہ ہوا ہے۔ لیکن حیرت اور سخت حیرت کی بات یہ ہے کہ غوطہ خور جب کنویں میں اترا تو اس نے پایا کہ وہ نماز کی ہیئت میں ہاتھ باندھے کنویں میں کھڑے ہیں، سر کندھا سمیت قدرے جھکا ہوا تھا۔ جیسے بہت خشوع وخضوع سے نماز پڑھ رہے ہوں، غالباً تیس گھنٹے سے کچھ زیادہ پانی میں رہے ہوں گے۔ مگر تعجب ہے کہ بدن نہ پھولا نہ اس پر پانی کا کوئی اثر ہوا۔ غالباً پیٹ میں پانی کا کوئی قطرہ بھی نہ گیا تھا اور جب لاش باہر نکال کر رکھی گئی تو چہرہ خود بخود قبلہ کی طرف ہوگیا۔ غسل دینے والوں نے بتایا کہ اس وقت چہرہ اور پرنور اور بارونق ہوگیا۔ گورے چٹے تو تھے ہی، اس وقت چہرے سے سرخی چھلکی پڑ رہی تھی۔

واقعی اللہ والوں کا جسم مرنے کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے۔ زندگی بھر زبان و دل سے جو نورانی نام لیا تھا آج اس کا اثر جسم پر، چہرے پر محسوس ہو رہا تھا، اتنی دیر تک جسم پانی میں رہا، مگر یہ بھی نہ ہوا کہ کھال ہی متاثر ہوگئی ہو۔

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

[۱]　اس باب میں مذکور شخصیات کے تفصیلی حالات معلوم کرنے کے لئے دیکھئے حضرت مولانا کی کتاب ’’کھوئے ہوؤں کی جستجو‘‘۔

’’مدارس اسلامیہ، مشورے اور گزارشیں‘‘ سے ماخوذ واقعات

عہد کی پاسداری کی برکت:

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب بھوپالی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے کہ مشہور بزرگ حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید قدس سرہٗ کی خدمت میں ایک صاحب ریاضت ہندو آیا، اور بیٹھتے ہی مراقب ہوگیا، مراقبہ سے سر اٹھایا، تو بولا کہ حضرت آپ کا دل نہایت صاف شفاف ہے، اس میں کوئی کجی اور اونچ نیچ نہیں ہے، لیکن ایک سخت عیب یہ ہے کہ بالکل سیاہ ہے، فرمایا کہ تم کمال کے صاحب کشف ہو، بھلا یہ تو بتاؤ کہ یہ کشف کا کمال تمہیں کیونکر حاصل ہوا؟ بولا کہ میرے گرو نے ابتداء میں ہی مجھ سے عہد لیا تھا کہ نفس کی خواہشات ولذات سے کنارہ کش رہوں گا، اور اس کی خواہشات کی ہمیشہ مخالفت کروں گا، حضرت نے فرمایا واقعی نفس کی مخالفت سے بڑے بڑے کمالات حاصل ہوتے ہیں، مگر تم ایک بات بتاؤ کہ مسلمان ہوجانا، اور دین اسلام میں داخل ہونا تمہارے نفس کے خلاف ہے یا نہیں؟ اس نے کہا بے شک! آپ نے فرمایا پھر اسے قبول کرو، اس نے کہا کہ ہاں عہد کی پاسداری تو یہی ہے کہ میں اس دین کو قبول کرلوں، اور میرے گرو کہا کرتے تھے کہ تمہارے اندر مسلمانوں جیسی باس آتی ہے، سو آج یہ بات پوری ہوئی، اور وہ مسلمان ہوگیا، دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے ہی اس کی حالت بدل گئی، اب وہ نہایت مؤدب ہوکر حضرت مرزا صاحب قدس سرہٗ کے پاس بیٹھ گیا، اور کہا کہ اب آپ کا دل سورج سے زیادہ روشن ہے۔ فرمایا کہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو وہ میرا نہیں تمہارا دل ہے، پہلے سیاہ دیکھا تھا، تو بھی وہی تھا، اب روشن دیکھ رہے ہو، تب بھی وہی ہے، میرا دل آئینہ ہے، اس میں تم نے اپنا ہی دل دیکھا ہے، پہلے وہ کفر کی وجہ سے سیاہ تھا، اب اسلام کے نور کی وجہ سے روشن ہے۔

دیکھئے! اس نے ایک عہد پورا کیا، اپنے وعدے کا وفادار تھا، تو اللہ نے اس کی برکت سے ضلالت سے کتنی آسانی سے ہدایت کی راہ پر ڈال دیا۔

حکمت عملی:

دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ نے ایک بار محسوس کیا کہ اساتذہ درس گاہوں میں قدرے تاخیر سے پہونچتے ہیں، انھوں نے کچھ کہا نہیں، انھوں نے اس دروازے پر جس سے اساتذہ گزرتے تھے چارپائی ڈال لی، اور وقت سے پہلے آکر بیٹھ جاتے کچھ کام کرتے رہتے، اساتذہ نے خود بخود پابندی شروع کردی۔ ایک بزرگ استاذ اپنی بعض مشغولیات کی وجہ سے پھر بھی تاخیر سے آتے رہے، تو ان سے تنہائی میں بہت ادب سے کہا کہ حضرت آپ بہت مشغول رہتے ہیں، تعلیم کے وقت کے کچھ کام میرے سپرد کردیں، میں انھیں انجام دوں گا۔ آپ وقت پر مدرسہ تشریف لایا کریں تاکہ طالب علموں کا نقصان نہ ہو۔

حسبۃً للہ:

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ دارالعلوم دیوبند سے تھوڑی سی تنخواہ پاتے تھے، تو بسا اوقات اس کا حوالہ دیکر روتے تھے، اور فرماتے تھے کہ میں تو دنیادار ہوں، حدیث پڑھا کر اتنی اتنی تنخواہ لیتا ہوں۔ محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ نے کچھ عرصہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حدیث کا درس دیا، وہاں یہ درس انھوں نے حسبۃً للہ دیا تھا، بعد میں جب یہ سلسلہ موقوف ہوگیا تو کچھ عرصہ کے بعد حضرات ندوہ کو معلوم ہوا کہ حضرت معاشی تنگی سے دوچار ہیں۔ انھوں نے اتنے دنوں کی معقول تنخواہ حساب لگا کر حضرت کی خدمت میں بھیجی۔ حضرت اس وقت ضرورت مند تھے، لیکن یہ کہہ کر پوری رقم واپس کردی کہ میں نے پڑھانے میں یہ نیت کی تھی کہ محض اللہ کے واسطے پڑھاؤں گا۔

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا:

ایک ہندو زمیندار پنجاب کا رہنے والا، دارالعلوم دیوبند کی دارالحدیث میں اتفاقاً پہونچ جاتا ہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ بخاری شریف کا درس دے رہے ہیں، وہ بھی بیٹھ جاتا ہے، جب حضرت پڑھا کر فارغ ہوجاتے ہیں، اور اٹھ کر دارالحدیث سے باہر نکلتے ہیں، تو بہت سے لوگ لپک لپک کر مصافحہ کی سعادت حاصل کرتے ہیں، اس جوان کے دل میں بھی کچھ خیال آتا ہے، ڈرتا ڈرتا یہ بھی پہونچتا ہے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیتا ہے،

ہندوانہ لباس میں ملبوس ایک ہندو نوجوان جب ہاتھ بڑھاتا ہے، تو حضرت کا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھتا ہے، اور استفہامیہ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز ہو جاتی ہیں، اسے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا بے ساختہ بول اٹھتا ہے کہ مجھے مسلمان بنا لیجئے، اور حضرت اسی جگہ راستے ہی میں زمین پر بیٹھ جاتے ہیں اور کلمہ پڑھا دیتے ہیں۔

اس طرح کا ماحول تھا، مدارس کا، اور اربابِ مدارس کا! حضرت مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری نور اللہ مرقدہٗ کی شخصیت ایک زمانے میں آسمانِ خطابت کی بدر کامل نہیں، بلکہ آفتابِ جہاں تاب تھی، عزت واکرام کی بڑی سے بڑی بلندی جو ہوسکتی ہے، انھیں حاصل تھی، لیکن وہ بندہ اپنے نفس کا غلام نہ تھا، اللہ کے لئے اس کا مرنا جینا تھا، ایک صاحب کے یہاں زینے پر چڑھ رہے تھے، اوپر سے ایک بھنگی اتر رہا تھا، شاہ صاحب کا جاہ وجلال دیکھا، تو وہ حواس باختہ ہو گیا۔ زمینداری کے دور میں بھنگیوں کی جو دُرگت تھی آج اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا، شاہ صاحب کو دیکھ کر وہ ایک طرف سمٹنے لگا، شاہ صاحب نے بے ساختہ فرمایا تم بھی انسان ہو، کیوں ڈرتے ہو؟ یہ کہتے کہتے اسے پکڑ کر سینے سے لگا لیا۔ اللہ جانے اس پر کیا اثر پڑا کہ دوسرے دن پورے خاندان سمیت شاہ صاحب کے قدموں میں آ گیا اور جہنم سے نجات حاصل کر لی۔ انھیں علماء نے اور انھیں مدارس نے لوگوں کے دین وایمان کو باقی رکھا، اور انھیں سنبھالا۔

بزرگوں کا معاملہ:

ایک بزرگ تھے حضرت شیخ صدر الدین عارف، اللہ والے بھی تھے اور بہت بڑے تاجر اور صاحب ثروت بھی تھے، ان کے تجارتی تعلقات باہر ملکوں سے بھی تھے، ایک مرتبہ سمندری راستے سے ان کا مال باہر سے آ رہا تھا، جہاز قریب آ گیا تھا کہ سمندر میں طغیانی آ گئی، معلوم ہوا کہ جہاز پانی میں غرق ہو گیا، ہزاروں لاکھوں کا مال تھا، کسی نے آ کر انھیں جہاز کی بربادی کی خبر دی، انھوں نے بہت اطمینان سے کہا ''الحمد للہ'' حاضرین کو تعجب ہوا کہ یہ موقع **الحمد للہ** کا نہ تھا، **إنا للہ** کا تھا مگر کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ ان سے سوال کرتا، بزرگوں کے قلب کو عام لوگوں کے قلوب پر قیاس نہیں کیا جاسکتا تھا، پھر جب طغیانی فرو ہوئی تو دیکھا گیا کہ جہاز بعافیت کنارے آ لگا، دوبارہ انھیں جہاز کی خیریت وعافیت کی خبر سنائی گئی تو پھر فرمایا کہ الحمد للہ، اب ایک شخص سے نہ رہا گیا، اس

نے پوچھ لیا کہ حضرت جب جہاز ڈوبا تھا اس وقت بھی آپ نے **الحمد للہ** ہی پڑھا تھا، حالانکہ موقع **إنا للہ** کا تھا؟ فرمایا کہ میاں! میں نے **الحمد للہ** جہاز کے ڈوبنے یا اس کی عافیت پرنہیں پڑھا، یہاں ایک دوسری بات ہے، لوگ سراپا اشتیاق ہوگئے کہ وہ دوسری بات کیا ہوسکتی ہے؟ فرمایا کہ مال کا ضائع ہونا، جہاز کا ڈوب جانا ایک بڑی مصیبت ہے، اور ایسی مصیبت کے وقت انسان حواس باختہ ہوجاتا ہے، صبر ورضا کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے اور حق تعالیٰ سے ربط ٹوٹنے لگتا ہے، میں نے اس مصیبت کے وقت میں اپنے دل کے بارے میں غور کیا کہ اس کا تعلق خدا تعالیٰ سے کمزور تونہیں ہورہا ہے، بحمد اللہ مجھے محسوس ہوا کہ حق تعالیٰ کے ساتھ اس کا وہی سابقہ ربط باقی ہے، کسی طرح کی جزع فزع، بے صبری، ناراضگی دل میں نہیں ہے، میں نے اُستواریٔ دل اور استقامت قلب پر الحمد للہ کہی، پھر جب مال مایوسی کے بعد سلامت مل گیا تو یہ وقت خوشی میں آپے سے باہر ہوجانے کا تھا، حد سے زیادہ خوشی میں انسان کا قلب خدا سے غافل ہوجاتا ہے، اس وقت بھی میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو وہ بحمد اللہ اپنی سابقہ حالت پر موجود تھا، تو اس پر میں نے الحمد للہ کہا، میرا یہ شکر ادا کرنا، اس کی حمد وثنا کرنی نہ مال کے ضائع ہونے پر ہے اور نہ اس کے مل جانے پر، بلکہ دل کی استقامت اور تعلق مع اللہ پر ہے۔ سبحان اللہ! کیا حال تھا ان حضرات کا، ہر طرح کے نمونے یہ حضرات اپنی زندگی میں دکھلا گئے ہیں، ہم پچھلوں کے لئے کہیں اندھیرا نہیں ہے، ہمارے بزرگوں نے اپنے بعد والوں کے لئے اتنی شمعیں جلا دی ہیں کہ نشانِ راہ بالکل روشن ہیں۔

یہاں ولایت ملتی ہے:

ایک سادھو اپنی کٹیا میں بیٹھا ہوا تھا، اس نے اپنے چیلے سے کہا کہ بیٹا بھنگ لاؤ، پینے کا وقت ہوگیا ہے، رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی، چیلے نے کہا کہ گرو جی تھیلا خالی ہے، پہلے سے خیال نہیں ہوا۔ گرو نے پکار کر کہا، کہیں سے لاؤ، مجھے ابھی چاہئے، جلد کہیں سے لاؤ، چیلا بھاگا ہوا جنگل میں گیا، دور ایک کٹیا نظر آئی، اس میں ایک دھیما چراغ جل رہا تھا۔ یہ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی قدس سرہٗ کی کٹیا تھی، چیلے نے ہانک لگائی کہ یہاں بھانگ ملے گی، حضرت بولے یہاں بھانگ نہیں ملتی ولایت ملتی ہے، اس نے کہا وہی دیدو، فرمایا نیچے ایک ندی ہے وہاں نہا کر آؤ، وہ نہا کر آیا، حضرت نے کلمہ پڑھا کر ایسی توجہ دی کہ وہ بے خود ہوگیا، اپنے گرو کے پاس اسی نشہ میں

مخمور چلا گیا، گرو نے دیکھتے ہی للکارا، ارے نالائق! میں نے تو تجھے لانے کے لئے بھیجا تھا، تو تو پی کر آرہا ہے، اس نے کہا گرو جی چلو تمہیں بھی پلادوں، لے گیا اور اسے بھی وہی چیز پلادی۔

سبحان اللہ! یہ ہے وہ ترشی جو نشۂ دنیا اتار کر دوسرا نشہ چڑھادیتی ہے، کاش ہمیں بھی کوئی ایسا ہی کٹیا باسی مل جاتا۔

رضا بالقضاء کا انوکھا واقعہ:

میں ایک واقعہ سناتا ہوں جو حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ نے اپنے مواعظ میں بیان کیا ہے، وہ یہ کہ ایک بزرگ قاری صاحب تھے وہ خود حافظ قرآن تھے اور ان کے سات بیٹے تھے اور سب حافظ قرآن تھے، رمضان المبارک کا مہینہ تھا، طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی، تراویح ہورہی تھی، ایک صاحبزادہ تراویح پڑھارہا تھا، دو ایک رکعت کے بعد تکلیف ہوئی، وہ اجازت لیکر گھر چلا گیا اب دوسرا مصلیٰ پر آیا اس کی بھی طبیعت خراب ہوئی وہ بھی گھر چلا گیا، پھر تیسرا، پھر چوتھا، اسی طرح یکے بعد دیگرے مصلیٰ پر آتے رہے اور بیمار ہوکر گھر جاتے رہے، بالآخر باپ نے تراویح پوری کی، رات ہی میں ساتوں بیٹوں نے جان دیدی، صبح کو ساتوں کا جنازہ ایک ساتھ نکلا، قاری صاحب خاموشی کے ساتھ سر جھکائے جنازہ کے ساتھ تھے، لوگوں میں کہرام مچا ہوا تھا مگر یہ خاموش تھے، کسی نے کہہ دیا کہ کتنا سخت دل باپ ہے، سات بیٹوں کا جنازہ جارہا ہے اور خود ہر قسم کی کیفیت سے خالی ہے، کتنا بے درد تھا وہ شخص جو باپ کے درد کو نہ پہچان سکا، قاری صاحب نے اسے قریب بلایا اور کھنکھار کر تھوکا تو منھ سے تھوک اور بلغم نہیں صرف خون نکلا، فرمایا کہ جگر خون ہوگیا ہے مگر اللہ کا نام اور اللہ کا حکم سب سے بلند ہے، ہم کو ان کی ہر تقدیر پر راضی رہنا اور ہر مصیبت پر صبر کرنا ہے۔

طلب علم:

امام محمد علیہ الرحمہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بڑھاپے کی عمر تک مطالعۂ و مذاکرہ میں بہت جدوجہد کرتے تھے، راتوں کو جب سارا عالم نیند کی آغوش میں چلا جاتا تھا تو یہ اپنی کتابوں کے اوراق الٹتے پلٹتے رہتے تھے، پوری پوری رات علم کی تحقیق وتصنیف میں گزار دیتے، کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ اتنے زبردست عالم ہیں، علوم کے تمام گوشے آپ کے ذہن و حافظہ میں موجود ہیں، پھر آپ کو اس قدر محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ فرمایا کہ ساری امت

چادر تان کر سو رہی ہے اور مطمئن ہے کہ کوئی مسئلہ پیش آئے گا، تو محمد سے پوچھ لیں گے، اگر محمد بھی سو جائے تو پھر کیا ہوگا؟ طلبہ کا طرۂ امتیاز یہی ہے کہ انھیں اپنی تعلیم کے علاوہ کسی اور چیز کی فکر نہ ہو، ضروریات زندگی کا انتظام تو غیبی نظام کے تحت ہوتا رہتا ہے۔ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے ملفوظات میں ایک واقعہ ملتا ہے کہ ایک طالب علم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں طلب علم کیلئے حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے پاس طالب علموں کے کھانے پینے کا جو انتظام ہے وہ پورا ہو گیا ہے۔ اب کوئی گنجائش اس میں نہیں ہے، اس نے کہا حضرت! مجھے پڑھنا ہے، آپ مجھے درس میں داخل فرمالیں، رہا کھانے کا مسئلہ تو اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے، وہ دیں گے تو کھالوں گا اور نہیں دیں گے تو کہہ دوں گا آپ کی دی ہوئی جان حاضر ہے، واپس لے لیجئے۔ حضرت گنگوہیؒ بہت متاثر ہوئے اور اسے پڑھانا منظور فرمالیا، پھر اسی مجلس میں اسی وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اس کی ضروریات کا انتظام بھی ہو گیا۔

طالب علم کی شان:

علوم نبوت کے طلبہ کی ایک تابناک تاریخ ہے، ان کے واقعات تاریخ اور تذکروں کے صفحات پر جگمگا رہے ہیں، اس وقت مجھے یہ تاریخ نہیں دہرانی ہے، بس اجمالاً اشارہ کرنا ہے کہ قرون اولیٰ سے قرون متاخرہ تک طالبان علم کے قافلے آپ کو ہر اس جگہ خیمہ زن ملیں گے جہاں علم کا کوئی چشمہ جاری ہو، پھر ان کی یکسوئی، ان کا انہماک، دنیا سے ان کی بے نیازی سب کا ایک نرالا انداز ہوتا۔ دلی میں کچھ عرصہ پہلے جب کہ مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا ہم ایک طالب علم کو پاتے ہیں جو ناتوتہ سے تحصیل علم کے لئے دارالسلطنت میں آیا تھا، وہ طالب علم غریب تھا، اس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ تیل خرید کر چراغ جلاتا، اور اس کی روشنی میں راتوں کو پڑھتا، وہ اپنی کتاب لے کر سڑک پر نکل آتا، سرکاری لالٹین کے نیچے کھڑا ہو کر مطالعہ میں مصروف ہو جاتا اور اسی حالت میں رات گزار دیتا، ایک دن وہ حسب معمول اپنی کتاب لئے کھڑا تھا کہ کسی مغل شاہزادے کا جلوس نکلا۔ آگے آگے مشعل بردار مشعلیں لئے چل رہے تھے، اس طالب علم کو روشنی فراواں ملی تو بہت خوش ہوا، اسی روشنی کے ساتھ چلنے لگا کہ مطالعہ میں آسانی ہوگی، شاہزادے کے حاشیہ برداروں میں کسی نے اس کو دھکا دیا کہ ہٹو، دیکھو شاہزادے کی سواری آرہی ہے۔ اس غریب

طالب علم نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ شاہزادہ دولہا بنا ہوا ساز وسامان سے مرصع ہاتھی پر بیٹھا ہوا ہے۔ طالب علم نے منہ بگاڑ کر کہا کہ بڑا آیا ہاتھی پر بیٹھنے والا، اگر کافیہ (علم نحو کی مشہور کتاب) کا ایک مسئلہ پوچھ دوں تو بغل جھانکنے لگے گا، اور پھر اپنے مطالعہ کی محویت میں مستغرق ہو گیا۔ پھر وہی طالب علم **استاذ العلماء** بنا۔ مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی **علیہما الرحمہ** کے استاذ محترم مولانا مملوک العلی صاحب علیہ الرحمہ۔

یہ ایک مثال ہے، تاریخ میں اس جیسی مثالیں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ آج بھی طالب علم جب مدرسے میں داخل ہوتا ہے تو اس کے سامنے طلب علم کے یہی تقاضے آجاتے ہیں۔ اگر وہ ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے تو دیر نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ اسے گوہر مقصود سے نواز دیتے ہیں، اور اگر وہ ان تقاضوں سے صرف نظر کرتا ہے تو بجھ کر رہ جاتا ہے۔

سبق کے ناغہ کی گرانی:

''تذکرۃ الرشید'' میں سرگروہ علمائے حق، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی قدس سرہٗ کی طالب علمی کے متعلق پڑھا تھا کہ دلی میں وہ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ اپنے استاذ مولانا مملوک العلی نانوتویؒ سے منطق کی مشہور کتاب ''سلم العلوم'' پڑھ رہے تھے۔ اس کا سبق صرف جمعہ کو ہوتا تھا کہ اور اوقات اور ایام میں دوسرے اسباق تھے، ایک جمعہ کو مولانا پڑھانے بیٹھے ہی تھے کہ ایک بزرگ سیدھے سادھے تشریف لائے، مولانا نے فرمایا کہ لو بھائی! حاجی میاں آگئے، آج سبق نہیں ہوگا۔ دونوں طالب علموں کو سبق کا ناغہ بہت گراں گزرا، اس کے بعد بھی کسی جمعہ کو وہی صاحب تشریف لے آئے، استاذ نے پھر ان کی وجہ سے سبق موقوف کر دیا۔ مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا یہ عجیب بزرگ ہیں۔ ان کی وجہ سے ہمارے سبق کا ناغہ ہو جاتا ہے۔ یہ بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نور اللہ مرقدہٗ تھے، اور یہ دونوں طلباء بعد میں انھیں کے مرید اور خلیفہ ہوئے۔

لیکن سبق کا اتنا اہتمام تھا کہ ان کی بزرگی کے ادب واحترام کے باوجود ناغہ کی گرانی کو چھپا نہ سکے۔

عالی ہمتی:

خود مولانا محمد یحییٰ صاحب علیہ الرحمہ نے طالب علمی کے زمانے میں طے کیا کہ دہلی میں استاذ سے حدیث کی کتابیں نہیں پڑھنی ہے، کیونکہ وہاں غیر مقلدیت کے اثرات پھیلے ہوئے تھے تو چھ ماہ بستی نظام الدین میں بنگلہ والی مسجد میں کے ایک حجرے میں اس طرح روپوش ہوئے کہ قریبی لوگوں کو بھی اطلاع نہ ہوئی کہ یہ یہیں ہیں، اس دوران انھوں نے شروح وحواشی کی مدد سے حدیث کی کتابیں مطالعہ کر ڈالیں، اور جب ان کا امتحان حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارن پوری نے لیا، تو ان کا تاثر یہ تھا کہ اس طالب علم کا علم اساتذہ سے بھی بڑھا ہوا ہے، پھر انھیں کی سفارش پر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ نے ضعف بصارت کے باعث دورۂ حدیث کے اسباق بند کر دینے کے باوجود مولانا محمد یحییٰ صاحب کے لئے درس جاری فرمایا۔ اور دو سال میں یہ درس پورا ہوا۔ مولانا کی عالی ہمتی کا ظہور یہاں بھی ہوا کہ اس دو سال کے درس میں ایک حدیث کا بھی ناغہ نہیں ہوا۔ اور حضرت کے درس کی اردو تقریریں عربی میں مرتب کیں۔

آج بھی اگر طلبہ اپنے اندر عالی ہمتی پیدا کر لیں، تو کوئی معنیٰ نہیں کہ محرومی کا شکار ہوں، اور جو طلبہ اس پر کاربند ہیں، وہ واقعی بلند رُتبہ پاتے ہیں۔

طالب علم کی قدر:

حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی کا قصہ بھی بہت عجیب ہے۔ یہ مولانا فضل حق، ہدیہ سعیدیہ کے مصنف، زبردست عالم ہیں، منطق وفلسفہ اور ادب کے امام ہیں، ان کے والد گرامی مولانا فضل امام صاحب بھی بڑے عالم تھے۔ منطق کی مشہور کتاب ''مرقات'' انھیں کی تصنیف ہے، طلبہ پر بے حد شفقت فرماتے تھے، ان کے ایک شاگرد مولانا غوث علی شاہ تھے، بڑے آزاد مزاج اور دنیا جہاں کے سیاح۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ جب ہم رامپور گئے تو مولانا فضل حق صاحب سے ملاقات ہوئی، ایک روز پچھلی باتوں کا ذکر آ گیا، اپنے والد بزرگوار (مولانا فضل امام صاحب) کو یاد کر کے روتے رہے، ہم نے کہا، مولوی صاحب! آپ کو وہ دن بھی یاد ہے کہ مولوی صاحب نے تھپڑ مارا تھا اور آپ کی دستارِ فضیلت دور جا گری تھی، ہنسنے لگے اور فرمایا کہ خوب یاد ہے وہ عجیب زمانہ تھا، اور وہ قصہ اس طرح تھا کہ مولانا فضل امام صاحب نے ایک طالب علم سے فرمایا

کہ جاؤ فضل حق سے سبق پڑھ لو، وہ تھا غریب آدمی، بدصورت، عمر زیادہ علم کم، ذہن کند، یہ نازک طبع، ناز پروردہ، جمال صورت و معنیٰ سے آراستہ، چودہ برس کا سن وسال، نئی فضیلت، ذہن میں جودت، بھلا میل ملے تو کیسے ملے؟ اور صحبت راس آئے تو کیوں کر آئے؟ تھوڑا سبق پڑھا تھا کہ بگڑ گئے، جھٹ اس کی کتاب پھینک دی، اور برا بھلا کہہ کر نکال دیا، وہ روتا ہوا مولانا فضل امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سارا حال بیان فرمایا، فرمایا: بلاؤ اس خبیث کو، مولوی فضل حق صاحب آئے اور دست بستہ کھڑے ہوگئے، مولانا صاحب نے ایک تھپڑ دیا اور ایسے زور سے دیا کہ ان کی دستار فضیلت دور جا پڑی اور فرمانے لگے، تو ظالم عمر بھر بسم اللہ کے گنبد میں رہا، ناز ونعمت میں پرورش پائی، جس کے سامنے کتاب رکھی اس نے خاطر داری سے پڑھایا، طالب علموں کی قدر ومنزلت تو کیا جانے، اگر مسافرت کرتا، بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی ارے طالب علمی کی قدر ہم سے پوچھو، خیر بھلا جانو گے، اگر ہمارے طالب علموں کو کچھ کہا، یہ چپ کھڑے روتے رہے، کچھ دم نہیں مارا، خیر قصہ رفع دفع ہوا، لیکن پھر کسی طالب علم کو کچھ نہیں کہا۔

☆☆☆☆☆☆

''تذکرہ شیخ ہالیجوی'' سے ماخوذ
عارف باللہ حضرت شیخ حماد اللہ صاحب ہالیجوی واقعات (۱)

مسجد جہاد:

امروٹ شریف کے قریب سے ایک نہر گزری ہے جو دریائے سندھ سے نکالی گئی ہے۔ اس کی راہ میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ انگریزوں نے طے کیا کہ اس کو شہید کر کے نہر وہاں سے گزار دی جائے اور اس کے بجائے دوسری مسجد بنا دی جائے۔ حضرت مولانا سید تاج محمود امروٹی علیہ الرحمۃ کو جلال آ گیا اور تسبیح لے کر اس میں جا بیٹھے۔ فقراء کی جماعت بھی ان کے ساتھ ہوگئی۔ انگریز کو چیلنج کر دیا کہ اب گراؤ مسجد۔ انگریز نے مسجد سے تعرض ترک کر کے اس کے نیچے سے زمین کھود کر نہر کو آگے بڑھایا اور مسجد کے نیچے وسط نہر میں مضبوط پائے بنا دیئے اور زمین کو پختہ کر دیا۔ وہ مسجد جوں کی توں بالکل بیچ نہر کے قائم ہے۔ یہ مسجد ''مسجد جہاد'' کہلاتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی زیارت:

حضرت اقدس نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھ کر ذکر میں مشغول تھا کہ سرکار دوعالم ﷺ تشریف لائے اور مجھ کو اپنے دونوں بازوؤں میں لے لیا۔ اس کے بعد مسجد کے باہر تشریف لے چلے، میں بھی ساتھ میں تھا جب دروازہ کے قریب پہونچے تو میں نے عرض کیا۔

''حضور والا میں کچھ لاتا ہوں۔ آپ نوش فرمائیں۔''

سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا۔ ''مولوی صاحب مجھے کھانے کی حاجت نہیں۔''

پھر دروازے سے باہر تشریف لائے اور اس گلی میں جو قدیم مسجد کے مشرق جانب تھی، اس میں داخل ہو کر شمال کی جانب روانہ ہوئے اور چلتے وقت ''**السلام علیکم**'' فرماتے ہوئے

نظروں سے غائب ہو گئے۔ اس طرح کی زیارت کا تعلق عالم مثال سے ہے، جسے عالم برزخ بھی کہتے ہیں، یہ آنکھوں کی دید نہیں، بلکہ کشف ہے، اولیاء امت پر یہ عالم گاہ گاہ منکشف ہوتا ہے اور انبیاء وصالحین کی ارواح طیبہ سے ملاقات ہوتی ہے اس عالم کی تحقیق حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں مفصل دلائل کے ساتھ مذکور ہے اور اس طرح کے احوال و واقعات اور دید وزیارت کی کیفیات شاہ صاحب نے انفاس العارفین میں بھی تحریر فرمائی ہیں۔

ذلیل ترین اپنا نفس:

حضرت ایک واقعہ بیان فرماتے تھے کہ ایک شخص ایک پیر کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے اپنے مریدوں میں داخل کر لیجئے۔ پیر نے کہا پہلے جاؤ اور دنیا میں پھرو اور اپنے سے ذلیل ترین شے میرے پاس لے کر آؤ پھر بیعت کروں گا۔

شخص مذکور اس ارادہ سے نکلا، اس کی نظر ایک نہایت کمزور کتے پر پڑی جو نہایت خراب وخستہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ اس کتے کو پیر صاحب کے پاس لے چلنا چاہیئے، جونہی کتے کو ہاتھ لگایا، کتے سے آواز آئی کہ میں تم سے بہتر ہوں اس لئے کہ میں حیوان ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں مجھ سے کوئی سوال نہیں ہوگا اور تیرے اعمال کی باز پرس قیامت میں ہونے والی ہے، پھر میں کس طرح تجھ سے ذلیل ہوں۔ اس شخص نے سمجھ لیا کہ کتا ٹھیک کہتا ہے، پھر اس نے دیکھا کہ ایک بھنگی نجاست اٹھا رہا ہے۔ اس نے خیال کیا کہ یہ نجاست مجھ سے ذلیل ہے، اس کو پیر صاحب کے پاس لے چلنا چاہیئے۔ نجاست سے آواز آئی کہ میں تم سے کمتر کیونکر ہوں؟ اس لئے کہ میں غلہ تھا، میوہ تھا، جب تم نے کھایا اور تیرے پیٹ میں پہونچا، تیرے باطن نے مجھے نجس کر دیا۔ پس تیرا پیٹ مجھ سے بدتر ہے کہ مجھ جیسے پاک وصاف میوے کو نجس اور پلید کر دیا۔ اس کے بعد وہ شخص اپنے پیر کے پاس لوٹا۔ پیر نے سوال کیا کہ اپنے سے کمتر کوئی چیز لائے؟ اس نے جواب دیا کہ اپنے سے بدتر اور کمتر میں کسی چیز کو نہیں پایا۔ پیر نے کہا اب تجھے بیعت کرتا ہوں۔

حضرت والا نے فرمایا کہ سالک کو چاہیئے کہ خود کو سب سے کمتر اور حقیر سمجھے۔ بعض دوستوں نے نقل کیا کہ ایک مرتبہ کوئی عالم پنجاب سے تشریف لائے تھے۔ انھوں نے حضرت والا

سے اجازت لے کر تقریر کی، اور تقریر میں حضرت والا کی بے حد تعریف وتوصیف فرمائی۔ جب وہ تقریر ختم کر کے بیٹھے تو چونکہ حضرت والا کو روبرو تعریف کرنی بہت ناپسند تھی اس لئے فرمایا کہ مولوی صاحب آپ نے اس قدر تعریف کی مگر میں اس گدھے کا بیوقوف مالک نہیں ہوں کہ آپ کی تعریف سے میرا نفس پھول جائے۔ ''من آنم کہ من دانم''

اور آپ نے اس گدھے کے مالک کا قصہ اس طرح بیان فرمایا کہ ایک شخص کے پاس نہایت خراب اور بے کار گدھا تھا کہ اگر اس کے اوپر سواری کریں تو سوار کو زمین پر گرادیتا۔ اگر سامان لادیں تو اس کو بھی زمین پر پھینک دیتا۔ وہ شخص اس گدھے سے تنگ آچکا تھا۔ اس نے سوچا کہ شہر میں لے جا کر اس کو فروخت کر دے۔

راستہ میں جانوروں کی خرید وفروخت کرانے والا ایک دلال ملا۔ اس نے پوچھا کہ اس گدھے کو کہاں لے جارہے ہو۔ اس نے کہا کہ فروخت کرنے کے لئے۔ دلال نے کہا مجھے دلالی میں دو میں فروخت کرادیتا ہوں۔ اس شخص نے منظور کرلیا۔ دلال گدھے کو بازار میں لے گیا اور اس گدھے کی بہت تعریف کرنے لگا کہ سواری میں نہایت تیز رفتار اور نہایت عمدہ باربردار ہے اور ایسا اچھا ہے اور ایسا اچھا ہے۔ اس گدھے کا مالک دلال کی تعریف سن کر ایسا مغرور ہوا کہ دلال سے کہنے لگا کہ ایسا گدھا میں کیوں بیچوں میں اس کو نہیں بیچتا۔ دلال نے کہا میاں تمہارا گدھا تو وہی ہے جو زمین پر گرادیا کرتا تھا۔ میں نے تو بیچنے کے لئے اس طرح تعریف کی اور تم اتنے احمق ہو کہ اس کی تعریف سن کر اترانے لگے اور بیچنے سے انکار کردیا۔

حضرت والا کے ہر ہر عمل سے تواضع وکسر نفسی ٹپکتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا مفتی فیاض نور صاحب (جو کہ حضرت والا کے مریدوں میں تھے اور حضرت کے ہم عصر بھی تھے) نے حضرت والا سے عرض کیا کہ کوئی کرامت دیکھنا چاہتا ہوں۔ حضرت والا نے فرمایا کہ میں اللہ تعالی کی زمین پر چل رہا ہوں اور اس کی دی ہوئی روزی کھا رہا ہوں اس سے بہتر کرامت کیا ہوسکتی ہے؟ ورنہ میرے اعمال تو ایسے ہیں کہ زمین پھٹ جاتی اور مجھے دھنسا دیا جاتا۔

خدا کا بھیجا ہوا:

میرے شیخ ومرشد حضرت مولانا عبدالواحد صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ ایک دیہاتی

ننگے پاؤں آیا۔اس کے پاؤں میں کیچڑ لگی ہوئی تھی ۔اس نے مسجد میں داخل ہونے کے لئے جلدی جلدی پاؤں دھویا۔کچھ مٹی صاف ہوئی اور کچھ پاؤں میں لگی رہ گئی ۔اسی حالت میں وہ حضرت صاحب کے پاس آیا ۔حضرت صاحب مصلے پر تشریف فرما تھے،وہ دوسری طرف سے آیا اور حضرت صاحب کے قریب ہوتا چلا گیا۔یہاں تک کہ اس کا وہ پاؤں جس پر مٹی لگی ہوئی تھی،ٹھیک اس جگہ پڑا جہاں سجدے میں حضرت صاحب کی پیشانی پڑتی تھی ۔مجھے یہ دیکھ کر سخت الجھن ہوئی ۔ حضرت صاحب کے سامنے اسے ٹوکنا بے ادبی تھی ۔میں منتظر رہا کہ حضرت صاحب دوسری طرف متوجہ ہوں تو اسے تنبیہ کروں ۔حضرت صاحب نے دوسری طرف توجہ کی اور میں نے انگلی سے اس کو ایک ٹھوکا دیا۔زبان سے کچھ نہ کہا،حضرت صاحب نے فوراً فرمایا۔نہیں بیٹا! کچھ نہ کہو،اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہے۔

اندازہ کیجئے کہ آنے والے پر نگاہ نہ ہوتی ،نگاہ اس پر ہوتی تھی کہ اللہ کی مشیت سے یہ شخص آیا ہے ۔اور جب اس ذات عالی تک نگاہ پہنچ گئی تو ظاہر ہے کہ اس کا ادب غالب آ کر رہا۔اب نگاہ میں نہ آنے والا یہ شخص ہے اور نہ اس کی بے ادبی ہے،بس نظر میں ایک اللہ کی ذات عظیم ہے۔اللہ اکبر!استحضار کی یہ شان تھی۔

انگریز اور انگریزیت سے نفرت:

انگریز اور انگریزیت کے سلسلے میں حضرت اقدس اس قدر حساس تھے کہ انہوں نے اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کبھی گوارا نہیں کی ۔وہ اس قافلہ غیرت وحریت میں شامل تھے جس نے انگریزوں سے کبھی صلح نہیں کی ۔حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء میں جہاد کیا ۔انہوں نے اپنے کرتے میں کبھی انگریزی بٹن نہیں لگائے ۔ان کے استاذ حضرت مولانا مملوک العلی صاحب نانوتوی علیہ الرحمۃ کو کسی مجبوری سے ایک انگریز افسر سے مصافحہ کرنا پڑا تو اسے الگ کئے رہے تا آنکہ اس کو صابن سے خوب خوب صاف کیا۔حضرت نانوتوی کے شاگرد حضرت شیخ الہند کو انگریزوں سے جتنا تنفر تھا، دنیا جانتی ہے۔ان سے کسی نے کہا کہ حضرت! انگریزوں میں کوئی خوبی بھی ہے،تو ہنس کر فرمایا کہ ہاں ان کے کباب بہت اچھے ہوں گے۔خوبی بھی بتائی تو ایسی جس میں ان کی ہلاکت ہو۔خود حضرت انگریزوں کے خلاف جہاد میں ہمیشہ سرگرم

رہے۔اور انگریزوں نے انہیں زہر بھی دلوایا تھا جس کی تکلیف انہیں اخیر عمر تک رہی۔

حضرت اقدس علیہ الرحمۃ اس سلسلے میں اتنے حساس تھے کہ خود فرمایا کہ:

''گھڑی میں جو ہندسے انگریزی میں لکھے ہوئے ہیں، میں نے اب تک ان کو پہچاننے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایک سے شمار کرنا شروع کرتا ہوں، اور پھر وقت معلوم کرتا ہوں۔

غفلت کا علاج:

مرشدی حضرت مولانا عبدالواحد صاحب مدظلہ کے حوالے سے تجلیات میں لکھا ہے کہ:

''ایک مرتبہ رمضان المبارک میں چند احباب کے ساتھ بالخصوص مولانا حافظ عبدالجلیل صاحب خلیفہ مجاز حضرت والا، حضرت مفتی فیاض نور صاحب مرحوم اور حاجی محمد عثمان صاحب معتکف تھا۔مغرب کے بعد کا وقت تھا، حضرت والا (رمضان کے معمول کے مطابق) نماز سے فارغ ہوکر گھر تشریف لے جا چکے تھے۔ہم لوگ کھانا کھا کر غفلت کی حالت میں آپس میں کچھ ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے، ہم لوگ مسجد کے اندرونی حصہ میں مغربی دیوار سے لگ کر شمالی جانب بیٹھے ہوئے تھے۔اچانک دیکھا کہ مسجد کے برآمدے سے نکل کر آپ دروازے پر کھڑے ہیں، ہم سب لوگ اچانک کھڑے ہوگئے اور گھبرا گئے کہ حضرت والا تو گھر جا چکے تھے پھر اچانک کیسے تشریف لائے؟ چند سکنڈ آپ کھڑے رہے، پھر واپس برآمدے میں چلے گئے۔

ہم لوگ مختلف دروازوں سے دوڑ کر حضرت والا کے پیچھے گئے کہ معلوم کریں کہ کیا سبب ہے، اچانک آنے کا؟ مگر ہر طرف دیکھنے کے بعد آپ کسی کو نظر نہ آئے، مزید حیرت اس پر ہے کہ دروازے کے سامنے ایک اور جماعت اہل سندھ کی مصروف گفتگو تھی، ان کو بالکل خبر نہیں ہوئی۔''

سرمد کی رباعیاں:

حضرت کے خلفاء میں دہلی کے رہنے والے مولانا حکیم جمیل الدین تھے یہ صاحب علم تھے، انہیں کہیں سے سرمد کی رباعیاں مل گئیں۔سرمد ایک مختلف فیہ شخصیت ہے، ننگے رہا کرتے تھے قید شریعت سے آزاد تھے، عالمگیر کے زمانے میں قتل کئے گئے ان کی رباعیاں مشہور ہیں۔

حکیم صاحب کو وہ رباعیاں مل گئیں انہیں بہت پسند آئیں۔حضرت اقدس کی خدمت میں جارہے تھے راستے میں اس کا مطالعہ کرتے ہوئے گئے۔پنوعاقل اترے تو سامان کی گٹھری اور

اس میں رباعیات سرمد وہیں ایک صاحب کے یہاں رکھ دی۔ اور حاجی شریف حاضر ہوئے۔ حضرت ان سے بہت خصوصی برتاؤ کرتے تھے مگر آج جو پہنچے تو سلام کا جواب بھی نہیں دیا نہ ان کی طرف کوئی التفات کیا، نہ کچھ بولے۔ دن بھر اسی حال میں گزر گیا۔ یہ سخت پریشان ہوئے کہ الٰہی! ماجرا کیا ہے؟ انتہائی شفقت ومحبت سے نوازے جاتے تھے اب جو یہ بے رخی دیکھی تو سارے گناہ یاد آنے لگے، توبہ کرتے رہے، دعا مانگتے رہے، غور کرتے رہے مگر حضرت متوجہ نہیں ہوئے۔

دوسرے دن اچانک یاد آیا کہ سرمد کی رباعیاں میرے پاس ہیں ہو نہ ہو اسی کا اثر ہے کہ ایک خلاف شرع شخص کا کلام میرے پاس ہے، بھاگے ہوئے پنوعاقل پہنچے اور رباعیات سرمد نکال کر اسے پھاڑ کر جلا دیا۔ پھر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اب جو آئے تو وہی کرم، وہی نوازشیں، وہی سلام وکلام اور التفات تام۔ (بروایت مرشدی مدظلہ)

سندھی صاحب کے حوالے کرو:

پاکستان کے مشہور عالم قادیانیوں کے خلاف جہاد کرنے والے حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی علیہ الرحمہ کو ایک مرتبہ حکومت پاکستان نے بغاوت کا الزم لگا کر گرفتار کرلیا۔ کسی طرح ضمانت نہیں ہو رہی تھی، بہت کوشش ہوئیں مگر ضمانت نہیں ہوسکی، تمام علماء و رفقاء سخت فکرمند تھے۔ دعائیں ہو رہی تھیں، تدبیریں کی جارہی تھیں مگر بظاہر کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔

قاضی صاحب نے جیل میں خواب دیکھا کہ کئی اکابر جمع ہیں۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا مفتی کفایت اللہؒ صاحب اور دوسرے حضرات، اور آپس میں یہی گفتگو ہو رہی ہے کہ ان کی ضمانت کے سلسلے میں کیا کیا جائے؟ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک بہت لمبے تڑنگے اور بہت بھاری جسم وجثہ کے بزرگ آئے، ان کے آتے ہی حضرت مدنیؒ نے فرمایا لیجئے! سندھی صاحب آگئے اب معاملہ ان کے حوالے کیا جائے، یہی کچھ کریں گے۔ پھر ان سندھی بزرگ نے مجھے اپنی گود میں پکڑا اور فرمایا چلئے قاضی صاحب یہاں سے چلئے۔ اسی پر آنکھ کھل گئی۔

دوسرے روز ضمانت منظور ہوگئی۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ میں نہایت حیران تھا کہ

یہ سندھی صاحب کون ہیں؟ میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ متعدد لوگوں سے پوچھا کہ، حلیہ بتا کر پوچھا مگر ہر ایک نے لاعلمی ظاہر کی۔ بالآخر ایک شخص نے حلیہ سن کر جواب دیا کہ یہ تو میرے پیرو مرشد حضرت مولانا حماد اللہ صاحب ہالیجی شریف والے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے ان کی خدمت میں لے چلو۔

قاضی صاحب جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ بعینہ خواب والے بزرگ تشریف فرما ہیں اور تفسیر مظہری کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ مطالعہ سے جب فارغ ہوئے تو بطریق مسنون ہر ایک سے نام وغیرہ دریافت کرتے رہے، قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ مجھ سے پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ احسان احمد، آپ نے بے ساختہ فرمایا کہ قاضی احسان احمد شجاع آبادی۔ عرض کیا جی ہاں۔ آپ کھڑے ہو گئے اور معانقہ فرمایا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر تفسیر ملاحظہ کرتے رہے اس کے بعد تقریر شروع کی۔

قاضی صاحب نے تین بار قسم کھائی کہ واللہ، باللہ، تاللہ میرے دل میں چند شکوک و شبہات تھے، حضرت والا نے تقریر میں میرے شکوک وشبہات کا ازالہ فرما دیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرے تمام شبہات لکھے ہوئے حضرت والا کے سامنے ہیں اور آپ ایک ایک کا جواب مرحمت فرما رہے ہیں۔ الحمدللہ میرے تمام شکوک وشبہات حضرت والا کی ایک ہی تقریر سے کافور ہو گئے۔

قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مجھے مسجد سے باہر کمرے کی طرف لے گئے میرے لئے روٹی منگوائی، چاول کی روٹی اور مٹر کی دال تھی۔ آم بھی تھے۔ حضرت والا آم خود اپنے دست مبارک سے کاٹ کر مجھے دے رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ آم بہت میٹھے ہیں، میں روٹی کھا رہا تھا، مجھے اس قدر لذیذ معلوم ہو رہی تھی کہ اس سے پہلے کبھی کسی کھانے میں اتنی لذت نہیں محسوس ہوئی تھی۔ حالانکہ میں نے سینکڑوں لذیذ و مکلّف کھانے کھائے ہوں گے مگر ایسی لذت کبھی کسی کھانے میں نہیں محسوس ہوئی، کھانے سے جب فارغ ہوئے تو صاحبزادۂ محترم حضرت حافظ محمود اسعد صاحب سے فرمایا کہ قاضی صاحب کو کھانے کے بعد میٹھا کھانے کی عادت ہے، میٹھا لے آؤ۔

انہوں نے میٹھا لا کر مجھے دیا مجھے واقعی کھانے کے بعد میٹھا کھانے کی عادت تھی مگر

حیرت تھی کہ حضرت کو کیونکر علم ہوا۔ (بروایت مرشدی مدظلہ تجلیات ص ۳۸)

نظر کی تاثیر:

مولوی محمد ابراہیم صاحب ساکن ہالیجی شریف بیان کرتے ہیں کہ حضرت والا کی وفات کے بعد کی بات ہے، اس زمانے میں مولوی مظہر الدین صاحب ہالیجی شریف کے مدرسہ میں مدرس تھے۔ میں بھی یہاں تھا۔

ایک دن مسجد کے جنوب کی طرف بیٹھے ہوئے ہاتھ میں کتاب لئے مطالعہ کررہا تھا کہ ایک شخص زمیندار بھاولپور کا ہالیجی شریف میں آیا ہوا تھا، میرے نزدیک آکر بیٹھ گیا، میں نے اس شخص سے کہا کہ تم یہاں کیسے آئے ہو؟ اس نے کہا کہ میں حضرت والا کے عقیدت مندوں اور مریدوں میں سے ہوں۔ اس شخص نے اپنے مرید ہونے کا واقعہ بیان کیا اور کہا کہ میرے باپ دیندار اور صالح شخص تھے اور میں بھی دینداری کی طرف رغبت رکھتا تھا اگرچہ عربی خواں نہ تھا لیکن مطالعۂ کتب کا شوق بہت تھا۔ اکثر کتب تفسیر وحدیث مترجم اردو میرے زیر مطالعہ رہا کرتی تھیں اور علم دین سے بہت واقفیت رکھتا تھا۔

اتفاقاً میرے دل میں تبدیلی ہوئی کہ دہریت کی طرف مائل ہوگیا۔ بہت سے شبہات پیدا ہوگئے تاہم دل میں حق کی طلب تھی۔ خیال کرتا تھا کہ کسی ولی اللہ کی خدمت میں جاؤں تاکہ شکوک وشبہات حل ہوجائیں اور وہ راہ راست کی طرف میری رہبری کریں۔ ایک دوست جو کہ عالم بھی تھے اور رفیق بھی تھے میں نے ان سے کہا کہ آپ میرے ساتھ ہندوستان چلیں تاکہ وہاں کسی ولی اللہ سے اپنے شبہات حل کروں اور ان سے بیعت کرکے مرید ہوجاؤں۔

ان مولوی صاحب نے کہا کہ ہندوستان کے سفر کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سندھ میں ایک ولی کامل ہیں۔ جو کہ میرے مرشد ہیں آپ کو ان کی خدمت میں لے چلتا ہوں وہ آپ کے شکوک وشبہات کو دور کردیں گے اور آپ کو اطمینان قلب حاصل ہوجائے گا۔

مجھے اس پر یقین نہیں آتا تھا کہ سندھ میں ایسا ولی کامل کہاں ہوگا؟ میں نے ان مولوی صاحب سے بہت دفعہ کسی اولیاء اللہ کے لئے کہا، وہ مولوی صاحب ہمیشہ مجھے یہی جواب دیتے تھے کہ آخر ایک بار میرے ساتھ میرے مرشد کے پاس سندھ چلو تاکہ آپ کے شبہات دور ہو

جائیں اور اطمینان خاطر ہو جائے۔ اگر وہاں آپ کے دل کو تسکین نہ ہو تو پھر آپ جس جگہ کے لئے کہیں گے میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔

آخر کار میں ان مولوی صاحب کے کہنے پر ان کے ساتھ حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوا، اور خدمت اقدس میں بیٹھ گیا، جس طرح حضرت والا کی عادت تھی کہ ہر ایک آنے والے سے خیریت و عافیت دریافت کرتے اور نام پوچھتے تھے اور یہ کہ کہاں سے آئے ہو، وغیرہ، لیکن مجھے فقط خوش عافیت کہا اور کچھ نہیں پوچھا۔

عصر کی نماز کے لئے اذان کہی گئی، جماعت صف باندھ کر بیٹھ گئی۔ میں جنوب کی جانب صف میں بیٹھا تھا جب اقامت کہی گئی اور حضرت والا اٹھے اور جنوب کی جانب منہ کر کے کھڑے ہو گئے اور ازار (تہبند) باندھ رہے تھے، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شعاع مثل شعاع بجلی کے حضرت والا کے سینے سے میرے سینے اور قلب پر پڑ رہی ہے، اس سے میرے قلب میں ذکر جاری ہو گیا۔

اور پھر میرا یہ حال ہوا کہ میرے سارے بدن سے اور در و دیوار اور درختوں سے ذکر سنائی دینے لگا اس وقت ہر چیز کو میں ذاکر دیکھتا تھا، اس کے بعد عام شبہات قلب سے ختم ہو گئے۔

اس واقعہ کے بعد میرے رفیق مولوی صاحب نے حضرت والا سے اجازت مانگی کہ میرے رفیق کو آپ سے کچھ پوچھنا ہے اور مجھ سے کہا کہ تم کو حضرت والا سے جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو۔ میں نے کہا کہ میرے شبہات حل ہو گئے پوچھنے کی کوئی بات نہیں رہی۔

رہائی کی عجیب صورت:

امروٹ شریف اس زمانے میں تحریک ریشمی رومال کا زبردست مرکز تھا، اور جہاد آزادی کے لئے وہاں مکمل تیاری تھی۔ حضرت مولانا تاج محمد امروٹی (شیخ حماداللہ کے پیرو مرشد) کے پاس بھی ریشمی خط آیا تھا، لیکن اللہ کو منظور نہ تھا، ریشمی رومال تحریک کا راز افشاء ہو گیا اور پورے ملک میں گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ حضرت شیخ الہند اپنے چار پانچ رفقاء کے ساتھ گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے۔ ہندوستان میں تحریک کے مراکز پر چھاپے مارے گئے۔ حضرت مولانا سید تاج محمود علیہ الرحمۃ بھی گرفتار ہوئے مگر کوئی ثبوت نہ مل سکا۔ اس لئے رہا کر دیئے گئے۔

کہتے ہیں کہ آپ کی رہائی آپ کی کرامت کی وجہ سے ہوئی۔ مشہور ہے کہ آپ کو کمشنر

کراچی کی کوٹھی میں نظر بند کیا گیا تھا۔ وہ ایک انگریز تھا۔ اچانک اس کی میم کو آشوب چشم کی شکایت پیدا ہوئی اس قدر تکلیف بڑھی کہ درد کے مارے چیخیں مارتی اور فرش پر لوٹتی تھی، کراچی کے تمام ماہر ڈاکٹروں نے علاج کیا، مگر کچھ بھی افاقہ نہ ہوا۔ کمشنر کے ایک مسلمان خانساماں نے اس کو حضرت کے پاس جا کر دعا کرانے کا کا مشورہ دیا۔ وہ کب اسے قبول کرتا؟ مگر بیوی کی تکلیف دیکھی نہ جاتی تھی۔ مجبوراً حاضر خدمت ہوا۔ آپنے اپنے استعمال کے سرمہ میں سے ایک سلائی میم صاحب کی آنکھوں میں لگانے کے لئے دی، سلائی پھیرتے ہی درد کافور ہوگیا۔ اور آنکھیں ٹھیک ہوگئیں۔ کمشنر نے اسی وقت حضرت کی رہائی کا حکم دے دیا۔

معبود مر گیا:

ایک بزرگ کسی بادشاہ کے پاس گئے، بادشاہ نے کہا کہ ہمارے ہاں ایک ایسا بزرگ ہے جو بارہ ماہ کے بعد رزق کھاتا ہے، بزرگ نے کہا کہ اس کو رزق ملتا ہے۔ کہا گیا کہ ہم دیکھ رہے ہیں وہاں کوئی جاتا نہیں، بزرگ نے کہا اس درویش کے باہر نکلنے کا موقع کون سا ہے؟ اس کو اس خاص موقع پر نہ نکالو بلکہ تین دن کے بعد نکالو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، اس دن لوگ وہاں نہیں پہنچے نہ بادشاہ آیا، نہ عوام آئی۔ وہ بزرگ معمول کے مطابق اس خاص موقع پر باہر نکلا اور کوئی آدمی اسے نظر نہیں آیا۔ اس نے دل میں کہا کہ وجہ کیا ہے کہ لوگ آئے نہیں؟ لوگ بدظن ہوگئے اور میری عزت چلی گئی۔ تین دن کے بعد بادشاہ گیا تو دیکھا کہ وہ مرا پڑا ہے بزرگ نے کہا کہ دیکھو تین دن میں ہی معبود اس کا مر گیا اگر بارہ مہینے تک روٹی نہ کھا کر بچ سکتا تھا تو تین دن میں کیوں نہیں بچ سکا، بات یہ ہے کہ اس کا نفس تھا اور وہ نفس کو راضی رکھتا تھا اور اس میں وہ گم تھا۔ اب نفس کی عزت نہیں ہوئی تو وہ مر گیا۔ (گویا لوگوں کے درمیان اس کی عزت ہونا اس کے لئے رزق تھا)

نفس نتواں کشت الا ظل پیر
دامن آں نفس کش راسخت گیر
راہ پرخوف است دزدان درکمیں
رہبرے بر تا نمانی بر زمیں

نفس کو صرف پیر کا سایہ ہی کچل سکتا ہے، اس نفس کش کا دامن مضبوطی سے تھام لو، راستہ

خطرناک ہے، لٹیرے گھات میں ہیں، اس لئے رہبر کو ساتھ لے لو تاکہ زمین پر نہ گر جاؤ۔
اسی لئے کہا گیا ہے کہ ''یک زمانہ صحبت با اولیاء۔''

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱)　شیخ حماد اللہ ہالیجوی علیہ الرحمہ کے تفصیلی حالات جاننے کے لئے دیکھئے حضرت مولانا کی کتاب ''تذکرہ شیخ ہالیجوی''۔

’’حضرت چاندشاہ صاحب اوران کے خانوادۂ تصوف‘‘ سے ماخوذ واقعات (۱)

عجیب تجارت:

مولانا عبدالغفار صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا ابوالحسن صاحب اپنے رسالہ ضیاء الایمان میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

مولف رسالہ کے والد بزرگوار شیخ عبداللہ صاحب مئوی مرشد کامل مقتدانا حضرت چاند شاہ کی مبارک خدمت میں تین برس تک رہے۔ والد صاحب مرحوم مغفور کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ کئی روز فاقے ہوئے (والد صاحب مرحوم بھی اس وقت خدمت میں رہا کرتے تھے) تمام چودہ اشخاص علاوہ اہل وعیال کے مقیم خانقاہ تھے، بھوک کی پریشانی میں جب ہم لوگ حضرت مرشد قدس سرہٗ کا چہرہ دیکھتے تھے تو بھوک مرجایا کرتی۔ تین دین کے بعد آپ نے مریدوں کو بلا کر کہا کہ فاقہ دعوتِ خداوندی ہے یعنی اس سے مدارج میں ترقی ہوتی ہے۔ پھر فرمایا کہ اب جی چاہتا ہے کہ کوئی تدبیر کروں، اچھا! احاطہ میں گھوڑی بندھی ہوئی گھاس کھارہی ہے۔ اس کے پاس سے گھاس ہٹادو اس کو دیں گے (یعنی اللہ تعالیٰ) ہم کو نہیں دیں گے۔ لوگوں نے فوراً گھاس ہٹادی، اب وہ بھی فاقہ میں شریک کرلی گئی، تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص آیا اور دو روپئے پیش کئے، آپ نے قبول فرمائے، اوراس کو دعائے خیر دے کر رخصت کیا، پھر لوگوں سے فرمایا کہ دیکھو دو روپئے اللہ تعالیٰ نے بھیجے ہیں، مگر یہ بہت کم ہیں۔ لہٰذا جی چاہتا ہے کہ تجارت کروں، مریدین خاموش تماشا دیکھ رہے تھے، پھر آپ گوشہ سے اٹھ کر روانہ ہوئے، مریدین بھی پیچھے چلے کہ دیکھیں یہ کہاں جاتے ہیں؟ اور دو روپیہ لے کر آج تجارت کیا کریں گے؟ جب دروازہ پر پہونچے، ایک فقیر ایک طرف سے آگیا، آپ نے اس کو دونوں روپئے دے دئے پھر آپ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے، کچھ عرصہ گزرا

کہ ایک شخص خانقاہ میں آیا، اور ستر روپئے اور کچھ کپڑے وغیرہ پیش کئے، آپ نے مریدوں سے کہا کہ دیکھا ہم نے تجارت کی تو کس قدر نفع ہوا، اس کے بعد حسب عادت مستمرہ چالیس دن کی خرچی منگائی، باقی سب فقراء وطلبہ کو تقسیم کر دیا، شام تک نہیں رکھا، **سبحان اللہ**. کس قدر استغناء دل کے اندر تھا، اور خدا پر توکل اور اس کے وعدہ پر یقین۔ **ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم**.

اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ:

مولانا ابوالحسن صاحب رسالہ ضیاء الایمان میں لکھتے ہیں کہ:

اوائل زمانہ میں جب حضرت قدوۃ العارفین، رہنمائے سالکین مرشدنا حضرت چاندشاہ صاحب قدس سرہٗ ٹانڈہ میں عزلت گزیں ہوئے، تو ایک شیعہ آپ کا معتقد ہو کر آپ کے خدام میں داخل ہوا، اور مذہب باطل سے تائب ہو کر سنت جماعت میں داخل ہوا، اور اپنے گھر کے تمام لوگوں کو سنت جماعت بنالیا، اور حضرت کا معتقد کر دیا، اور تعزیہ داری کا سب سامان جلا کر فنا کر دیا، ایک بھائی اس کا لکھنؤ رہتا تھا، جب محرم کا زمانہ آیا، تعزیہ کے خیال سے ٹانڈہ آیا، یہاں آ کر دیکھا تو معاملہ دگرگوں ہے، نہ کوئی سامان ہے، نہ کوئی انتظام، اور خیالات میں تغیر ہے، بہت ناراض ہوا، اس کے بھائی نے قصہ کہہ سنایا کہ ہم لوگ حضرت کے ہاتھ پر تائب ہو گئے ہیں اور سامان تعزیہ سب جلا دیا ہے۔

یہ سنتے ہی اس کے بدن میں آگ لگ گئی، اور تلوار میان سے نکال کر حضرت مرشد کی تلاش میں نکلا کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ حضرت کو کسی نے آ کر قصہ سنایا، اور کہا کہ آپ مکان کے اندر چلے جائیے، آپ نے فرمایا کہ چپ رہو، خدا کے گھر سے بڑھ کر جائے پناہ کہاں ہے؟ اتنے میں وہ پہونچ گیا، اور کہا فلاں شخص تمہیں ہو؟ آپ نے فرمایا مجھی کو کہتے ہیں، پھر کہا آپ ہی تعزیہ کو منع کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا میں کیا خود خدائے عزوجل منع فرماتے ہیں۔ لاؤ قرآن مجید میں دکھلاؤں، قرآن مجید مسجد میں موجود تھا۔ اس نے چاہا کہ ہاتھ لگاؤں، آپ نے فرمایا خبردار بلا وضو ہاتھ نہ لگانا، وہ تلوار رکھ کر وضو کرنے گیا۔ جب وضو کر کے آیا، اور قرآن شریف لے کر پہونچا، آپ نے سورہ صافات کی آیت کا ٹکڑا نکال کر دکھلایا **اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ** یعنی تم اس چیز کو

پوجتے ہو، جسے خود تراشتے اور بناتے ہو۔ پھر فرمایا ترجمہ اس کے ساتھ موجود ہے، دیکھ اس سے تعزیہ کی ممانعت ثابت ہوتی ہے، اگر میرا یقین نہ ہو، کسی اور عالم کے پاس جا کر اس کا معنی دریافت کر، اس نے کہا حضرت جب قرآن مجید میں ممانعت ہے، تو میں بھی توبہ کرتا ہوں، مجھے بھی مرید کرلیجئے۔ چنانچہ وہ بیعت ہوکر وہاں سے واپس ہوا۔

عجیب وغریب:

حضرت مولانا ضمیر احمد صاحب علیہ الرحمۃ نے حضرت چاند شاہ صاحب قدس سرہٗ کا ایک اور عجیب واقعہ ذکر فرمایا، جسے آج کا مادیت زدہ ذہن آسانی سے قبول نہیں کرے گا، لیکن جو لوگ کرامات اولیاء کے معتقد اور قائل ہیں، ان کے لئے اس میں کوئی استبعاد نہیں ہے، اس سے شاہ صاحب کی قوت کشفیہ اور تاثیر دعا کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ پھولپور کے اطراف کے ایک صاحب حضرت چاند شاہ صاحب کے مرید تھے وہ بیمار ہوئے، انھوں نے اپنے ایک عزیز کو حضرت چاند شاہ صاحب کی خدمت میں دعا کرانے اور تعویذ لینے کے لئے بھیجا، شاہ صاحب کی عام عادت یہ تھی کہ جب بھی کوئی شخص آتا پہلے اس کی خاطر مدارات کرتے، پھر مقصد دریافت فرماتے، لیکن یہ شخص گرمی کی دوپہر میں ٹانڈہ حضرت کی خانقاہ میں پہنچا، حضرت سے ملاقات ہوئی، حضرت نے خلاف معمول فوراً پوچھا کہ کیسے آئے؟ اس نے پوری بات عرض کی، آپ نے دعا کی اور فوراً تعویذ لکھا، اور فرمایا کہ ایک دم بھاگے چلے جاؤ کہیں رکنا مت، اور روٹی اور گڑ لے لو، راستہ میں کہیں کھیت میں پانی چل رہا ہو تو کھا کر پانی پی لینا اور جس حالت میں مریض ہو۔ اسے ضرور باندھ دینا، وہ بیچارہ الٹے پاؤں بھاگا، ادھر یہ ہوا کہ وہ شخص مرگیا، لوگ اس کا انتظار کرتے رہے، پھر غسل وغیرہ دے کر کفن پہنا کر نماز جنازہ پڑھ لی، اور تھوڑا انتظار کر کے اسے قبر میں اتار دیا، اتنے میں دور سے وہ آدمی آتا ہوا دکھائی دیا، لوگ رک گئے، وہ آدمی دوڑتا ہوا آیا، اور ساری بات سنائی اور کہا کہ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا ہے کہ مریض جس حالت میں ہو اسے تعویذ پہنا دینا، لوگوں نے کہا کہ یہ مرگیا ہے، اب تعویذ پہنانے سے کیا فائدہ؟ مگر شخص مذکور نے کہا کہ نہیں، حضرت کا حکم ہے تو اسے پہنایا جائے گا، لوگوں میں اختلاف رائے ہوا، مگر اس شخص مذکور کے اصرار، حضرت کے حکم، اور اس کی گرمی کے موسم کی سخت

دوڑ دھوپ کے پیش نظر یہ طے ہوا کہ تعویذ پہنا دیا جائے گو بے فائدہ ہی ہو، لیکن پہناتے ہی عجب تماشہ ظاہر ہوا، اس مردے میں حرکت ظاہر ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد سانس آنے جانے لگی، لوگوں نے فوراً قبر سے باہر نکالا، پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ زندہ واپس اپنے گھر آ گیا، بعد میں اطباء نے توجیہ کی کہ اسے سکتہ ہو گیا تھا، سکتہ کے مرض میں آدمی بالکل مردہ کی طرح ہو جاتا ہے، صحیح شناخت نہ ہو تو لوگ دفن کر دیتے ہیں، یہاں یہی قصہ ہوا اور اگر بالفرض مر بھی گیا ہو تو کیا خدا کی رحمت سے یہ کچھ بعید ہے کہ اسے دوبارہ زندہ کر دیا جائے۔ **وما ذالک علی اللہ بعزیز۔**

میرے دوست مولانا محمد عثمان معروفی، برادر خورد حضرت استاذی مولانا زین العابدین صاحب معروفی مدظلہ نے بتایا کہ یہ واقعہ موضع نیاؤج ضلع اعظم گڈھ کا ہے، اور اسے مرحوم مولانا بدرالدین اصلاحی سابق ناظم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر نے بھی بیان کیا ہے۔

خدمت خلق:

ایک روز اپنے دروازے سے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی کچھ سامان اپنے سر پر رکھے ہوئے اسٹیشن کی طرف جا رہا ہے، اس کا بڑھاپا اور بوجھ دیکھ کر طبیعت بھر آئی، کون آدمی ہے؟ کچھ معلوم نہیں، کہاں جائے گا؟ یہ بھی نہیں خبر، اس کی طرف دوڑ پڑے، پوچھا کہاں جانا ہے، اس نے بتایا کہ اسٹیشن جانا ہے، فرمایا میں بھی چلتا ہوں، لائیے میں بھی کچھ سامان لیتا چلوں، اس کی گٹھری لے لی، اور اسٹیشن تک پہونچا دیا، وہاں تک اس بوڑھے مسافر کو پہونچا کر شاہ صاحب واپس ہو گئے، اس بوڑھے آدمی نے لپری والے شاہ صاحب کا نام سن رکھا تھا، اسٹیشن لپری گاؤں سے بہت زیادہ دور نہیں تھا، اسٹیشن پہونچ کر اسے خیال آیا کہ شاہ صاحب سے مل لینا چاہئے، اس نے اسٹیشن ماسٹر سے گاڑی کے بارے میں دریافت کیا کہ اگر وقت میں گنجائش ہو تو لپری والے شاہ صاحب سے مل کر آ جاؤں۔ اسٹیشن ماسٹر شاہ صاحب سے واقف تھا، اس نے شاہ صاحب کو آتے ہوئے دیکھ بھی لیا تھا، اس نے کہا بڑے میاں! شاہ صاحب تو وہی تھے، جو تمہارے ساتھ یہاں تک آئے تھے، وہ بوڑھا دم بخود رہ گیا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس نے اتنی بشاشت سے اس کا سامان ڈھویا ہے وہ شاہ صاحب ہی ہوں گے۔

ایک بیوہ کی خدمت:

شاہ صاحب کی زندگی کیا تھی؟ خدمت خلق کا ایک حسین و دلآویز مرقع تھی، ایک سے بڑھ کر ایک خدمت! لیکن ان کے پوتے حضرت مولانا محمد عثمان صاحب علیہ الرحمہ ایک ایسی خدمت کی خبر دیتے ہیں جس کو پڑھ کر طبیعت دنگ رہ جاتی ہے، وہ حضرات جو شان مشیخت رکھتے ہیں، ان کے بارے میں اس طرح کے کام کا تصور بھی مشکل ہے، مگر شاہ صاحب کا رنگ ہی اور تھا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ گاؤں کی ایک بیوہ خاتون نے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں فریاد کی کہ میرا بیٹا کلکتہ میں ہے، اور آنے کا نام نہیں لیتا، شاہ صاحب کا دل اس کی اس مصیبت سے بے قرار ہوگیا، انھوں نے اسے تسلی دی، اور وعدہ کیا کہ میں تمہارے بیٹے کو لے کر آؤں گا، شاہ صاحب نے صرف اس مقصد کے لئے کلکتہ کا سفر کیا، اور وہ بھی پیدل! تن تنہا نکل پڑے، اللہ جانے کتنی مدت سفر میں لگی ہوگی؟ پھر کلکتہ میں اسے ڈھونڈھنے میں کتنی مشقت ہوئی ہوگی؟ مگر شاہ صاحب اسے لے کر ہی آئے، اور دکھیاری ماں کے حوالے کیا اور اس کی خوشی کا سامان کیا۔

طریقت بجز خدمت خلق نیست

کرامات:

سلطان شاہ صاحب بہت باکرامت بزرگ تھے، مگر ان حضرات کے یہاں کرامت سے بڑھ کر استقامت کا درجہ ہے، کرامات کی طرف نہ ان کو التفات تھا، اور نہ ان کے متوسلین کو اس کا زیادہ اہتمام تھا، مولانا محمد عثمان صاحب ایک مشہور کرامت کی خبری دیتے ہیں کہ ایک عورت نے شاہ صاحب کے پاس بطور امانت کے خاصی مقدار میں اشرفیاں اور چاندی کے سکے رکھے، اس کی خبر چوروں کو ہوگئی، رات میں چوروں نے گھر میں نقب لگائی اور ایک مقفل صندوق جس میں لوہا بھرا ہوا تھا باہر لے گئے، لیکن گھر سے نکلتے ہی راہ گم ہوگئی، صندوق کو گھر کے پاس ہی ایک کھیت میں چھوڑا، اور راستہ تلاش کرنے لگے، رات بھر سرگرداں رہے، مگر راستہ نہ ملا، اسی میں صبح ہوگئی، صبح کو چوروں نے شاہ صاحب سے معافی مانگی، چوری سے توبہ کی، یہ واقعہ ایسا مشہور ہوا کہ آج تک ان کے گھر کی طرف کسی نے نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی۔

شاہ صاحب کی اہلیہ محترمہ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتی تھیں، مگر جب کبھی شاہ صاحب

فرمادیتے کہ پڑھ تو مشکل کتابیں بھی بلا تکلف پڑھتیں، امام غزالی کی کیمیائے سعادت، شاہ صاحب کے حکم سے پڑھا کرتیں، لیکن یہ جبھی تک ہوتا جب تک شاہ صاحب موجود ہوتے، ان کے ہٹ جانے پر سابقہ حالت پر آجاتیں، وہ خود فرماتی تھیں کہ ان کے جانے کے بعد کچھ پتہ نہیں چلتا۔

حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں ایک حافظ نابینا رہا کرتے تھے، وہ شاہ صاحب پر فدا تھے، گھر بار چھوڑ کر شاہ صاحب کے یہاں پڑ رہے تھے، ان سے ایک مرتبہ نہ جانے کس حال اور کس شان سے فرمایا کہ حافظ صاحب! **استغفر اللہ** پڑھئے، پھر تو ایسا ہوا کہ مہینوں حافظ صاحب کی زبان پر بے اختیارانہ **استغفر اللہ** جاری رہا۔

فہم صحیح:

اب جو واقعہ ذکر کرنا چاہتا ہوں، اس کے راوی حضرت مولانا ضمیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں، سلطان شاہ صاحب اصطلاحی طور پر گو کہ عالم نہ تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے دین کی وہ سمجھ عطا فرمائی تھی جس کو حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ **من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین.** اللہ تعالیٰ کو جس بندے کے حق میں خیر منظور ہوتی ہے، اسے دین کے باب میں سمجھ عطا فرمادیتے ہیں۔

مولانا ضمیر احمد صاحب بتا رہے تھے سلطان شاہ صاحب کے منجھلے صاحبزادے حضرت مولانا دین محمد صاحب نے مشہور غیر مقلد عالم مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازیپوری کی خدمت میں حدیث کا درس لیا تھا، وہاں سے فارغ ہو کر گھر آئے تو استاذ کے اثر سے نمازوں میں رفع یدین کرنے لگے، شاہ صاحب نے انہیں پہلی دفعہ رفع یدین کرتے دیکھا تھا، جب نماز سے فارغ ہوئے تو شاہ صاحب نے انھیں اپنے پاس بلایا، اور اپنے سادہ دیہاتی لہجہ میں مخاطب کیا کہ اے دِنُّو یہ نماز میں ہاتھ کیوں اٹھا رہے تھے، مولانا نے عرض کیا کہ بابا! نماز میں ہاتھ اٹھانا سنت ہے، فرمایا اچھا ہم کو تو معلوم ہی نہ تھا کہ یہ سنت ہے، ہماری اتنی لمبی عمر ہوگئی اور کتنے عالم علماء سے ملاقات ہوئی مگر کسی نے نہ بتایا کہ یہ بھی سنت ہے، پھر کہنے لگے کہ گھر کا عالم بنانے میں کتنا فائدہ ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ سنت ہے، لیکن بھیا یہ تو بتاؤ کہ اتنی عمر ہوگئی، اور ہم نے اب تک نماز بغیر ہاتھ اٹھائے پڑھی ہے، تو وہ سب نماز تو خلاف سنت ہوئی، اب کیا کریں؟ مولانا نے عرض کیا، نہیں

بابا وہ خلاف سنت نہیں ہوئی، ہاتھ کا نہ اٹھانا بھی حدیث سے ثابت ہے، شاہ صاحب نے تب جھٹک کر فرمایا جب وہ بھی سنت ہے تب اسے چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے، ابھی لوگوں میں اختلاف شروع ہوجائے گا، مولانا دین محمد صاحب سمجھ گئے اور انھوں نے رفع یدین ترک کردیا۔

اسی طرح کا واقعہ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید کے ساتھ بھی پیش آیا تھا، یہ واقعہ علماء دیوبند کے مشہور راوی امیر شاہ خاں صاحب نے بیان کیا ہے جسے ارواح ثلثہ میں نقل کیا گیا ہے، وہ یہ کہ ایک بار مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے نمازوں میں رفع یدین شروع کردیا اس کے متعلق حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی سے عرض کیا گیا، انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی، قرآن کریم کے مشہور مترجم ومفسر حضرت شاہ عبدالقادر صاحب سے فرمایا کہ تم مولوی اسمٰعیل سے بات کرو، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب کے واسطے سے کہلوایا کہ تم رفع یدین چھوڑ دو، اس سے خواہ مخواہ فتنہ ہوگا، مولانا اسمٰعیل صاحب نے جواب دیا کہ اگر عوام کے فتنے کا خیال کیا جائے تو اس حدیث کے کیا معنی ہوں گے: **من تمسک بسنتی عند فساد امتی فله اجر مائة شهيدٍ** (جس نے میری امت کے بگاڑ کے وقت میری سنت کو مضبوطی کے ساتھ تھاما، اس کے لئے سو شہیدوں کا اجر ہے) کیونکہ جو کوئی سنت متروکہ کو اختیار کرے گا عوام میں ضرور شورش ہوگی، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب سے جب یہ جواب نقل کیا گیا تو فرمایا! ہم تو سمجھے تھے کہ اسمٰعیل عالم ہوگیا ہے۔ مگر وہ تو ایک حدیث کا معنی نہ سمجھا، یہ حکم تو اس وقت ہے جب سنت کے مقابل خلاف سنت ہو اور یہاں سنت کا مقابل خلاف سنت نہیں، بلکہ دوسری سنت ہے، کیونکہ جس طرح رفع یدین سنت ہے، یوں ہی ارسال (ترک رفع یدین) بھی سنت ہے، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اس پر خاموش رہے۔

دونوں واقعوں میں، اور دونوں کے جواب میں کس درجہ مطابقت ہے، ایک جواب ایک زبردست عالم کی زبان سے ہے، اس میں عالمانہ تفہیم پائی جاتی ہے، اور ایک جواب ایک ایسے شخص کی زبان سے ہے جو اصطلاحاً عالم نہ تھا، مگر دین کی سمجھ حاصل ہوچکی تھی، بزرگوں کی صحبت کی یہ برکت ہے۔

خانقاہ اہر ولی میں ایک پہلوان:

ایک دن خانقاہ میں الہ آباد کا ایک پہلوان جمن نامی آیا، وہ یہاں پناہ لینے آیا تھا،

حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب نے اسے بھیجا تھا، اس کا قصہ عجیب ہوا، یہ شخص الہ آباد شہر کے مضافات کے ایک گاؤں مریاڈیہہ کا رہنے والا تھا، ایک روز یہ قضائے حاجت کے لئے رات میں میدان میں گیا ہوا تھا، واپس ہورہا تھا کہ تین آدمیوں نے اسے گھیر لیا، ان کے پاس لاٹھیاں تھیں، یہ تنہا تھا، ہاتھ میں صرف لوٹا تھا، اس نے دیکھا کہ بچاؤ کا کوئی سامان نہیں ہے، تو اس نے کھینچ کر وہی لوٹا ایک کے سر پر دے مارا، وہ وہیں بیہوش ہوگیا، اس نے دوڑ کر اس کے ہاتھ سے لاٹھی چھین لی۔ اب وہ دونوں جمن پہلوان پر ٹوٹ پڑے، مگر اس نے اتنا زبردست وار کیا کہ دونوں وہیں مر گئے، جمن وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا، الہ آباد سے بھاگ کر وہ فیض آباد، حضرت شاہ نیاز احمد صاحب علیہ الرحمہ خلیفہ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کی خدمت میں پہونچا، شاہ صاحب نے فرمایا کہ تیرا بچنا مشکل ہے، اگر بچنا چاہتا ہے تو حضرت نعمت اللہ شاہ صاحب کے پاس چلا جا، چنانچہ وہ پتہ لگاتے لگاتے شاہ صاحب کی خدمت میں آیا، شاہ صاحب نے اس کی روداد سن کر فرمایا کہ تم خانقاہ اہرولی چلے جاؤ، اور حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب سے کہو، وہ اہرولی پہونچا، حضرت مولانا سے سب حال بیان کیا اور رونے لگا، حضرت مولانا نے فرمایا کہ رونے کی ضرورت نہیں ہے، اسی جگہ پڑے رہو، اور بے فکر رہو، وہ مصیبت کا مارا وہیں پڑ گیا، اور مویشیوں کی خدمت کرنے لگا۔

ادھر الہ آباد میں یہ ہوا کہ پولس والے لاش اٹھا کر لے گئے، دو تو ختم ہی ہو چکے تھے، جو بے ہوش تھا، اسے ہسپتال میں داخل کر دیا، جب اسے ہوش آیا تو اس نے ساری روداد سنائی، اور پھر جمن کی پولیس کو تلاش ہوئی، گھر والوں کو کچھ خبر نہ تھی، پولیس نے گھر کے چودہ افراد کو گرفتار کر لیا، اور مکانوں میں سرکاری تالا لگا دیا، کچھ دنوں کے بعد وہ ضمانت پر رہا ہوئے اور جمن پر حلیہ وارنٹ جاری ہوگیا، بعد میں گھر والوں کو جمن کے بارے میں معلوم ہوگیا کہ وہ اہرولی خانقاہ میں ہے، اس کے بعد گھر والے کبھی کبھی خانقاہ میں آنے لگے، مگر جمن پہلوان کو خانقاہ سے باہر جانے کا حکم نہیں ہوا، وہ خانقاہ ہی میں رہتا تھا۔

ایک روز اس علاقہ کے تھانے دار کو چوکیدار کے ذریعے معلوم ہوگیا کہ الہ آباد کا ایک پہلوان جو خون کر کے آیا ہے، خانقاہ میں رہتا ہے، تھانے دار نے آکر اجازت طلب کی، حضرت

نے اجازت دی، وہ خانقاہ میں داخل ہوا، حضرت نے اسی پہلوان کو پکارا کہ کرسی لاؤ، داروغہ جی آئے ہیں، اور کچھ پان چھالیہ لاؤ، داروغہ پہلوان کو بہت غور سے دیکھنے لگا، حضرت نے فرمایا کہ دیکھ رہے ہو، ارے یہ تو تین خون کرکے آیا ہے، شاید وارنٹ آپ کے پاس بھی آیا ہوگا، کہا آیا ہے، حضرت نے کہا کہ اسے لے جاؤ، داروغہ نے کہا کہ بابا! میری ہمت نہیں ہے، اگر ان کو لے جائیں تو کہیں ہم بھی نہ چلے جائیں، کچھ دیر کے بعد داروغہ چلا گیا، اس کے بعد سرکل انسپکٹر آیا اس کی بھی خاطر تواضع پہلوان سے کرائی، پھر اس کا تعارف کرایا اور اس سے بھی فرمایا کہ اگر لے جانے کے لئے آئے ہیں تو لے جاسکتے ہیں، مگر اس کی بھی ہمت نہیں ہوئی، اس کے بعد کوئی نہیں آیا۔

الہ آباد میں مقدمہ چلتا رہا، پہلوان کے خلاف پولیس نے کیس بہت مضبوط کرلیا تھا، گواہوں کا بیان بھی ہو چکا تھا، حالانکہ واردات کے وقت کوئی بھی موجود نہ تھا لیکن پولیس نے گواہ تیار کرلئے تھے۔ جو لوگ ضمانت پر رہا ہوئے تھے، وہ مقدمہ کی پیروی کررہے تھے، جب فیصلہ کی تاریخ پڑی تو اس کی اطلاع خانقاہ میں کی گئی، حضرت مولانا نے پہلوان سے کہا کہ اس تاریخ پر تم جاؤ تا کہ دوسرے لوگ زد میں نہ آجائیں، حسب ارشاد جمن کچہری میں حاضر ہوا، انداز پہلوانوں کا سا تھا، تہبند باندھے ہوئے، لانبا کرتا پہنے ہوئے، سر پر صافہ ہاتھ میں مرزا پوری لاٹھی، حاکم نے آتے ہی پوچھا تم کون ہو؟ جواب دیا کہ جمن پہلوان میرا ہی نام ہے، حاکم گھبرا سا گیا، حیرت زدہ ہوکر دوبار پوچھا کیا تمہیں جمن پہلوان ہو؟ بولا میں ہی ہوں، حاکم کچھ دیر دانتوں میں قلم دبائے بیٹھا رہا، آدمی باہر تک کھڑے تھے، کافی دیر غور کرنے کے بعد اس نے مسل پر کچھ لکھا اور کسی سے کہا کہ سنادو، سنانے والے نے فیصلہ سنایا۔ ’’قتل سچا، قاتل یہی ہے، گواہ جھوٹے، اسی لئے مقدمہ خارج‘‘۔

پورا ہال خوشی سے جھوم اٹھا، جمن نے حاکم کو سلام کیا اور کہا کہ میرے لئے کیا حکم ہوتا ہے، کہا کہ جاؤ، انھوں نے کہا کہ مکانوں میں تالا بند ہے، حکم دیا جائے کہ کھول کر مکان ہم لوگوں کے حوالے کیا جائے، چنانچہ حکم ہوگیا اور خوشی خوشی چند روز رہ کر جمن خانقاہ میں چلا آیا، اور تمام لوگ حضرت کے معتقد ہوگئے، اور برابر آتے جاتے رہے۔

ایک عجیب واقعہ:

سید سراج احمد صاحب نے حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب کا ایک واقعہ سنایا کہ ایک

بچہ اسی علاقے کا تھا، بہت چھوٹا تھا تو اس کی ماں کا انتقال ہوگیا، باپ نے دوسرا نکاح کرلیا، یہ لڑکا ماں سے محروم، دوسرے نکاح کے بعد باپ کی نظر شفقت سے بھی تقریباً محروم ہوگیا، اس بیچارے کو اتنی تکلیف ہونے لگی کہ پاس پڑوس والوں کو بھی رحم آنے لگا، محلّہ کی ایک بوڑھی خاتون اس بچے کو لے کر اور کچھ دوسرے بچوں کو لے کر حضرت مولانا کی خدمت میں دعا کے لئے آئی، آپ نے اور بچوں کی طرف توجہ فرمائی، مگر اصل بچہ جو خاص طور سے مستحق دعا تھا اس کی طرف توجہ نہیں فرمائی، اس بڑھیا نے کئی مرتبہ مولانا کو متوجہ کیا لیکن حضرت اپنے حال پر رہے، اس نے ایک مرتبہ بہت زور دے کر کچھ کہا تو آپ نے فرمایا کہ تم اس کے لئے کیا کہتی ہو، ایک وقت ایسا آئے گا کہ ساری دنیا اس کی بات سنے گی، وہ وہاں سے لوٹ آئی۔

اب اس بچے کا حال سنئے! یہ کچھ بڑا ہوا تو گھر سے بھاگ نکلا، اللہ جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائیں، پھر وہ لکھنؤ پہونچ گیا، ندوہ میں داخلہ لیا، اس کی ذہانت وذکاوت کے جوہر وہاں کھلنے لگے، وہاں سے فراغت حاصل کی، پھر دہلی آگیا، یہاں کچھ عرصے کے بعد وہ ریڈیو اسٹیشن کے عربی شعبہ سے وابستہ ہوگیا، ایک بار عربی میں تقریر نشر کرنے کے لئے کھڑا ہوا، اور زبان سے یہ مضمون ادا کیا کہ اس وقت میری آواز دنیا کے ہر گوشے میں سنی جارہی ہے، اتنا کہنا تھا کہ برسوں پرانی، بچپن کی یاد آئی، وہ ان بزرگ کی خدمت میں خاتون کا لے جانا، دعا کی خصوصی درخواست کرنا، ان بزرگ کا متوجہ نہ ہونا، خاتون کا اصرار کرنا، حضرت کا فرمانا کہ اس کی آواز ساری دنیا سنے گی، یہ سارا منظر نگاہوں میں گھوم گیا، یہ کل کا بچہ اور آج کا ندوی عالم وفاضل ازخود رفتہ ہوگیا، ہوش بجا نہ رہے، اپنے نائب کو تقریر نشر کرنے کا حکم دے کر فوراً گھر لوٹ آئے، طبیعت پر اثر تھا، پہلا کام یہ کیا کہ سفر کرکے وہ خانقاہ میں آئے، کئی دن قیام کیا، خانقاہ میں اب جو چھوٹا سا مکتب چل رہا ہے اس کے سرپرست وہی ہیں، یہ ہیں عالم وفاضل، عربی کی متعدد کتابوں کے مصنف مولانا عبدالحلیم صاحب ندوی پروفیسر جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی۔

وفات:

حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب کا آخری ایام میں تو حال یہ ہوگیا تھا کہ کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کی طاقت نہ رہی بیٹھ کر نماز ادا کرتے تھے، بلکہ یہ بھی نوبت آئی کہ لیٹ کر نماز پڑھنے

لگے، خدام ہر وقت خدمت کے لئے مستعد رہتے، سب سے زیادہ خدمت صاحبزادۂ محترم مولانا شاہ محمد ہارون صاحب نے کی، وہ ہر وقت خدمت میں حاضر رہتے، اگر وہ نہ ہوتے، اور کوئی ضرورت ہوتی تو انھیں کو بلواتے، آخر میں غذا بالکل بند ہوگئی تھی، دوا پینی بھی مشکل تھی، اور بالکل آخر میں معاملہ عجیب ہوگیا تھا، اللہ والوں کی شان واقعی عقلوں سے بالاتر ہوتی ہے، اطباء نے کھانے پر اصرار کیا کہ ضعف بہت ہوجائے گا، تو کھانے کا جب وقت ہوتا تو اشارہ کرتے کہ کھانا لاؤ یا دوا کا وقت ہوتا، تو اشارہ کرتے کہ دوا لاؤ، مولانا محمد ہارون صاحب کھانا لاتے، یا دوا لاتے، تو فرماتے کہ تم کھاؤ یا دوا پیو، صاحبزادے صاحب کھاتے، جب دو تین لقمے کھا لیتے تو اشارہ کرتے کہ بس! دوا بھی وہی پیتے، مولانا اشارہ فرماتے کہ بس! تو وہ رک جاتے، غرض صاحبزادۂ محترم کھاتے پیتے، اور حضرت مولانا کو تشفی ہوجاتی تھی، اسی حال میں کئی دن گزرے۔

یکم جمادی الاخریٰ ۱۳۵۳ھ کو عصر کی نماز کے بعد حضرت مولانا نے اپنے صاحبزادوں میں سے ایک ایک کا نام لے کر پکارا، وہ لوگ حاضر ہوئے، ان سے فرماتے کہ کچھ سناؤ، آخر میں مولانا محمد ہارون صاحب سے فرمایا کہ تم کچھ سناؤ، انھوں نے قرآن کی آیت: قُلْ إِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لاَ شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ، پڑھ کر سنائی، حضرت بہت خوش ہوئے، آپ کی تمام زندگی اسی آیت کے مطابق تھی اس لئے انشراح بہت ہوا، زبان سے فرمایا الحمدللہ اب تشفی ہوگئی۔ پھر آپ نے ان کے مقام قلب پر انگلی رکھ دی، اور کچھ دیر تک رکھے رہے، اللہ جانے اس میں کیا راز تھا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد حضرت کی روح اعلیٰ علیین میں حاضر ہوگئی۔ **اناللّٰہ وانا الیہ راجعون۔**

جنازہ میں بڑا مجمع ہوا، دوسرے دن صبح کو خانقاہ کے ایک حصے میں، اللہ کے اس برگزیدہ ولی کو زمین کے سپرد کردیا گیا، رہے نام اللہ کا۔

عبادت کا اہتمام:

مولانا محمد ادریس صاحب کے بیان کے مطابق، مولانا مولانا ریاض احمد صاحب مغرب کے بعد اوابین کی پابندی سنت مؤکدہ کے مثل کرتے۔ دلائل الخیرات، اور حزب البحر کے پڑھنے کا روزانہ معمول تھا، دیکھنے والوں کی عینی شہادت ہے کہ برسوں نماز تہجد قضا نہیں ہوئی۔

بالالتزام روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے۔

جلسوں کے ہنگامہ میں جب کہ جلسہ دیر تک چلتا، لوگ دیر میں سوتے، اور فجر کی نماز بھی خطرہ میں پڑ جاتی، مولانا اس ہنگامہ میں بھی تہجد اور تلاوت سے غافل نہ ہوتے جامع العلوم مظفر پور کے صدر مدرس حضرت مولانا جمیل احمد صاحب کی روایت مولانا محمد ادریس صاحب نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ کہیں جلسہ میں یہ دونوں بزرگ مدعو تھے مولانا جمیل احمد صاحب فرماتے ہیں کہ میری ٹرین بہت لیٹ ہوگئی، میں جلسہ گاہ میں پہنچا تو رات کے دو بج چکے تھے، جلسہ ختم ہو چکا تھا، لوگ سو رہے تھے۔ ساری فضا پر نیند کا سناٹا طاری تھا۔ مگر اللہ کا ایک بندہ موم بتی جلا کر تلاوت قرآن میں مصروف تھا، جس کی دھیمی دھیمی آواز پر کیف اور مترنم ہو رہی تھی، غور سے دیکھا تو وہ مولانا ریاض احمد صاحب تھے ایک مرتبہ مولانا ریاض احمد صاحب نے بر سبیل تذکرہ فرمایا ۱۵ر سال تک میں نے سورج کو نکلتے نہیں دیکھا (کیونکہ نماز فجر کے بعد سے طلوع آفتاب کے بعد تک آپ مراقبہ اور اوراد و وظائف میں مشغول رہتے) ایک دن اتفاق سے جب آفتاب نکلتے دیکھا تو بالکل نئی چیز معلوم ہوئی۔

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) اس باب میں مذکور شخصیات کے تفصیلی حالات دیکھنے کے لئے دیکھیں حضرت مولانا کی کتاب ''حضرت چاند شاہ صاحب اور ان کا خانوادۂ تصوف''۔

’’ذکر جامی‘‘ سے ماخوذ واقعات (۱)

جامی صاحب روکھے سوکھے نرے سنجیدہ آدمی نہ تھے کہ چہرے پر یبوست طاری ہو، بلکہ نہایت خوش مزاج اور ظریف الطبع تھے، ظرافت اور وہ بھی لطیف ظرافت ذہانت کا خاصہ ہے، جامی صاحب بے حد ذہین تھے اور رعایت لفظی کے تو گویا امام تھے، ذرا ذرا سی بات پر لطیفہ پیدا کرتے، ان کی مجلس میں کوئی غمزدہ اور اُداس نہیں رہ سکتا تھا، ان کی کوئی مجلس ہلکی پھلکی دل خوش کن ظرافت اور رعایت لفظی کے خوبصورت چٹکلوں سے خالی نہ ہوتی۔

’’غیر مبین‘‘ کے بس کی بات نہیں:

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے پنج وقتہ نمازوں کے لئے امام حضرت قاری محمد مبین صاحب کو مقرر کر رکھا تھا، قاری صاحب بہت عمدہ قرآن پڑھتے ہیں، حافظ ہیں اس لئے تراویح پڑھانے کی ذمہ داری بھی انھیں کی تھی، قاری صاحب ایک بار تراویح پڑھانے میں زیادہ بھولے، اور بار بار لقمہ دینے کی ضرورت پیش آئی، حضرت نے انھیں پیچھے آنے کا حکم دیا اور ایک دوسرے جیّد حافظ کو ان کی جگہ متعین کر دیا، وہ خوب پختہ حافظ تھے، مصلے پر آئے لیکن حضرت مولانا کی امامت آسان نہ تھی، حضرت کا رعب اور دبدبہ ایسا تھا کہ مضبوط سے مضبوط دل کے لوگ تھرّا جاتے۔ انھوں نے پڑھنا شروع کیا، لیکن وہ بھی بھولنے لگے، پچیسویں پارے میں جب اس پر پہونچے **وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِين** ، تو ایسا بھولے کہ لقمہ دینے کے باوجود نہیں چل سکے، مجبوراً رکوع کرنا پڑا، نماز سے فراغت کے بعد قیام گاہ پر آکر اس کی گفتگو چل پڑی، جامیؔ صاحب نے برجستہ کہا کہ حضرت اس مصلے پر نماز پڑھانا **غیر مبین** کے بس کی بات نہیں ہے حضرت ہنس پڑے اور پھر دوسرے دن سے قاری مبین صاحب حسب معمول تراویح پڑھانے لگے

...اسی لئے کان پکڑتے ہیں:

لکھنؤ کے حکیم شمس الدین صاحب شفاء الملک ایک حاذق طبیب تھے اور نہایت دیندار اور اچھے عالم وفاضل، انداز گفتگو ان کا بہت دل آویز تھا، حضرت سے بیعت تھے، حضرت نے انھیں اجازت بھی عطا فرمائی تھی۔ ایک دن حضرت سے باتیں کر رہے تھے، کسی تقریب سے انھوں نے عرض کیا کہ حضرت بستر پر اگر چیونٹیاں چڑھ جائیں تو جب تک احتیاط سے ایک ایک چیونٹی باہر نہ کرلوں بستر پر جانہیں سکتا، کیونکہ چیونٹی کان میں گھس جاتی ہے اور کان سے دماغ تک ایک منفذ (راستہ) ہے، چیونٹی اسی منفذ سے دماغ کے مغز تک پہونچ جاتی ہے اور اس سے ناقابل برداشت تکلیف ہوتی ہے۔ حکیم صاحب کا سلسلۂ بیان رکا تو جامی صاحب بول پڑے:

''اچھا حکیم صاحب! اب سمجھ میں آیا کہ بچے جب سبق بھولتے ہیں تو ان کا کان اسی لئے پکڑا جاتا ہے کہ کان سے دماغ تک منفذ ہے، اسی سے ان کا دماغ کھل جاتا ہے۔''

حکیم صاحب یہ سن کر اچھل پڑے، اور زور زور سے داد دینے لگے، واہ جامی صاحب واہ! آپ کو خوب نکتہ سوجھا، حکیم صاحب تو داد دیتے رہے اور جامی صاحب اس فکر میں پڑ گئے کہ کہیں حضرت کو ناگوار خاطر نہ ہو، لیکن حضرت بھی مسکرا رہے تھے۔

چٹ آئی پٹ بچھی:

ہمارے دوست مولانا عبدالرب صاحب جہانا گنج ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے اچھے ذی استعداد فاضل ہیں، کچھ دنوں انھوں نے وصیۃ العلوم الہ آباد میں پڑھایا ہے، ان کی درس گاہ میں چٹائی کی ضرورت تھی، حضرت قاری صاحب بمبئی سے تشریف لائے تو ان کے لئے چٹائی لیتے آئے، جونہی اسٹیشن سے سامان لایا گیا، چٹائی ان کے حوالہ کردی، انھوں نے فوراً ہی درسگاہ میں بچھالیا۔ جامی صاحب تھوڑی دیر کے بعد تشریف لائے، تو کمرے کا رنگ بدلا ہوا دیکھا، انھوں نے دریافت کیا تو بتایا گیا کہ حضرت قاری صاحب بمبئی سے لائے ہیں، مسکرا کر فرمایا:

''اچھا! چٹ آئی، پٹ بچھی۔''

چٹائی اور چٹ آئی، اور چٹ کی مناسبت سے پٹ، رعایت لفظی کا لطیف نمونہ ہے۔

کون لڑ کے گیا:

رعایت لفظی کی مناسبت سے ایک اور لطیفہ یاد آیا، خانقاہ میں جہاں مجلس ہوا کرتی ہے، اس سے متصل جانب غرب میں جو کمرہ ہے وہی میری درسگاہ تھا، جامی صاحب نے پکارا کہ مولانا آیئے چائے پی لیجئے، میں نے کہا ابھی آتا ہوں، سبق پورا کرنے میں ذرا تاخیر ہوئی، حاضر ہوا تو فرمایا آپ نے بڑی دیر کردی، چائے ٹھنڈی ہوگئی، میں نے کہا، ابھی لڑ کے گئے ہیں، تو میں آیا، مسکرا فرمایا:

کون لڑ کے گیا آپ سے؟

مجلس زعفرن زار ہوگئی۔

رَأَیتُ:

خانقاہ شریف کے خاص اہل تعلق میں جون پور کے ایک صاحب تھے جمیل بھائی، ہم سب لوگوں کا ان سے گہرا تعلق تھا، وہ بہت دیندار اور صاحب استقامت انسان تھے، اے۔ جی آفس میں ملازم تھے، ان کے لڑکے کی شادی ہوئی، اس کی تقریب میں انھوں نے ولیمہ کی دعوت کی، خانقاہ کے تمام افراد اس میں شریک ہوئے، جامی صاحب بھی تھے، الہ آباد میں دعوت میں پلاؤ کے ساتھ رایتہ کا بہت رواج ہے، رایتہ دہی میں پیاز، زیرہ، نمک، مرچ اور بعض دوسرے مسالے ڈال کر بناتے ہیں، لذیذ بھی ہوتا ہے اور ہاضم بھی۔ دسترخوان پر سب لوگ بیٹھ گئے، پلاؤ آ گیا، رایتہ آ گیا، کھانا شروع ہوا، جامی صاحب پلاؤ کھا رہے تھے، انیس بھائی الہ آبادی نے متوجہ کیا کہ جامی صاحب رایتہ، بے ساختہ فرمایا:

رَأَیتُ (میں نے دیکھا)

لوگ مسکرا پڑے، رایتہ کا تلفظ عربی کے لفظ رایتَ کے مماثل ہے، جس کے معنی ہیں ''آپ نے دیکھا'' اسی مناسبت سے جامی صاحب نے کہا، رَأَیتُ یعنی ''جی میں نے دیکھا''۔

میں نے کہا جا پانی لا:

جامی صاحب کو میٹھا بہت مرغوب تھا، چائے بہت میٹھی پیتے تھے، مجھے میٹھے سے بالکل مناسبت نہ تھی، چائے تو ذرا میٹھی ہو جائے تو میں نہیں پی سکتا۔ الہ آباد کے ہوٹلوں میں عموماً چائے

میٹھی پی جاتی ہے، مجھے چائے منگوانی ہوتی تو تاکید کرتا کہ شکر کم ڈالیں، جامی صاحب موجود ہوتے تو فرماتے کہ جتنی شکر ادھر کم کی جائے اتنی میری چائے میں بڑھادی جائے۔

حضرتؒ کے زمانے میں ایک بار جامی صاحب اور دوسرے کچھ مخصوص حضرات ہوٹل میں چائے پینے گئے، جامی صاحب کا دستور تھا کہ چائے جب آتی تو وہ فرمائش کرتے کہ چینی لاؤ، آج جو چائے آئی تو جامی صاحب کو پانی کی بھی ضرورت تھی، انھوں نے کہا پانی لاؤ، بیرا دوڑا ہوا گیا اور معمول کے مطابق شکر لے آیا، جامی صاحب نے مسکرا کر کہا، دیکھئے میں نے اس سے کہا جا پانی لا، تو چینی لایا۔ جا پانی اور چینی کی دوہری مناسبت پر سب مسکرا اٹھے۔

کل کیوں آج صدر مدرس:

ایک مرتبہ جامی صاحب کے ساتھ الہ آباد کے مشہور قصبہ مئو آئمہ جانے کا اتفاق ہوا، وہاں ہم لوگ مدرسہ انوار العلوم میں ٹھہرے، جامی صاحب تو متعارف تھے، میں ہی مجہول تھا، ایک صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ فلاں صاحب ہیں، مدرسہ وصیۃ العلوم میں مدرس ہیں بلکہ کہنا چاہئے کلصدر مدرس ہیں (یعنی صدر مدرس کی طرح ہیں) جامی صاحب بول پڑے:

”کل کیوں؟ آج ہی صدر مدرس ہیں۔“

اہل مجلس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

سبعۃٌ وثامنھم کلبھم:

ایک مجلس میں مرزا پور کے ایک حکیم صاحب تشریف لائے، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جامی صاحب سے بہت پرانی شناسائی ہے، لیکن ملاقات برسہا برس کے بعد ہوئی، وہ جامی صاحب سے ان کے احوال تفصیل سے معلوم کر رہے تھے، انھوں نے اولاد کی تفصیل دریافت کی، تو جامی صاحب اچانک مسکرا پڑے۔ جامی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے سات بیٹیاں اور ایک بیٹا عنایت فرمایا ہے، بیٹے کا نام محی الدین ہے، عزیز موصوف عربی چہارم میں پڑھ رہے تھے اور اس مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، جامی صاحب نے مسکرا کر بیٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ محی الدین سے معذرت کے ساتھ:

”سبعۃٌ وثامنھم کلبھم“

یہ ایک آیت کا فقرہ ہے جس میں اصحاب کہف کی تعداد بتائی گئی ہے، حاصل یہ کہ ’’وہ سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے‘‘ اس طرح جامی صاحب نے ایک لطیف اشارے میں اولاد ذکور و اناث کی تفصیل بیان کردی۔

جامی صاحب کی مزاج شناسی:

جامی صاحب فرماتے تھے کہ ایک سرکاری ملازم جو ریٹائر ہو چکے تھے حضرت کے یہاں عرصہ تک مقیم رہے، ذاکر و شاغل تھے ایک مرتبہ گھر جانے کیلئے انھوں نے حضرت سے درخواست کی اور اس کے لئے ایک تحریر پیش کی، حضرت نے اسے دیکھا تو پاس میں ایک صاحب علم موجود تھے حضرت نے وہ تحریر انھیں دیتے ہوئے فرمایا کہ انھیں سمجھایئے، وہ بیچارے حضرت کا مطلب نہ سمجھ سکے کچھ غیر متعلق باتیں سمجھانے لگے، حضرت نے جامی صاحب کو بلوایا اور تحریر ان کے حوالہ کر کے فرمایا کہ انھیں سمجھایئے، جامی صاحب نے وہ تحریر دیکھی تو اس میں لمبے چوڑے دلائل سے گھر جانے کی ضرورت بیان کی گئی تھی، جامی صاحب نے فرمایا کہ ارے صاحب! یہ آپ نے کیا کیا؟ یہاں کوئی سرکاری ملازمت ہے کہ اتنی وجوہات بیان کرنے کی ضرورت ہو! آپ تو مختصر لفظوں میں حضرت سے گھر جانے کی اجازت لیجئے، ایسی لمبی چوڑی درخواست شیخ کے حق میں بے ادبی کی بات ہے، حضرت اقدس کھل اٹھے اور فرمایا کہ ہاں میں یہی چاہتا تھا، اس قسم کے واقعات بہت ہیں کتنے ہی بگڑے معاملات جامی صاحب کے حسن وساطت سے بن جاتے تھے۔

دولت خانہ اور غریب خانہ:

مولانا جامی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

’’ہمارے حضرت (مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ) کے ایک خادم ہیں شبلی موذن، مئو کے رہنے والے، وہ بیان کرتے تھے کہ میں ایک مرتبہ فتح پور حاضر ہوا، ان ہی دنوں صوفی عبد الرب صاحب (اناؤ کے رہنے والے بزرگ اور نہایت قادر الکلام وپُر گو شاعر) بھی آئے ہوئے تھے، میری ان کی شناسائی نہ تھی، وہ نل پر پانی لینے آئے، میں نے ان کے ہاتھ سے لوٹا لے کر پانی بھر کر ان کو دے دیا، فرمایا: جزاکم اللہ- میں نے ان سے پوچھ لیا کہ جناب کا دولت خانہ کہاں ہے؟ فرمایا کہ میں اناؤ سے حاضر ہوا ہوں، اس کے بعد میں نے کہا کہ اب یہی

سوال آپ مجھ سے فرمایئے، میرے اس کہنے پر وہ ذرا چونکے مگر مسکرا کر مجھ سے فرمایا کہ اچھی بات ہے صاحب! بتایئے آپ کا دولت خانہ کہاں ہے؟ شبلی صاحب کہتے تھے کہ میں نے اس کے جواب میں عرض کیا کہ دولت خانہ تو میرا یہی فتح پور ہے البتہ غریب خانہ اس خادم کا مئو ہے۔ صوفی صاحب ماشاء اللہ اہل دل بھی تھے اور شاعر زندہ دل بھی، ان کے اس جواب پر انھیں وجد ہی تو آ گیا، فرمایا سبحان اللہ، سبحان اللہ، واہ وا، آپ نے کیا خوب جواب دیا، ماشاء اللہ۔ کہتے تھے کہ اس ملاقات کے بعد ان سے قدرے بے تکلفی ہوگئی، پھر جس دن صوفی صاحب واپس جانے لگے اسی دن مجھے بھی مئو جانا تھا، حضرت والا نے فرمایا کہ شبلی! دیکھو صوفی صاحب جا رہے ہیں ان کو کُھر ہٹ اسٹیشن پر ریل میں سوار کر کے تب تم مئو جانا، میں نے عرض کیا حضرت بہت اچھا، خانقاہ سے ہم لوگ روانہ ہوئے تو میں نے صوفی صاحب سے عرض کیا حضرت امیر سفر کون ہوگا؟ یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ آپ اور کون؟ میں نے کہا بہت اچھا، اس کے بعد میں نے یہ کیا کہ اپنی چادر پھیلا کر اپنا سب سامان اور جناب صوفی صاحب کا سب سامان رکھ کر ایک بڑا سا گٹھر بنا کر سر پر لے کر چلا، صوفی صاحب نے فرمایا ارے موذن صاحب یہ کیا کر رہے ہیں، لایئے کچھ سامان مجھے بھی تو دید یجئے، میں نے کہا حضرت میں امیر ہوں، آپ کو میرے انتظام میں اب مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے، اس پر صوفی صاحب کو خاموش ہو جانا پڑا۔

☆☆☆☆☆☆

حاشیہ

(۱) حضرت مولانا عبد الرحمان صاحب جامی خادم خاص حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کے حالات زندگی کی تفصیلات کے لئے دیکھئے حضرت مولانا کی کتاب ''ذکر جامی''۔

’’حکایت ہستی‘‘ سے ماخوذ واقعات

مردِ خدا:

میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ سہارن پور، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب علیہ الرحمہ کی زیارت وملاقات کی غرض سے گیا، شیخ سے مصافحہ ہوا، مجلس میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی، دسترخوان پر شیخ کی مہربانیاں دیکھیں، جمعہ کی نماز جامع مسجد میں پڑھی وہاں ایک عجیب قصہ دیکھا، دیکھا کہ ایک نہایت نحیف ولاغر بزرگ کو چند لوگ مل کر تقریباً اٹھا کر یا شاید گھسیٹ کر مگر ادب کے ساتھ لا رہے ہیں، چہرہ نہایت روشن، سارا جسم جیسے سفید کاغذ کا ہو، میں نے دیکھا، مجھے بہت ترس آیا کہ اتنے زار ونزار بوڑھے کو لوگ کیوں لا رہے ہیں؟ ان پر جمعہ کی نماز فرض ہی کہاں ہے؟ لیکن میں حیرت میں ڈوب گیا، جب دیکھا کہ انھیں لوگوں نے منبر کے دائیں جانب کھڑا کر دیا، اور وہ ہاتھ باندھ کر نماز میں مشغول ہو گئے بہت طویل قیام اور رکوع وسجود کے ساتھ انھوں نے چار رکعتیں تقریباً آدھ گھنٹے میں ادا کیں، وہ آرام سے نماز پڑھ رہے تھے، نہ کسی سہارے کی ضرورت، نہ کسی مددگار کی حاجت! میں سوچ رہا تھا کہ صلوٰۃ التسبیح پڑھ رہے ہیں، جب اس سے فارغ ہوئے، تو دیکھا کہ دو آدمی انھیں سہارا دے کر کھڑا کر رہے ہیں، پھر انھوں نے پورے اطمینان سے چار رکعتیں پڑھیں، پھر خطبہ کی اذان ہوئی، نماز کے لئے پھر انھیں کھڑا کرنا پڑا، نماز جمعہ سے فراغت کے بعد پھر اسی شان سے بعد کی سنتیں پڑھیں، نماز سے فراغت کے بعد لوگ انھیں اٹھا پٹھا کر لے گئے، میں حیرت میں رہا۔ حضرت مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ نے مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی سوانح عمری میں اسی طرح کا ان کا حال لکھا ہے، جس کو میں نے پڑھا تھا کہ بیماری اور ضعف کی وجہ سے وہ از خود کھڑے نہ ہو سکتے تھے، لیکن جب لوگ انھیں کھڑا کر دیتے، تو وہ پورے اطمینان سے بغیر کسی سہارے کے نماز ادا کرتے، وہی منظر میں

یہاں دیکھ رہا تھا، اور مولانا محمد الیاس صاحب کو یاد کر رہا تھا، بعد میں کسی سے پوچھا کہ یہ کون صاحب تھے؟ بتانے والے بتایا کہ یہ مدرسہ مظاہر علوم کے ناظم حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب ہیں، میرے دل کی پیشانی عقیدت سے جھک گئی، حضرت حکیم الامت کے خلیفہ! مشہور عالم اور زبردست ترجمان حق وصداقت!

استاذ کی قلبی خوشی کا اثر:

یہاں میں مولوی عزیز الرحمٰن صاحب فتح پوری (مفتی اعظم مہاراشٹر) کا واقعہ لکھنا چاہتا ہوں، ان کے اس واقعہ کا تاثر میرے اوپر بہت گہرا ہے، اور جوں جوں مدت گزرتی جارہی ہے تجربہ بڑھتا جارہا ہے، اس کا تاثر بھی گہرا ہوتا جارہا ہے، میں اسے لکھتا ہوں اور طالب علموں سے سے نیز طالبان کمال سے امید کرتا ہوں وہ اسے یاد رکھیں گے

ہوا یہ کہ حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب علیہ الرحمہ جمعہ کے روز علی الصباح فرائض کی مشہور کتاب ''سراجی'' پڑھایا کرتے تھے، سراجی کا سبق ہفتہ میں ایک ہی دن ہوتا تھا، اس سبق کی جماعت بھی بہت بڑی تھی، میں اس سبق میں شریک نہ تھا، میں نے اگلے سال کے لئے اسے موخر کر رکھا تھا۔ ایک دن سبق کے بعد مولوی عزیز الرحمٰن سیدھے میرے پاس آئے، ان کا چہرہ قہر آلود ہو رہا تھا، میں دیکھ کر سمجھ گیا کہ کچھ معاملہ کر کے آرہے ہیں، میں نے بات پوچھی، کہنے لگے آج سراجی کے سبق میں ہنگامہ ہو گیا، اور ایک طالب علم سے تلخی پیدا ہو گئی، جس طالب علم کا انھوں نے نام لیا وہ شوخی وشرارت اور بے خوفی وانتقامی جذبے میں بدنام تھا، سب طلبہ اس کی شرارت سے ڈرتے تھے، میں ڈرا کہ کوئی فتنہ نہ ہو جائے، مگر مولوی صاحب مطمئن تھے، انھوں نے بتایا کہ آج سبق میں حضرت مفتی صاحب نے ایک مشکل مسئلہ سمجھایا، مسئلہ ذرا گنجلک تھا اور حضرت مفتی صاحب کو بہت واضح بیان پر قدرت نہیں ہے، لیکن انھوں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی، پھر طلبہ سے پوچھا تم لوگ سمجھ گئے، مذکورہ طالب علم نے جھٹک کر جواب دیا کہ کچھ نہیں سمجھے، حضرت نے پھر محنت کی، اور دوبارہ پوچھا کہ سمجھ گئے، اس نے پھر کڑک کر کہا خاک نہیں سمجھے، مفتی صاحب آزردہ ہو گئے، انھیں ایک دھکا سا لگا، چہرہ ان کا سرخ ہو گیا، پھر وہ سہ بارہ سمجھانا چاہ رہے تھے، مگر آواز متاثر تھی، مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا حضرت! بالکل سمجھ

میں آ گیا، خوب اچھی طرح سمجھ میں آ گیا، یہ جھوٹا ہے، شریر ہے وغیرہ، حضرت مفتی صاحب کا رنگ بدل گیا، خوش ہوگئے، پھر سہ بارہ نہیں سمجھایا، سب طلبہ کہہ رہے ہیں کہ یہ تمہاری جرأت کا انتقام لے گا، مگر مجھے پروا نہیں۔

میں نے ان کی ہمت پر آفریں کہی اور بہت شاباشی دی، ان کا حوصلہ بڑھایا، اس وقت ہم میں سے کوئی سوچ نہیں سکتا تھا کہ عزیز الرحمٰن جیسے لاابالی اور بے ہنگم طالب علم سے علم اور دین کی کوئی خدمت بن پڑے گی، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ بڑے شاعر ہو جائیں گے، لیکن اس کے برعکس یہ بہترین مدرس اور معتبر مفتی ہوئے، بمبئی میں یہ فتویٰ کے مدار ہیں، اور خصوصیت کے ساتھ سراجی کے موضوع پر تو انھیں وہ کمال حاصل ہوا کہ وراثت کے بڑے سے بڑے حساب کو یہ منٹوں میں زبانی طور پر حل کر لیتے ہیں، سراجی تو انھیں نوکِ زبان ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ مفتی صاحب علیہ الرحمہ کی قلبی خوشی اور دعاؤں کا اثر ہے۔

سادگی:

مفتی ابوالقاسم صاحب کا ایک منتخب حلقۂ احباب تھا، جس میں نیک، شریف اور سنجیدہ نوجوان شامل تھے، مفتی صاحب نے اپنی مہربانی سے مجھے اس کا رکن بنایا، عام دنوں میں یہ حلقہ ایک دوسرے کے قریب رہتا، ہر ایک دوسرے کے حال میں شریک ہوتا، مگر اس کے ساتھ ہفتہ میں ایک وقت حلقے کا ہر رکن کھانے میں شریک ہوتا۔ اتوار کا دن گزار کر شب میں یہ پروگرام ہوتا، جس میں تمام رفقاء اپنے اپنے گھر سے اپنا کھانا ٹفن میں لے کر کسی ایک جگہ جمع ہوتے اور سب مل کر بے تکلفی کی محفل میں کھانا کھاتے، دینی و تربیتی باتیں ہوتیں، مسائل کا مذاکرہ ہوتا، ایک دوسرے کے مسائل سنے جاتے، ان کے حل کئے جانے کی تدبیریں سوچی جاتیں، بڑا خوشگوار ماحول ہوتا، مفتی صاحب میر مجلس ہوتے، سنجیدگی اور سبک روحی کی ایک لطیف فضا ہوتی۔

میں بھی مدرسہ سے اپنا کھانا ٹفن میں لے کر حاضر ہوتا، ایسے موقع پر مفتی صاحب کی طبعی خوبیاں نمایاں ہوتیں، مفتی صاحب بایں جلالت شان ہر خدمت میں سب سے بڑھ کر حصہ لینے کی کوشش کرتے، اور اس لطیف طریقے سے کہ دوسرے منہ دیکھتے رہ جاتے، اور وہ خدمت انجام دے کر اس طرح آسودہ اور مطمئن ہوتے، جیسے انھوں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہو۔

مجھے یاد ہے کہ ایک روز میں مدرسہ سے ٹفن میں اپنا کھانا لے کر چلا، مفتی صاحب کے گھر پر اجتماعِ احباب تھا، مالتی باغ کی مسجد کے قریب سے مدن پورہ کی راہ گیروں سے بھری ہوئی گلیوں سے گزر رہا تھا کہ اچانک مفتی صاحب مل گئے، انھوں نے بے تکلف میرے ہاتھ سے ٹفن لے لیا، میں روکتا ہی رہ گیا، مگر انھوں نے یہ کہہ کر کہ اس وقت مجھے ہی لے کر چلنا چاہئے، بات ختم کر دی، میں پریشان اور پشیمان ان کے ساتھ خالی ہاتھ چلتا رہا، لیکن ان کا انداز عمل یہ تھا کہ انھوں نے میرے ساتھ کوئی خاص حسن سلوک یا خدمت کا کام نہیں کیا ہے بلکہ یہی ان کا فریضہ تھا، جو وہ بجا لائے۔ اور یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں، آج بھی مفتی صاحب کا مزاج اور ان کی طبیعت یہی ہے، مجھے ان کے ساتھ بار بار رہنے، کھانے، سفر کرنے کا موقع ملا ہے، میں ہمیشہ اپنی ناکارگی اور کاہلی پر پشیمان رہا، اور وہ خدمت کر کے آسودہ اور مطمئن رہے۔

☆☆☆☆☆☆

ماخوذ۔از ’’حکایت ہستی‘‘

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب کے واقعات

علم کا چور:

میری بڑی والدہ کہتی تھیں کہ تم اندھیری رات میں پیدا ہوئے تو عورتوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ چور ہوگا، چوروں کی رات میں پیدا ہوا ہے۔ سنا ہے کہ ۲۹/ویں رات میں چور چوری کرنے نکلتا ہے، اگر اس رات میں وہ کامیاب ہو گیا تو پورا مہینہ اس کے حق میں ’’بخیر‘‘ ہوتا ہے۔ بڑی والدہ کو یہ سن کر صدمہ ہوا، انھوں نے اس کا تذکرہ بڑے والد صاحب سے کیا، وہ ایک ذاکر و شاغل بزرگ تھے۔ انھوں نے بے ساختہ فرمایا کہ ٹھیک ہے وہ چور ہوگا، لیکن کسی چیز کا؟ علم کا! علم بھی رات کے سناٹے اور تنہائی میں حاصل ہوتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو عالم ہوگا۔ یہ بات بچپن ہی میں بڑے والد صاحب مرحوم نے بھی اور بڑی والدہ نے بھی متعدد بار مجھے سنائی۔ اس وقت اس کا ذکر ہوتا جب میرے پڑھنے کی دھن کی کبھی شکایت ہوتی۔

استغراقِ تام:

درجہ چار میں ماسٹر صاحب نے دو حساب پڑھائے، ایک کا نام ذواضعاف اقل تھا، اور دوسرے کا نام عاد اعظم تھا۔ اب صرف نام یاد ہے، اس کا طریقہ وغیرہ کچھ یاد نہیں ہے۔ طریقۂ حساب ذرا مشکل تھا بڑی دیر میں اس کے قواعد وکلیات سمجھ میں آئے لیکن جب سمجھ میں آ گئے تو بہت لذیذ معلوم ہوئے، جمعرات کا دن تھا ماسٹر صاحب نے صبح کے وقت جمعرات اور جمعہ کی چھٹی کا حوالہ دے کر دونوں کے کئی کئی سوالات لکھوائے کہ سنیچر کو حل کر کے لے آنا، اس دن اتفاق سے میرے کسی رشتہ دار کے یہاں کوئی تقریب تھی مجھے تقریبات سے بہت وحشت تھی جب تک مجھے زبردستی نہ لے جایا جاتا میں کسی تقریب میں نہ جاتا، میرے گھر کے سب لوگ اس تقریب میں چلے

گئے تھے، اس وقت افراد کی تعداد بھی گھر میں کم ہی تھی، بس والد صاحب اور دادا، اور دو مجھ سے بڑی بہنیں، اور پانچواں میں، گھر کی کل کائنات یہی تھی۔ چاروں اس تقریب میں چلے گئے، میں گھر پر اکیلا تھا، ظہر کے بعد میں کاپی لے کر حساب کے سوالات حل کرنے کیلئے بیٹھ گیا اس میں مجھے اتنا استغراق ہوا کہ گردو پیش کا سارا ماحول فراموش ہوگیا۔ میرا ایک ساتھی گھر میں داخل ہوا مجھے کچھ احساس نہیں ہوا وہ میرے پاس آ کر چپکے سے بیٹھ گیا اس کا بھی مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔ وہ ساتھی ایسا تھا کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرا حساب دیکھے، لیکن وہ کتنی دیر تک دیکھتا رہا یہ اس کے بتانے کے بعد مجھے معلوم ہوا، وہ دیر تک خاموش دم سادھے بیٹھا رہا، پھر اچانک ایک رسالہ میری کاپی پر رکھ دیا جس کے سرورق پر ایک بھیانک چہرہ اور سر کی تصویر تھی، میں تقریباً چیخ پڑا، میرا دل دھک دھک کرر ہا تھا وہ ساتھی بھی گھبرا گیا۔ ایک تو اچانک میری کاپی پر ایک اجنبی چیز کا آجانا پھر جو اس پر تصویر بنی تھی وہ بھوت بن کر میرے دماغ کو چمٹ گئی۔ استغراق تام سے افاقہ ایسا جبری ہوا کہ اب تک جب وہ تصویر کبھی سامنے آجاتی ہے تو وہی سابقہ کیفیت عود کرنے لگتی ہے، یہ رسالہ ''پاسبان'' تھا، جو پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے ماہانہ نکلا کرتا تھا، والد صاحب اس کے خریدار تھے اور یہ تصویر ٹیگور کی تھی جس کی نہ جانے کتنی کتنی مدح ہوتی ہے، اوراس رسالے میں بھی تمام مداحی تھی، مگر میرے ذہن میں اب تک وہ ایک بھوت ہی ہے۔

انوکھا کھیل:

میرے بچپن میں گاؤں کی آبادی زیادہ پھیلی ہوئی نہ تھی، بہت سی زمینوں کی احاطہ بندی تو تھی مگر ان میں کوئی عمارت نہیں تھی، بعض بنجر زمینیں ادھر ادھر خالی پڑی تھیں۔ ان احاطوں میں اور خالی زمینوں میں ایک مخصوص طرح کے خاردار پودے بہت زیادہ اگ آتے تھے، اب بھی اگتے ہیں مگر ان کے لئے اب زمین تنگ ہوگئی ہے، یہ پودے کمر تک آتے تھے، ان میں زرد رنگ کے پھول عجب بہار دکھاتے بس ایک تنا ہوتا اس پر بھی کانٹے ہوتے اس کے پتوں پر بھی کانٹے ہوتے، ہم لوگ اسے ''بھڑ بھڑوا'' کہتے، اس کا ایک پودا جہاں اُگ آتا کچھ دنوں کے بعد وہاں کی خالی زمین پورے طور سے بھر جاتی، جب ہوا تیز چلتی تو یہ پودے خوب لہراتے، میرا کھیل انھیں پودوں پر ہوتا، بانس کی ایک پتلی سی چھڑی لیکر میں بھڑ بھڑوا سے بھرے ہوئے کسی احاطہ میں چلا جاتا، وہاں

مکمل تنہائی ہوتی، کیونکہ ان کانٹوں سے الجھنے کون آتا، میں ایک کنارے کھڑا ہوجاتا اور زور سے پکارتا، پڑھو، اگر ہوا چلتی ہوتی اور پودے جھومتے ہوتے تو میں فرض کر لیتا کہ سب پڑھ رہے ہیں، میں اس منظر سے خوش ہوتا۔ شاباشی کے کلمات کہتا، اور اگر ان کا جھومنا بند ہوجاتا تو میں چھڑی سے انھیں مارنا شروع کر دیتا، سب کی گردنیں جھولتی چلی جاتیں اور کہتا جاتا کہ نہیں پڑھو گے تو یہی سزا ملے گی، آدھ گھنٹہ پون گھنٹہ اس مشغلہ میں گزر جاتا۔ کبھی مارنا کبھی ڈانٹنا، کبھی چمکارنا، کبھی ترغیب دینا، جب واپس آتا تو کہہ کر آتا کہ اچھا فلاں وقت پھر آؤں گا سبق یاد کر کے رکھنا، اگر ذرا بھی غلطی ہوئی تو پھر پٹائی ہوگی۔ یہ مشغلہ مدتوں جاری رہا۔ بھڑ بھڑ وا کا موسم ختم ہوجاتا اور اس کے پودے سوکھ کر ختم ہوجاتے تو میرے اوپر ایک بے کیفی سی طاری ہوجاتی اور جب وہ ہرے بھرے ہونے لگتے تو مجھ پر پھر وہی نشاط طاری ہوجاتا۔

احمد کا معجزہ:

میرے دادا اور میرے بڑے والد اور خاندان کے بعض اور بزرگوں کا تعلق کہنڈہ کے ایک نقشبندی شیخ حضرت حافظ حامد حسن صاحب سے تھا، ان کے تعلق کی وجہ سے یہ دونوں حضرات ذکر و شغل اور وظائف و مراقبہ میں لگے رہتے، مجھے ہوش ہوا تو حافظ صاحب کا وصال ہو چکا تھا ان کے خلیفہ حضرت صوفی عبدالرؤف صاحب مئوی علیہ الرحمۃ ہمارے یہاں آتے تھے، اور بڑے والد ان کے یہاں جایا کرتے تھے، میں نے انھیں بچپن میں کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ ان کے پاس بیٹھا ہوں، عجب نورانی چہرہ تھا، خوبصورت دمکتا ہوا اس پر نہایت حسین و جمیل سفید بڑی بڑی گول داڑھی، میں نے اتنا نورانی چہرہ کم دیکھا ہے، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اندر سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں، بچوں سے بہت پیار کرتے تھے ان سے خوب میٹھی میٹھی باتیں کرتے۔

ایک بار بڑے والد صاحب کے گھر چھوٹے سے کھٹولے پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے، نیچے چٹائی پر ان کے پاؤں سے لگ کر بڑے والد صاحب کے دو بیٹے بیٹھے ہوئے تھے اور ایک کنارے میں بھی دبکا ہوا تھا انھوں نے باری باری ہر ایک کے سر پر دست شفقت رکھا ان کا ہاتھ کیا تھا جیسے دبیز ریشمی مخمل، پوچھا تمھارا کیا نام ہے؟ بتایا محمد بلال، فرمایا بلال موذن، حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن تھے، پھر پوچھا اور تمھارا کیا نام ہے اس نے کہا ابوہریرہ، مسکرانے لگے فرمایا بلی

کا باپ! پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا، اخیر میں میرے سر پر ہاتھ رکھا اور پوچھا کہ تمھارا کیا نام ہے، عرض کیا اعجاز احمد، فرمایا تم احمد کے معجزے ہو، ہم لوگوں کو بہت خوشی ہوئی، میں اور بلال کچھ دنوں تک اس کا مذاکرہ کرتے اور خوش ہوتے رہے۔ ابو ہریرہ اس وقت بہت چھوٹا تھا اسے شاید یہ بات یاد بھی نہ ہوگی۔

اللہ کا کرنا دیکھئے، حق تعالیٰ نے ان بزرگ کی بات بلال کے حق میں سن لی، بلوغ کے پہلے سے بلال نے مسجد میں اذان دینی شروع کی اور آج تک وہ اذان دے رہا ہے، نہایت مستعدی سے بلا ناغہ پابندی وقت کے ساتھ۔

ابو ہریرہ کو اللہ تعالیٰ نے نہایت اچھی دینی صلاحیت سے نوازا، بہت متقی پابند نماز، صاحب اوقات، دینی معلومات بھی خوب ہیں نہایت متواضع اور خدمت گزار!

تیسرا آدمی منتظر ہے کہ اس کے حق میں بھی ان بزرگ کا قول مقبول ہو، بظاہر تو آثار نہیں نظر آتے باقی اللہ کیلئے کچھ مشکل نہیں۔

بچپن کی دعا:

بچپن کی ایک عجیب بات ذکر کروں۔ گھر میں دینداری کا چرچا تو بحمد اللہ تھا ہی، دینی کتابوں کا مطالعہ بھی خوب ہوتا رہتا، بھائی کے انتقال کے بعد والد صاحب کی گفتگو سے یہ بات ذہن میں خوب پختہ ہوگئی تھی کہ جب کوئی بچہ مر جاتا ہے تو وہ سیدھا بے کھٹکے جنت میں جاتا ہے اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، اور بالغ ہونے کے بعد طرح طرح کے گناہوں میں گھر جاتا ہے تو جنت میں اس کا ابتدائی داخلہ مشتبہ ہو جاتا ہے، اس بات نے دل میں اشتیاق پیدا کیا کہ بچپن میں ہی موت واقع ہو جائے اس کیلئے دعائیں کیا کرتا، جب بیمار ہوتا تو خوش ہوتا کہ شاید اسی میں مر جاؤں، اور سیدھا جنت میں پہونچ جاؤں، بیماری میں جنت کا تصور خوب رہتا، بار بار بیمار پڑنے اور دعائیں کرنے کے بعد بھی جب موت نہیں آئی تو سوچا کہ کسی خاص وقت میں دعا کرنی چاہئے۔ شب برأت آئی، استاذ محترم مولانا عبد الستار صاحب نے تقریر میں اس کی فضیلت بیان کی کہ اس رات میں دعائیں قبول ہوتی ہیں، مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کی کتاب ”پردہ کی باتیں“ میں بھی شب برأت کی برکت پڑھی تھی، مغرب کے بعد میں نے اپنے بھائی محمد بلال سے اس کا ذکر کیا کہ

آج چلو مرنے کی دعا کریں کہ نابالغی ہی میں ہم لوگ مرجائیں، بالغ ہونے کے بعد نہ جانے کس مصیبت میں پڑیں، بلال نے میری تجویز پر صاد کی، ہم دونوں بانس کی سیڑھی سے کوٹھے پر چڑھ گئے اور سیڑھی کھینچ لی کہ کوئی دوسرا نہ آجائے اور ہماری دعا میں خلل پڑ جائے، کیونکہ عزم تھا کہ آج اس دعا کو قبول کرواہی لینا ہے۔

پہلے دو رکعت نماز پڑھی گئی اس کے بعد دعا کے تمام آداب برتتے گئے اپنی زبان میں اللہ کی خوب تعریف کی، دہرا دہرا کر خوب درود شریف پڑھا، پھر خوب گریہ وزاری کے ساتھ دعا شروع کی..... واقعی ہم دونوں آنسوؤں سے رو رہے تھے..... بڑی دیر تک، کس بات کی؟ نابالغی میں مرنے کی! پھر یقین تھا کہ ہم دونوں جلد ہی مرجائیں گے اس وقت ڈر کی وجہ سے کسی کو اس دعا کے بارے میں بتایا نہیں تھا، مگر اب تک دونوں جی رہے ہیں اور مصائب میں مبتلا ہو رہے ہیں نہ جانے کیا ہو! اللہ تعالیٰ درگزر کا معاملہ فرمائیں۔

تصویر سے وحشت:

پرائمری کے آخری درجہ کے امتحان میں کامیابی کے بعد ماسٹر صاحب نے میرے سامنے ہی والد صاحب سے کہا کہ یہ لڑکا بہت تیز ہے، اسے انگریزی تعلیم دلوائیے، آگے چل کر یہ بہت اچھا ثابت ہوگا، والد صاحب نے قبول کرلیا، اس وقت مکتب میں درجہ پانچ تک انگریزی کی کوئی کتاب نہیں پڑھائی جاتی تھی، جب کہ اسکول میں داخلہ کیلئے انگریزی شرط تھی۔ والد صاحب نے ماسٹر صاحب کے حسب ہدایت کوئی انگریزی ریڈر انگریزی لکھنے کی کاپی اور اس کا مخصوص قلم خرید کر مجھے دیدیا، اور میں اس ساز وسامان کو لے کر ماسٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوگیا، وہ نہایت دلسوزی اور شفقت سے مجھے پڑھانے لگے، کئی دن پڑھتے گزر گئے تھے کہ ایک روز میں اپنے ایک ساتھی کے گھر پہونچا وہ پچھلے سال پانچ پاس کر کے انگریزی اسکول میں پڑھنے لگا تھا۔ میں جب اس کے پاس پہونچا تو وہ برش سے ایک گائے کی تصویر بنا رہا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ کیا کررہے ہو، کہنے لگا کہ پکچر بنا رہا ہوں میں نے پوچھا کہ کیا یہ تصویر بنانی پڑتی ہے؟ اس نے کہا کہ اسکول میں تو یہ ضروری ہے، میں نے اس سے کہا کہ تصویر بنانی تو حرام ہے، دوزخ کے کھٹکا میں حدیث ہے کہ جو کوئی جاندار کی تصویر بنائے گا، اسے قیامت کے دن مجبور کیا جائے گا کہ اس

میں روح ڈالے، حضور ﷺ نے تو اس سے منع کیا ہے۔ یہ دیکھ اور کہہ کر میں گھر آیا اور والد صاحب سے ساری صورت حال بتائی، اور میں نے انگریزی پڑھنے سے صاف انکار کر دیا، والد صاحب میری بہت دلداری کرتے تھے، انھوں نے خوشی ظاہر کی اور رات کو مغرب کے بعد حافظ احمد کریم صاحب مرحوم کے گھر جب سب لوگ جمع ہوئے میں بھی وہاں حاضر تھا، والد صاحب نے مولانا عبدالستار صاحب سے ساری بات کہی، مولانا بہت خوش ہوئے انھوں نے فرمایا کہ آمد نامہ اور فارسی کی پہلی دے کر اسے کل میرے گھر بھیج دو، میں اسے پڑھادوں گا، مجھے اس سے بہت خوشی ہوئی۔

غیر معمولی ذہانت:

ایک زمانہ میں جلسوں اور مشاعروں کا مجھے شوق ہو گیا تھا، جلسے بکثرت ہوا کرتے تھے، خود بھیرا میں، اس کے علاوہ ولید پور میں، خیرآباد میں، مبارک پور میں، کم کوئی جلسہ مجھ سے چھوٹتا تھا۔ کبھی علمائے دیوبند کے جلسے ہوتے تو کبھی علمائے بریلی کے، میں دونوں میں یکساں پابندی سے جاتا۔ والد صاحب کی طرف سے بریلی کے جلسے میں جانے کی پابندی تھی، مگر میں چوری چھپے چلا جاتا تھا، انھیں معلوم ہو جاتا مگر نظر انداز کر دیتے، ایک مرتبہ خیرآباد میں بریلویوں کا جلسہ تھا، اس میں ایک نیا نام دیکھا کمیل اشرف کچھوچھوی، میں اس میں جانے کیلئے بیتاب ہو گیا، والد صاحب سے اجازت ملنے کا کوئی سوال نہیں تھا، جاڑے کا موسم تھا چند ساتھیوں کو تیار کیا، بھیرا اور خیرآباد کے درمیان ٹونس ندی حائل ہے، کشتی سے اسے پار کرنا ہوتا تھا، جاتے وقت ملاح سے بات کر لی تھی کہ تم آج یہیں ندی پر رہو ہم لوگ ایک بجے کے بعد آئیں گے تو ہم کو پار کر دینا، ملاح نے ہم بچوں کی رعایت کی وہیں ندی کے کنارے ایک چھپر میں پڑ کر وہ سو گیا۔ کمیل اشرف کی تقریر بشریت رسول کی نفی پر بڑی مرتب، مرصع اور دلآویز ہوئی، اتنی مرتب اور دلکش تقریر تھی کہ مجھے اول سے آخر تک وہ یاد ہو گئی، بولنے کا انداز میرے دل میں کھب گیا، میں ان کے بیان کردہ دلائل سے تو متأثر نہیں ہوا، کیوں کہ میرے پاس ان کے تمام دلائل کے جواب موجود تھے، مگر اسلوب و انداز نے مجھے مسحور کر دیا تھا، رات ہی میں واپس آ گیا، دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، اس لئے ادھر ادھر باقی رات گزار دی اور جیسے ہی والد صاحب فجر کی نماز کے لئے اٹھ کر باہر نکلے، میں گھر میں

گھس کر اس طرح سو گیا جیسے پوری رات بستر پر ہی رہا ہوں، والد صاحب نماز پڑھ کر آئے میری تو نماز اس وقت تک معاف تھی، جب سو کر اٹھا تو انھوں نے خفگی کے لہجے میں سوال کیا کہ رات کہاں تھے؟ جھوٹ کی عادت نہ تھی، نہ اس کا یارا تھا، سچ سچ بتا دیا، وہ خفا ہونے لگے، میں نے سوچا کہ ان کی خفگی دور کرنے کی صورت بس یہی ہے کہ انھیں جلسہ کا حال اور اپنی یادداشت کا کمال بتا دوں، میں نے تقریر کی دلآویزی اور یادداشت کو بتایا، تو فرمانے لگے اچھا سناؤ، میں نے من وعن پوری تقریر دہرادی، وہ دلچسپی سے سنتے رہے پھر میری خطا معاف ہوگئی۔

غیبی مدد:

امتحان کے زمانے میں تسہیل الکافیہ کی مدد سے کافیہ کا تکرار آسان ہوگیا، لیکن تکرار جب حال کی بحث تک پہونچا اور میں نے اس کا مطالعہ شروع کیا تو ایسا لگا، جیسے میں نے یہ بحث پڑھی ہی نہیں، مطالعہ کرتے کرتے دماغ تھک گیا، جس طرح تھکا بیل ہل جوتتا جوتتا بیٹھ جاتا ہے، اور ہزار تدبیروں کے بعد بھی نہیں اٹھتا، بعینہ وہی حال میرا تھا۔ دماغ تھک کر بیٹھ گیا تھا، اس کے سامنے حروف آتے تھے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، ظہر کی نماز کے بعد سب طلبہ کے درمیان اس بحث کو سمجھانا تھا، جب میرا دماغ تھک گیا تو میں کتاب لے کر ایک ایسی مسجد میں چلا گیا، جو اہل حدیث کی مسجد کہلاتی تھی مگر اس میں نماز باجماعت کا انتظام واہتمام نہ تھا اور مشہور تھا کہ اس میں جن بہت رہتے ہیں ہلکی گرمی کا موسم تھا، میں اکیلا تھا کتاب دیکھنے لگا مگر دماغ کا اب بھی وہی حال تھا میں نے جھنجھلا کر کتاب رکھ دی، اور لیٹ گیا، تھوڑی دیر میں نیند آ گئی جیسے نیند آئی، خواب میں دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ سفید ریش خوبصورت عمامہ باندھ کر تشریف لائے دل میں یہ بات جمی کہ یہ صاحبِ کافیہ علامہ ابن حاجب ہیں، مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اب ان سے یہ بحث براہ راست پڑھوں گا، خواب میں یہ خبر کہاں کہ یہ خواب ہے وہ تو آنکھ کھلنے پر کھلتا ہے کہ یہ خواب تھا۔ انھوں نے آتے ہی فرمایا کہ کون سا مسئلہ تمھیں سمجھ میں نہیں آتا؟ میں نے کتاب کھول کر حال کی بحث سامنے رکھ دی، انھوں نے اس کی نہایت واضح اور مفصل تقریر کی، پورا مسئلہ ذہن نشین ہوگیا اتنی خوشی ہوئی کہ میں اسے بیان نہیں کرسکتا، دوخوشی، ایک تو مسئلہ حل ہونے کی، اور دوسری صاحب کافیہ کی شاگردی کی! وہ صاحب تو سمجھا کر چلے گئے، اور خوشی کی بیتابی میں میری آنکھ کھل گئی، اب سمجھ میں

آیا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ خواب کا معاملہ تھا میں نے جھٹ کتاب کھولی مگر اتنی دیر میں ان کی پوری تقریر فراموش ہو چکی تھی، کچھ یاد نہیں آیا، اب میرے اوپر جاں کنی جیسی کیفیت طاری تھی ابھی خوش تھا مگر وہ خواب کی خوشی تھی، اس کے ایک لمحے کے بعد کربناک اذیت میں مبتلا تھا، جیسے جان نکل رہی ہو، یہ بیداری کی تکلیف تھی، مجھے اپنے اوپر غصہ آرہا تھا، مایوسی ہو رہی تھی میں نے کتاب اٹھائی، اور جامع مسجد میں آگیا، ظہر کی اذان ہو چکی تھی اسی اذیت میں نماز ادا کی، طلبہ سب موجود تھے، اکٹھا ہو کر بیٹھ گئے، میں بھی مردہ جیسی حالت میں ان کے درمیان بیٹھ گیا، چہرے پر ہوائی اڑ رہی تھی، میں کہنا چاہ رہا تھا کہ آج کچھ حل نہیں ہو سکا اس لئے تکرار موقوف! مگر جونہی کتاب کھولی ،اور ایک نگاہ متعلقہ مسئلہ پر ڈالی، اچانک محسوس ہوا کہ سب کچھ دماغ میں موجود ہے، پھر تو اس کو میں نے اس طرح سمجھایا کہ جیسے کوئی کہنہ مشق استاذ پڑھاتا ہو، طلبہ حیران تھے کہ آج جیسا تکرار پہلے نہیں ہوا تھا، میں نے اس وقت بعض مصلحتوں سے اسے ظاہر نہیں کیا لیکن آج بھی یہ واقعہ میرے سامنے اس طرح تازہ ہے جیسے کل کی بات ہو۔

غیر معمولی جذبہ:

زمانہ طالب علمی میں شرح تہذیب کے عربی میں پرچہ لکھنے اور ایک استاد کے غیر تشجیعی تبصرہ نے مجھ میں ایک نیا جنون پیدا کر دیا، وہ یہ کہ اب عربی تحریر وتقریر کی مشق کرنی چاہئے، تقریر کیلئے تو ایک درجے میں ماحول چاہئے، مگر تحریر کیلئے یکسوئی کافی تھی، میں نے ندوۃ العلماء کے نصاب کی معلم الانشاء کے تینوں حصے خرید لئے اس میں عربی عبارتوں کا اردو میں ترجمہ کر لینا تو بہت آسان تھا مگر اردو کو عربی میں منتقل کرنا میرے لئے نہایت دشوار تھا، مشق وتمرین کی عربی عبارتوں سے اس مشکل کام میں قدرے سہولت ملتی تھی مگر اس کے لئے اردو، عربی لغت ہونا ضروری تھا اور میرے پاس ایسی کوئی کتاب نہ تھی، اس وقت اس موضوع پر دو کتابیں مدرسہ کے کتب خانے میں تھیں ایک مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی کی ''اردو عربی لغات'' اور دوسری مولانا وحید الزماں صاحب کی ''القاموس الجدید'' یہ دونوں مختصر تھیں، اور دونوں مفید تھیں، مگر مجھے القاموس الجدید زیادہ پسند تھی، امتحان کے بعد میں گھر آگیا۔ یہاں اس موضوع پر کوئی کتاب نہ تھی معلم الانشاء پر محنت ہوتی رہی، میرے گاؤں میں ایک بزرگ صاحبِ مکتبہ تھے، والد صاحب سے ان کا دوستانہ تھا

، وہ کتابیں فروخت کرتے تھے، میں نے والد صاحب سے اجازت لے کر عربی چہارم کی درسیات کا آرڈر انھیں دے دیا تھا، اس کے ساتھ القاموس الجدید بھی لکھوادی تھی، کہ وہ آجائے گی، تو عربی تحریر میں آسانی ہوگی، رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہوچکا تھا، مجھے بڑی بے تابی تھی انھوں نے اطمینان دلایا تھا کہ ۱۵/ کے بعد کتابیں آجائیں گی مگر نہ آئیں، میں پریشان تھا، عشرۂ اخیر شروع ہوا تو میں نے اعتکاف کرلیا، دوسرے ہی دن حافظ صاحب کتابیں لے کر آگئے، وہ پریشان تھے کہ ایک کتاب غلط آگئی تم نے قطبی کہا تھا، اور یہ بـالـقطبی ہے، میں نے کہا کچھ حرج نہیں یہی چاہئے تھی، مجھے القاموس الجدید کی تلاش تھی، القاموس متوسط سائز میں بہت خوبصورت، روشن اور رنگین ٹائیٹل کے ساتھ تھی، دیکھ کر آنکھیں چمک اٹھیں میں نے سوچا شاید دوسرا ایڈیشن ہو، ہاتھوں میں لے کر اسے دیکھا تو بجائے اردو سے عربی میں ہونے کے عربی سے اردو تھی، میری ساری خوشی اچانک سرد پڑ گئی، بے ساختہ میرے منھ سے نکلا یہ غلط آگئی، وہ گھبرائے، اس میں ان کی غلطی نہ تھی، بات یہ تھی کہ میرے علم میں صرف وہی القاموس الجدید تھی جو اردو سے عربی ہے، یہ دوسری ابھی لکھی ہی نہ گئی تھی میں نے وہی جو میرے ذہن میں تھی لکھ دی، یہ ابھی حال میں لکھی گئی، اور تازہ ایڈیشن اس کا چھپا تھا ، کتب خانہ والے نے دیوبند سے اسی کو بھیج دیا، میں سراسیمہ ہوا کہ میرا سارا منصوبہ فیل ہوگیا، اب کیا کروں؟ فوری طور پر میری مطلوبہ کتاب آبھی نہیں سکتی، پھر میرے شوق وآرزو نے مسئلہ کا حل نکال لیا، میں نے اسی کتاب پر محنت کی اور عربی الفاظ کے جو معانی اردو میں لکھے گئے تھے، میں ایک کاپی میں ان اردو الفاظ کو اصل بنا کر ان کی عربی لکھنے لگا اس میں مجھے بہت محنت کرنی پڑی مگر اس کا فائدہ یہ ہوا کہ پوری کتاب مجھے تقریباً حفظ ہوگئی، تین چار روز تک یہ عمل جاری رہا، پھر مجھے محسوس ہوا کہ میں اس کے الفاظ ومعانی پر حاوی ہوگیا ہوں تو معلم الانشاء کے اردو تمرینی جملوں کو عربی میں منتقل کرنے لگا اور یہ کام بھی بہت تیزی سے کیا، اعتکاف کی یکسوئی نصیب تھی، عبادت وتلاوت کی جگہ میں اسی کام میں لگا رہا رمضان کی برکت سے مجھے جلد مناسبت ہوگئی، اردو میں مضامین لکھ لیا کرتا تھا اب عربی میں بھی لکھنے لگا، دیکھتے دیکھتے اعتکاف کے ایام گزر گئے، عید کے بعد بھی اسی مشغلے میں رہا، اب لکھنے بھی لگا اور کچھ کچھ بولنے بھی لگا۔

ثوان کا معمہ:

طالب علمی کا دور بھی عجیب دور ہے، کبھی کسی جگہ آدمی اٹکتا ہے تو دیر تک اٹکا رہتا ہے اور جب نکل جاتا ہے تو سوچتا ہے کہ یہ کون سی اٹکنے کی جگہ تھی، میں مجلّہ الحج پڑھ رہا تھا، رات کے بارہ بجے کا عمل تھا اس میں ایک لفظ آیا ''ثوان'' اس پر اٹک گیا، پہلے سیاق وسباق سے سمجھنے کی کوشش کی مگر نہیں حل ہوا، پھر لغت کی کتابیں الٹنی پلٹنی شروع کیں، مگر مادہ ہی نہیں سمجھ میں آرہا تھا کافی دیر تک جھک مارتا رہا، لغت کی ہر کتاب دیکھ لی لیکن کچھ سراغ نہ ملا، مادے میں جو جو احتمالات تھے سب ڈھونڈ لئے مگر اندھیرا، خیال ہوا کہ پہلا حرف ثاء ہے پورا باب پڑھ ڈالوں، شاید کہیں مل جائے، اس کے تحت ابتدائی کلمات مفردہ سب پر نگاہ دوڑائی لیکن اندھیرا ہی رہا، پھر سوچا کہ مفرد کی جمع جو درمیان سطر میں لکھی رہتی ہے اس پر محنت کروں اس کے لئے لغت کی سب سے مختصر کتاب لغات جدیدہ جو حضرت مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ کی مرتب کردہ ہے دیکھنی شروع کی، اس میں لفظ ''ثوان'' نظر آ گیا، معلوم ہوا کہ وہ ثانیہ کی جمع ہے جس کے معنی سکنڈ کے ہیں اب طبیعت کو انشراح ہو گیا، اس کاوش میں مجھے ڈیڑھ گھنٹے لگ گئے، آج یہ بہت معمولی بات معلوم ہوتی ہے، مگر اس وقت یہ مسئلہ بہت اہم اور مشکل تھا۔

تجلی کا عکس:

ایک مرتبہ ایک مسئلہ قطبی میں الجھ گیا تھا، میں تین دن تک اس پر غور کرتا رہا، اس وقت قطبی کی کوئی شرح اردو میں نہ تھی، عربی میں اس کا ایک حاشیہ قطبی پر تھا، اسے دیکھا مگر الجھن دور نہ ہوئی، میں سوال کرنے سے بہت شرماتا تھا، حالانکہ یہ بات حصول علم کے راستے میں مضر ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ کو اتنا زبردست علم کیونکر حاصل ہوا، جواب میں آپ نے فرمایا بلسان سئول وقلب عقول، بہت پوچھنے والی زبان، اور بہت سمجھنے والی ذہانت سے! یہ بات مجھے اس وقت بھی معلوم تھی مگر طبیعت کا شرمیلا پن غالب تھا اور اب بھی غالب ہے، مجھے کچھ پوچھنے میں ہچکچاہٹ ہوتی ہے، اس وقت اس کی تاویل میں میں یہ سوچا کرتا تھا کہ مصنف نے اپنی حد تک سمجھا کر لکھنے کی کوشش کی ہے، پھر حاشیہ اور شرح والوں نے اسے مزید صاف کیا ہے، تیسرے نمبر پر استاذ نے محنت کی اور اس مقام کو حل کیا، اتنے کے بعد بھی میں نہ

سمجھوں، تو تف ہے میرے اوپر! میں الجھا رہا، میں اس دوران استاذ سے پوچھنے نہیں گیا، تین دن کے بعد جب عاجز آ گیا تب استاذ محترم حضرت مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے مولانا کے سامنے کتاب کھولی اور مسئلہ حل ہوگیا، پھر پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہی لیکن شرما حضوری میں میں نے متعلقہ مسئلہ اور عبارت دریافت کی، مولانا نے وہی تقریر فرمادی جو ابھی میں سمجھ چکا تھا۔

میں اس مسئلہ میں بہت متحیر ہوا کہ تین روز کوشش کے باوجود وہ بات میری سمجھ میں نہ آئی اور یہاں اچانک کیسے سمجھ میں آ گئی، مدرسہ کے سب سے بڑے عالم استاذ العلماء حضرت مولانا مفتی محمد یاسین صاحب نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں کسی مناسبت سے یہ بات میں نے ذکر کی تو فرمایا کہ طالب علم کے اندر سمجھنے کی استعداد پہلے سے موجود ہوتی ہے، پھر یہ کہ وہ اس پر محنت کر چکا ہوتا ہے استاذ کے ذہن میں وہ بات روشن ہوتی ہے جب استاذ کے سامنے پہونچتا ہے تو وہ بات بطور تجلّی کے صاحب استعداد طالب علم کے ذہن میں منتقل ہو جاتی ہے۔

ذہانت کا کمال:

حضرت مولانا محمد مسلم صاحب نور اللہ مرقدہ کے یہاں شرح جامی کا پہلا گھنٹہ تھا، میں رات کو دیر تک جاگتا تھا فجر کی نماز کے بعد تلاوت سے فارغ ہو کر کچھ دیر سو جاتا تھا، وقت سے آدھ گھنٹے پہلے اٹھتا اور شرح جامی کا مطالعہ کرتا پھر درس میں حاضر ہوتا، ناشتہ کا کوئی معمول نہ تھا ایک روز وقت سے چند ہی منٹ پہلے آنکھ کھلی جلدی جلدی عبارت دیکھ لی اطمینان سے مطالعہ کر کے کتاب حل کرنے کا موقع نہ مل سکا، میں ساتھیوں کے ساتھ درسگاہ میں حاضر ہوا تو ایک دوسرا رنگ دکھائی دیا، مولانا کے استاذ حضرت مولانا محمد عثمان صاحب ساحؔر مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ درسگاہ میں موجود تھے ہمارے مولانا سمٹے سمٹائے ادب سے بیٹھے تھے حضرت مولانا محمد عثمان صاحب اس وقت دھولیہ میں پڑھاتے تھے، ایک سال کے بعد وہ احیاء العلوم میں آ گئے اور ہم لوگوں کے براہ راست استاذ ہوئے، درس کا وقت ہو گیا استاد شاگرد سب خاموش بیٹھے تھے، مولانا محمد مسلم صاحب ادب کی وجہ سے درس شروع نہیں کر رہے تھے اچانک مولانا کی ذہانت نے رخ بدلا، فرمانے لگے تم میں سے آج کون سبق پڑھائے گا؟ اس وقت جماعت میں مولانا کی نگاہ دو یا تین طالب علموں پر تھی جو

یہ خدمت انجام دے سکتے تھے، مگر ہر طرف سناٹا تھا، مولانا کی نگاہ میں اس وقت تک میں نہ تھا میں نے دیکھا کہ سب خاموش ہیں تو دبی زبان سے میں نے حامی بھری، فرمایا پڑھو، میں نے دس بارہ سطریں پڑھیں، فرمایا بس مطلب کی تقریر کرو، میں نے ڈرتے کانپتے مختصر الفاظ میں سبق کی تقریر کردی، کہیں کہیں مولانا نے اصلاح فرمائی اور فرمایا بس جاؤ، آج کا سبق اتنا ہی رہا، جسے مولانا نے مسلّم رکھا۔

مطالعہ کا انہماک:

ایک روز بارہ بجنے کے بعد بھی میں کتب خانہ میں بیٹھا رہ گیا، مولوی محمد حنیف صاحب (نگران کتب خانہ دارالعلوم دیوبند) کسی کام میں مشغول تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب فارغ ہوئے تو دروازہ بند کرنے لگے، پھر انھیں کچھ خیال آیا تو پلٹ کر دیکھا کہ میں ابھی تک کتاب دیکھے جا رہا ہوں۔ ڈانٹنے لگے کہ تمہاری وجہ سے کیا میں یہیں پڑا رہوں، چلو باہر چلو، میں تو دروازہ بند کردئے ہوتا، مگر تم یاد آگئے پھر مسکرانے لگے، اور فرمایا کہ میں کتب خانے میں اس کام پر ۳۰؍سال سے ہوں اس تیس سال کے عرصہ میں کتب خانے کو سب سے زیادہ استعمال کرنے والے تین طالب علم ملے، اور اتفاق ہے کہ تینوں اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں، بلکہ دو تو بھائی تھے، ایک امانت اللہ، دوسرے نعمت اللہ! اور تیسرے تم ہو، اس وقت ہم تینوں کا ضلع اعظم گڈھ تھا، اب مئو ضلع میں آگئے ہیں۔

مطالعہ کا شوق:

ہم دونوں (مفتی عزیز الرحمان صاحب اور میں) دوستوں نے آپس میں طے کیا تھا، کہ رات کا بیشتر حصہ جاگ کر مطالعۂ کتب میں گزاریں گے، ساتھ رہیں گے مگر بات چیت نہ کریں گے، بس مطالعہ میں منہمک رہیں گے، چنانچہ ہم دونوں پوری پوری رات، بغیر گفتگو کے اور بغیر پیٹھ لگائے گزار دیتے تھے، ایک بار تو مسلسل دو ہفتہ مَیں رات میں نہیں سویا، اور وہ بھی رفیق بیداری رہے، صرف دو گھنٹہ دن میں کھانا کھانے کے بعد میں سوتا تھا، لیکن اللہ کا فضل تھا کہ نیند کا دباؤ کبھی نہیں ہوتا تھا، اس جاگنے کے لئے کچھ تدبیریں بھی کام میں لاتا تھا، کہیں پڑھا تھا کہ زیادہ پانی پینے سے زیادہ نیند آتی ہے، کیونکہ اس سے مزاج بلغمی ہوجاتا ہے، اور بلغمی مزاج والے کو نیند بہت آتی

ہے، اور یہ بھی کہ زیادہ کھانے سے زیادہ پانی پینے کی ضرورت ہوتی ہے، میں نے اپنی طبیعت پر پابندی لگائی اور کھانا کم کرنے کو سوچا تو روزہ کی راہ نظر آئی، رات کو جاگنے کا پروگرام تو تھا ہی، اخیر شب میں سحری کا انتظام کیا، اس انتظام میں مولوی عزیز الرحمٰن نے شرکت نہیں کی، مجھے اس کے لئے ایک رفیق کی ضرورت تھی کہ اخیر شب میں سحری کے لئے کچھ گرم کرنے کی ضرورت پیش آئی، تو میں کیا کروں گا؟ اسٹوپ چلانے اور کچھ پکانے سے میں بالکل کورا تھا، حق تعالیٰ کی مدد ہوئی، ایک دوست بے وہم وگمان مل گئے، یہ تھے مولوی عباد الرحمٰن بلندشہری بہت نیک اور متقی! نماز تلاوت کے بہت پابند، غالباً حضرت مولانا مسیح اللہ صاحب جلال آبادی علیہ الرحمہ سے بیعت واصلاح کا تعلق رکھتے تھے، مولوی عزیز الرحمٰن کے واسطے سے ان سے ملاقات ہوئی، یہ دونوں ہم سبق تھے، بہر حال ان سے عہد رفاقت باندھا گیا، ان کے پاس خاموش برنل کا اسٹوپ تھا۔ ہم دونوں سحری کے وقت اکٹھا ہوتے، وہ سالن گرم کرتے اور ہم دونوں سحری کھالیتے، میری مقدار سحری میں دار العلوم کی ایک تندوری روٹی تھی، طلبہ کو ایک وقت میں دو روٹیاں ملا کرتی تھیں، یہ ایک آدمی کیلئے کم نہ تھیں اور پانی کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ اس کی چھٹی کردی، ایک ہفتہ پانی پیتا ہی نہ تھا، صرف جمعہ کو احاطۂ مولسری کے کنویں کا پانی جو بہت ٹھنڈا اور عمدہ پانی ہے، ایک ڈیڑھ جگ پی لیتا تھا۔ اس طرزِ عمل سے جاگنے میں بہت مدد ملی، کتنا ہی جاگتا نیند کا غلبہ نہ ہوتا۔

ایک بار حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کی خدمت میں حاضر تھا، وہاں میرے بزرگ کرم فرما طالب علم مولانا عبد الوحید حیدرآبادی بھی موجود تھے، وہ دار العلوم کے ممتاز طلبہ میں تھے، جن کو مولانا نے صف اول کی تدریس کی ذمہ داری سونپ رکھی تھی، انھوں نے کسی تقریب سے مولانا سے عرض کیا کہ حضرت! آپ کے پاس یہ دو جن بیٹھے ہوئے ہیں، اور مولوی عزیز الرحمٰن اور میری طرف اشارہ کیا۔ مولانا نے تعجب کا اظہار کیا، انھوں نے مولانا کو بتایا کہ یہ دونوں کئی رات سے سوئے نہیں ہیں، مگر چہرے کی تازگی دیکھئے، ذرا بھی نیند کا اثر نہیں ہے۔

مطالعہ کرنے کے لئے مدرسہ بہت ہے:

حافظ قمر الدین صاحب نونار ی سے پہلے پہل مدرسہ دینیہ غازی پور میں ملاقات ہوئی، اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ قائم ہوگیا، جامعہ حسینیہ جون پور سے ربط تو تھا ہی، حضرت مولانا محمد

مسلم صاحب کی علیٰحدگی کے بعد اس پر افسردگی چھا گئی تھی، مولانا قمر الدین صاحب نے اسے پھر تازہ کر دیا، کچھ دنوں کے بعد میں مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں مدرس ہو کر آ گیا۔ مولانا کا حکم ہوا کہ ''نوناری'' آؤ۔ میں نے تعمیل حکم کی، لیکن کس انداز سے؟ عصر کے بعد مدرسہ سے نکلا، جیپ پر بیٹھ رہا تھا تو ایک صاحب نے ایک تازہ مطبوعہ کتاب میرے ہاتھ میں تھما دی، میں نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا، کتاب بڑی دلچسپ تھی، غالباً بزرگ شخصیات کے تذکروں پر مشتمل تھی، میں اس کے مطالعہ میں محو ہو گیا، اسی محویت میں مولانا کے گھر پہونچ گیا، مولانا کی خوشی دیدنی تھی، دوڑ دوڑ کر ''اکرام ضیف'' کا حق مہمان کی حیثیت سے بہت زائد ادا کر رہے تھے، مگر مہمان تھا کہ ان کی ہر خوشی سے بے نیاز، ان کے ہر اکرام سے صرفِ نظر کئے ہوئے مطالعہ کی محویت میں بے خبر! یہ سلسلہ سوتے وقت تک چلتا رہا۔ صبح ہوئی تو پھر وہی حماقت! مولانا نے کچھ کہا نہیں، صبح میں مدرسہ چلا آیا۔ اس کے بعد کافی عرصہ تک ''نوناری'' بلانے کا نام نہیں لیا، ایک دن میں نے چھیڑ دیا، تو فرمانے لگے، مطالعہ کرنے کے لئے مدرسہ بہت ہے، آپ نوناری کیوں جائیں؟۔

بیداری میں زیارت نبوی ﷺ:

ایک روز حضرت مولانا عبد الحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں، میں ابوداؤد شریف کی عبارت پڑھ رہا تھا، مولانا نہایت پاک باطن اور صاف دل بزرگ ولی تھے، سادات میں تھے، میں حدیث نبوی کی مسلسل قرأت کر رہا تھا، اسی دوران مجھ پر ایک ربودگی کی سی کیفیت طاری ہوئی، اسی حالت میں پڑھتے پڑھتے میری نگاہ باہر کی طرف اٹھ گئی، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ چند اصحاب کے ساتھ ایک طرف جا رہے ہیں، احرام جیسا لباس زیب تن فرمائے ہوئے، چہرۂ اقدس دوسری طرف تھا، میں نے پیچھے سے دیکھا، خوبصورت زلفیں تھیں چندے زیارت ہوئی پھر وہ منظر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زیارت:

امروہہ میں ہم لوگوں کی دستار بندی کا جلسہ رات کے ساڑھے بارہ بجے تک چلا، صبح کو فجر کی نماز کے بعد ٹرین تھی، اس سے وطن کی روانگی تھی، جلسہ کی ہماہمی کے بعد نیند آ گئی، خواب میں دیکھتا ہوں کہ میری بڑی بہن جو میرے لئے بمنزلہ ماں کے ہے، گھر سے اطلاع آئی ہے کہ اس کا

انتقال ہوگیا ہے، میں سخت حیران و پریشان ہوا کہ نہ میں نے اس کی کوئی خدمت کی اور نہ میں اسے دیکھ سکا، اسی پریشانی میں مدرسہ کے باہر نکلا، باہر ایک لمبا چوڑا سا چبوترہ ہے دیکھتا ہوں کہ اس پر ایک قبر ہے اور وہ کھلی ہوئی ہے، مجھے خواب میں یہ محسوس ہوا کہ یہ صاحبزادئ رسول حضرت فاطمہ بتول رضی اللہ عنہا کی قبر ہے، میں قبر کے کنارے بیٹھ کر رونے لگا، اور اماں اماں پکارنے لگا، پھر دیکھتا ہوں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا قبر سے باہر لیٹی ہوئی ہیں، اور سر اقدس میرے زانو پر ہے، آنکھیں بند ہیں میں اور بے قراری کی حالت میں اماں اماں رٹنے لگا، اماں نے آنکھیں کھول دیں، فرمایا کیا بات ہے؟ میں نے کہا دیدی (بہن) کہاں ہے؟ انھوں نے فرمایا جنت میں ہے، مت روؤ، مجھے قبر میں اتار دو، میں نے بہت احترام سے اماں کو قبر میں اتار دیا، اور مٹی برابر کردی، اتنے میں آنکھ کھل گئی، اللہ جانے اس کی کیا تعبیر ہے؟۔

جرأت رندانہ:

میں جب گھر آکر رہنے لگا، اور حفظ قرآن کے ساتھ گھریلو مشاغل میں ضم ہوا، تو والد صاحب کو خیال ہوا کہ اب خانہ آبادی ہوجانی چاہئے۔ میرا نکاح اس وقت ہوگیا تھا، جب میں عمر کی دسویں منزل میں تھا، اس وقت ہمارے معاشرے میں نابالغی کے نکاح کا بکثرت رواج تھا، غالباً ۱۹۶۰ء یا ۱۹۶۱ء رہا ہوگا، گاؤں ہی میں ایک جگہ رشتہ طے ہوا، اور مسجد میں مجھے بیٹھا کر کسی نماز کے بعد دادا مرحوم نے نکاح کا خطبہ پڑھا اور ایجاب وقبول کرادیا۔ میں قدرے باشعور تھا، مگر نابالغ تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد رخصتی کی سلسلہ جنبانی ہونے لگی، میری اہلیہ تین بہنیں ہیں، دو بڑی بہنوں کا نکاح ایک ساتھ ہوا تھا، تیسری بہن کی نسبت طے تھی مگر ابھی نکاح نہ ہوا تھا، سسرال کی جانب سے تحریک تھی کہ تینوں کی بارات ساتھ میں آئے، جس کا نکاح نہیں ہوا ہے، اس کا صرف نکاح ہوجائے، اور دو کی رخصتی ہوجائے۔ تیاریاں گفتگو کی حد تک شروع ہوگئی تھیں۔ میرے نانا مرحوم شادی بیاہ کے معاملات میں گاؤں کے چودھری تھے، اس مسئلہ میں ان سے مشورہ ضرور لیا جاتا تھا۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے تو نہیں تھے مگر وجاہت اور رعب داب میں ممتاز تھے۔ گاؤں میں ان کا بڑا لحاظ تھا، وہ گھر پر تشریف لائے اور والد صاحب سے اس موضوع پر گفتگو کرنے لگے، کتنے باراتی جائیں گے؟ کون کون ہوں گے؟ بارات کے لوازم کو کس کس طرح برتا جائے گا وغیرہ؟

اس طرح کے معاملات میں لڑکوں کو دخل دینے اور بولنے کی گنجائش نہ تھی، میں ایک طرف بیٹھا سن رہا تھا، میں سوچ رہا تھا کہ معاملہ میں اصل میں ہوں، اور علم دین کی تکمیل کرکے فارغ التحصیل ہو چکا ہوں، اور بارات میں بہت سی غیر شرعی رسمیں ہوتی ہیں، لیکن معاشرہ کی ریت یہ ہے کہ صاحبِ معاملہ کچھ نہ بولے، اسی لئے نانا کا خطاب میری طرف سرے سے ہے ہی نہیں، میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ پھر دل نے فیصلہ کیا جو کچھ بھی ہو، مجھے خاموش نہیں رہنا چاہئے، میں نے سر جھکا کر ڈرتے ڈرتے نانا سے پوچھا کس کی بارات کی بات ہو رہی ہے؟ نانا جھٹک کر بولے تمہاری بارات کی! میں نے اپنے اسی ڈر کے لہجے میں سر جھکائے عرض کیا کہ آپ لوگوں نے مجھے علم دین پڑھایا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ دین پر عمل کیا جائے۔ میں فقہ اور حدیث دونوں طرح کی کتابیں پڑھ چکا ہوں، ان میں نکاح کا تذکرہ تو ہے مگر بارات کا ذکر کہیں نہیں ہے، اس کا کوئی تعلق شریعت وسنت سے نہیں ہے، اس لئے بارات میں مَیں نہیں جاؤں گا، اس کے بعد آپ کو اختیار ہے۔ میری معروضات سن کر ابتداءً تو نانا کو جلال آیا مگر دیندار تھے، ٹھنڈے ہو گئے، والد صاحب بھی خاموش رہ گئے، مشورہ بکھر گیا۔ دوسرے دن سسرال پیغام بھیج دیا گیا کہ محض رخصتی ہوگی، بارات نہیں جائے گی، میرے خسر بھی دیندار تھے، انھوں نے اصرار نہیں کیا، بلکہ اور دونوں باراتیں بھی انھوں نے منسوخ کر دیں۔

تاریخ مقررہ پر میری اہلیہ میرے گھر آ گئی، اور اس وقت کی جو معاشرتی رسمیں تھیں، انھیں نظر انداز کر دیا گیا۔

حب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت مَیں اپنے قلب وجگر میں ابتداء شعور سے پاتا تھا، جب سے حروف پڑھنے کی کچھ شُد بُد ہوئی ہے، میں نے سیرتِ پاک کا جو بھی چھوٹا بڑا رسالہ پایا، بڑے ذوق وشوق سے پڑھا۔ مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور کی طالب علمی میں سیرۃ النبی (علامہ شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی) بطور تلاوت کے پڑھا کرتا تھا، گھر پر عبادت کی یکسوئی حاصل ہوئی، تو جوشِ محبت میں بہت اضافہ ہوا۔ میں اپنے سفرنامۂ حج ''بطواف کعبہ رفتم'' میں لکھ چکا ہوں کہ بالکل بچپن میں جبکہ میری عمر ۹/۱۰ سال رہی ہوگی، میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا۔

''جاڑوں کی ایک رات تھی میں اپنی بہنوں کے قدموں کی جانب سویا ہوا تھا، خواب دیکھتا ہوں کہ دادا محترم گھر میں تیزی سے تشریف لائے، اور والد صاحب سے جو گھر کے کسی کام میں مصروف تھے، ڈانٹ کر کہا تم ابھی یہیں ہو اور حضور اکرم ﷺ تشریف لا رہے ہیں۔ والد صاحب فوراً کام چھوڑ کر لپکے، اور میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں ان سے زیادہ تیزی کے ساتھ باہر کی جانب دوڑا، دروازہ پر پہونچا تو حضور ﷺ تشریف لا چکے تھے، عجلت میں والد صاحب کو کوئی چارپائی نہ مل سکی تو ایک چھوٹا سا کھٹولا ہی بچھا دیا، سرکار اس پر تشریف فرما ہوئے۔ میں یہ سوچ کر کہ حضور ﷺ بچوں پر نہایت شفیق و مہربان ہیں، آپ کے پاؤں کے پاس کھٹولے پر بیٹھ گیا، آپ نے کاغذ اور قلم طلب کیا، والد صاحب نے لا کر حاضر کیا، میں سوچنے لگا کہ کتابوں میں پڑھا ہے کہ آپ لکھنا نہیں جانتے تھے، پھر دیکھا کہ آپ کچھ لکھ رہے ہیں، کاغذ کا وہ ٹکڑا اور آپ کا دست مبارک اب تک نگاہوں میں موجود ہے۔''

آج پچاس باون سال گزرنے کے بعد آپ کے دست مبارک کی چمک دل میں اور آنکھوں میں تازہ ہے، دست مبارک کی پشت پر ایک رگ ابھری ہوئی اب بھی نگاہوں کے سامنے ہے، اب یہ خیال نہیں ہے کہ لکھ کر آپ نے کاغذ کیا کیا، پھر میری آنکھ کھل گئی، وہ دن میرے لئے عید سے بڑھ کر تھا، دن بھر بلکہ ایک مدت تک سرمستی سی رہی۔

جن دنوں میں شرح وقایہ پڑھ رہا تھا، ایک شب خواب میں دیکھا کہ میں مدینہ طیبہ میں حاضر ہوں، طبیعت خوشی سے بے تاب ہے، میں تلاش کر رہا ہوں کہ رسول اکرم ﷺ کہاں تشریف فرما ہیں، رات کا سماں ہے، اچانک مشہور صحابی حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا، اور فرمایا چلو تم کو میں حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں پہونچا دوں، میں شوق کے قدموں سے ان کے ساتھ چلا، کچھ دور چل کر فرمایا، ابھی ٹھہرو، تمہارا وقت ابھی نہیں آیا ہے، کچھ دنوں بعد تم کو پہونچایا جائے گا، اتنا فرمایا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی اور دل میں زیارت و حاضری کی خلش رہ گئی۔

یہ دونوں خواب مجھے ہمیشہ مستحضر رہے، گھر پر جب یکسوئی حاصل ہوئی، اور دل کا زخم

ناسور بنتا رہا، تو یہ خلش بھی بڑھی اور بہت بڑھی، میں نے زیارت نبوی کے وظائف پڑھنے شروع کیئے۔ دل اس جمالِ جہاں آرا کے تصور میں ہمہ وقت غرق رہتا، رات کو عشاء کے بعد بستر پر بیٹھ کر وظیفہ پڑھتا، اور محبت میں ڈوب کر یہ اشعار دہراتا، پھر آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔

جب صبا کوئے یار میں گزرے اتنا پیغام درد کا کہہ دے
دن بہت انتظار میں گزرے کون سی شب وہ آئیں گے

ایک عرصہ کے درد و کسک کے بعد زیارت وحاضری نصیب ہوئی، اور متعدد بار ہوئی۔ ایک بار دیکھا کہ آپ سے حدیث شریف کا سبق پڑھ رہا ہوں، ایک بار دیکھا کہ سحری کا وقت ہے اور میں گھی روٹی کا ملیدہ بنا کر خدمت اقدس میں پیش کر رہا ہوں، آپ نے تناول فرمایا، اور مجھے بھی اس میں سے حصہ عطا فرمایا، حق تعالیٰ رسول اکرم ﷺ کی برکات سے نوازیں۔

ان دنوں خواب میں متعدد بار حرمین شریفین کی حاضری ہوئی، میں اپنے احوال کو دیکھ کر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس سفر سعادت سے سرفراز کیا جاؤں گا، مگر قربان جاؤں رحمت پروردگار کے، اس وقت کے خواب، اب حقیقت میں ڈھل چکے ہیں۔ **فللّٰہ الحمد والمنۃ**

دوست کا خیال:

میں نے اپنے یہاں جاڑوں میں دیکھا کہ چند احباب مل کر گاجر کا حلوا بناتے ہیں، یہ حلوا کیا تھا، مقویات بدن کا اچھا خاصا مرکب ہوتا۔ اس کا ایک مخصوص نسخہ ہوتا، بنانے کی ترکیب ہوتی، لیکن ساتھ ہی بہت لذیذ بھی ہوتا۔ گاؤں میں میرا بھی ایک حلقۂ احباب تھا، طے ہوا کہ گاجر کا حلوا بنایا جائے، تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کر کے دس بارہ آدمیوں نے گاجر کا حلوا بنانا شروع کیا، یہ ایک طرح کی پکنک ہوتی، احباب سب اکٹھے ہوتے، جس مزاج کے لوگ ہوتے ویسی گفتگو ہوتی، میرا حلقہ دینداروں اور حفاظ قرآن کا تھا، اس لئے دینی باتیں، مسائل کا مذاکرہ، بزرگوں کے واقعات کا تذکرہ ہوتا، اس وقت طبیعت کو خوب انبساط ہوتا۔ میں اپنا حاصل مطالعہ بیان کرتا رہتا، لوگ سنتے بھی اور کام میں بھی لگے رہتے، اس طرح کے دو تین پروگرام میں میری شرکت ہوئی، یاد آتا ہے کہ دو دو کیلو حلوا حصہ میں آیا۔ حلوے کی مقدار زیادہ تھی، جس کا جی چاہا اس کا کچھ حصہ بیچ دیا اور جو رقم لگی تھی اسے خالی کرلیا، اور باقی حلوا نفع میں مفت پڑا۔ میں نے حلوا چکھا، بہت لذیذ تھا،

مجھے اپنا ایک غریب دوست یاد آیا، مجھے بڑی غیرت آئی کہ میں گاجر کا حلوا کھاؤں اور میرا دوست نانِ شبینہ کا محتاج ہو، میں نے سارا حلوا فروخت کردیا، اس کی قیمت میں مجھے پچیس روپئے حاصل ہوئے، میں نے وہ پوری رقم بھیج دی، اور طبیعت نے آسودگی اور راحت محسوس کی۔

خدا کی رزاقی پر ایمان کی پختگی:

میسور میں ملازمت کے وقت میں نے اپنے دل میں یہ بات طے کی تھی کہ دینی خدمت جو بھی میسر آئے گی اسے بطور خدمت اور عبادت کے پورا کروں گا، اسے میں ذریعۂ معاش نہ سمجھوں گا۔ طالب علمی کے زمانے سے یہ بات دل میں راسخ تھی کہ روزی حق تعالیٰ دیں گے، میرے ذمہ دین کی خدمت ہے، روزی کا وعدہ رازق مطلق نے کر رکھا ہے، مجھے یاد ہے کہ جب میں عربی سوم کا طالبِ علم تھا، تو مبارکپور کی مضافاتی آبادی اَملو میں اپنے والد کے ایک دوست مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی علیہ الرحمہ کی زیارت وملاقات کے لئے حاضر ہوا تھا۔ مولانا اہل حدیث عالم تھے، شاعری کا ذوق رکھتے تھے، اسی مناسبت سے والد صاحب سے دوستی تھی۔

مجھے معلوم ہوا کہ مولانا اپنے وطن املو تشریف لائے ہیں تو ان سے ملاقات کا شوق ہوا، میں حاضر ہوا، تو بہت اخلاق سے ملے، بڑی شفقت فرمائی، تعلیم کے متعلق پوچھتے رہے، مشورہ دیتے رہے، آخر میں ایک بات یہ پوچھ لی کہ پڑھنے کے بعد کیا کروگے؟ میں نے عرض کیا، دین کی خدمت کروں گا، فرمایا ہاں، یہ جذبہ تو اچھا ہے مگر معاش کے لئے میں پوچھ رہا ہوں۔ میں نے عرض کیا، معاش کا وعدہ حق تعالیٰ نے کیا ہے، اس پر ذرا پھیکے ہوکر وہ بولے، اس وقت یہ کہہ رہے ہو مگر بعد میں اسی بات پر کیا تم قائم رہ سکوگے؟ میں خاموش رہ گیا، مگر میرے دل میں وہی بات جمی رہی جو میں نے عرض کی تھی۔

پھر فارغ ہونے کے بعد جن دنوں میں گھر پر مقیم تھا، کبھی کبھی والد صاحب سے گفتگو ہوتی تو اس میں معاش اور ذریعۂ معاش کا بھی تذکرہ آتا، میں کہتا کہ روزی رساں اللہ تعالیٰ ہیں، اس کے لئے محنت کرنی کیا ضرور ہے؟ تو والد صاحب فرماتے کہ یہ تو صحیح ہے، مگر ذریعۂ معاش تو آدمی کو تلاش کرنا ہی پڑتا ہے، میں عرض کرتا کہ جو خدا معاش دے گا، کیا وہ ذریعۂ معاش نہ دے گا، اور یہ واقعہ ہے کہ میرے دل کو معاش اور ذریعۂ معاش کی فکر نے کبھی نہیں دبایا۔ انھیں دنوں میں

ایک بار اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا منیر الدین صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر تھا، ان کے یہاں بھی کسی تقریب سے ذریعۂ معاش کا ذکر آیا، میں نے سر جھکا کر عرض کیا کہ اس سلسلے میں مَیں وعدۂ الٰہی پر مطمئن ہوں، یہ سنتے ہی حضرت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور بہت تحسین کی اور بہت دعائیں دیں۔

تنخواہ کا معاملہ:

میسور کے ابتدائی ایام میرے لئے مالی لحاظ سے بہت سخت تھے، گھر سے جو کچھ رقم قدرے قلیل لے کر آیا تھا، وہ امروہہ میں قیام کے دوران ہی ختم ہوگئی تھی، میسور کے لئے راستے کا کرایہ اور خرچ جو کچھ ملا تھا وہ میسور پہونچتے پہونچتے ختم ہوگیا۔ تنخواہ ایک ماہ کے بعد ملنے والی تھی، درمیان میں کسی نے پوچھا نہیں، میری غیرت نے سوال کرنے کی بات تو الگ، تذکرہ کرنے کی اجازت نہ دی، اب نہ کپڑا دھونے کے لئے صابن، نہ گھر یا امروہہ خط لکھنے کے لئے پیسہ! مگر میں پیشانی پر شکن لائے بغیر مہینہ ختم ہونے کی مدت بخوشی گزار لے گیا، مہینہ ختم ہونے پر جب تنخواہ ملنے کا وقت آیا تو مسجد کے سکریٹری کے۔ نذیر احمد صاحب اور دو ممبران ابوبکر سیٹھ اور اقبال سیٹھ صاحبان تشریف لائے، ان حضرات سے اتنی مدت میں ذرا بے تکلفی ہوگئی تھی، ابوبکر سیٹھ نے معذرت کے لہجے میں کہنا شروع کیا کہ مولانا عبدالحی صاحب سے آپ کی تنخواہ کے متعلق جو گفتگو ہوئی تھی، اس میں طے یہ ہوا تھا کہ آپ کی تنخواہ ڈھائی سو ماہانہ ہوگی، مگر ہم لوگوں کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کو ہم نباہ نہ پائیں گے، اس لئے طے ہوا ہے کہ آپ کی تنخواہ دو سو روپئے ہو۔

میں نے عرض کیا کہ تنخواہ کی بات چونکہ مجھ سے نہیں ہوئی تھی، اس لئے اس معذرت کا محل میں نہیں ہوں، مولانا ہیں، آپ ان سے بات کرلیں، رہا میرا معاملہ تو وہ یہ ہے کہ نہ مجھے تنخواہ کی کسی مقدار کا مطالبہ ہے اور نہ خود تنخواہ کا مطالبہ ہے، مجھے آپ حضرات نے کام کرنے کا موقع دیا ہے، اس کے لئے میں شکر گزار ہوں، مجھے کام کرنے دیجئے، اس کے بعد آپ کی طرف سے جو کچھ مل جائے گا میں اسے عطیۂ الٰہی سمجھ کر قبول کرلوں گا، مجھے اس کا بھی انتظار نہ رہے گا کہ آپ نے مولانا سے بات کی یا نہیں؟ اسے سن کر وہ لوگ بہت خوش ہوئے، اور فوراً دو سو روپئے مجھے دئے، میں یہ سمجھ کر کہ یہ دو سو روپئے بھی میری حیثیت سے بڑھ کر ہیں، میں نے بخوشی قبول کرلئے، اس طرح

پندرہ بیس دن کی میری غربت ٹوٹی، ڈاک خانہ سے کارڈ اور لفافے لایا، امروہہ اور گھر خطوط لکھے۔

غریب رہنا منظور ہے:

میں عموماً اصحاب ثروت سے دور دور رہنے کی کوشش کرتا، غرباء ومساکین سے میرا زیادہ ربط رہتا تھا، کوئی مالدار آدمی مجھے دعوت دیتا تو میں لطیف حیلوں سے ٹال دیتا تھا، میسور جن لوگوں سے میری بے تکلفی تھی، ان میں سے صاحب اقبال سیٹھ تھے، یہ کوئی بڑے صاحب ثروت نہ تھے، ایک متوسط طبقے کے فرد تھے اور دیندار تھے، مسجد کے ذمہ داروں میں سے تھے، یہ صاحب بے تکلفی میں گفتگو کی حدوں کو کبھی کبھی پھاند جاتے تھے، لیکن مخلص تھے، سچے تھے، اس لئے ناگواری نہ ہوتی تھی، ایک روز مجھ سے بے تکلفی کی حد کو پھلانگتے ہوئے کہنے لگے، مولوی صاحب آپ بہت بیوقوف ہیں؟ میں یہ سن کر سناٹے میں آ گیا، لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ ان کا ارادہ کسی گستاخی کا نہیں ہے اس لئے مجھے نہ تکدر ہوا، نہ اشتعال ہوا، میں نے کہا مجھے اپنے بیوقوف ہونے میں شبہ نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ میں بیوقوف ہوں، لیکن آپ کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے، میں نے آپ کے ساتھ کون سی بیوقوفی کی ہے؟ کہنے لگے کہ میسور میں دینی علم نہیں ہے، یہاں شمال سے جو عالم اور حافظ وقاری آئے ہیں وہ مختلف تدبیروں سے یہاں کے مالداروں کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں، اور ان کے پیچھے لگے رہتے ہیں، اس طرح وہ تھوڑے دنوں میں مالدار ہو جاتے ہیں، اور آپ نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں تو ہمیشہ غریب ہی رہیں گے۔

میں نے کہا غریب رہنا منظور ہے، مگر دین اور علم دین کو بیچنا مجھے منظور نہیں ہے، میرے حصے کی روزی اللہ تعالیٰ مجھے دیں گے، مجھے جلدی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

دو واقعے:

میسور میں رمضان المبارک میں دو واقعے ایسے پیش آئے جن کے مشاہدے نے مجھے مزید متنبہ کر دیا کہ جن لوگوں پر علم دین کا نام لگا ہے انھیں بہت باخبر رہنا چاہئے۔

ایک واقعہ یہ ہوا کہ میرے ایک بے تکلف اہل تعلق نے افطار اور کھانے کی دعوت کی، اس روز صبح سے میں دیکھ رہا تھا کہ ایک صاحب بزرگ صورت، سفید ریش، بہت وجیہ وشکیل، دراز قد، چوڑے بدن کے، ہری لنگی اور ہرا صافہ باندھے ہوئے مسجد میں تشریف فرما ہیں، ظہر بعد درس

حدیث میں بھی نظر آئے، میں نے سمجھا کسی مدرسے کے سفیر ہوں گے، ملاقات کرنے کی ضرورت نہ انھوں نے محسوس کی اور نہ میں نے!

عصر کی نماز کے بعد صاحب دعوت گاڑی لے کر آئے کہ چلئے، میں گاڑی میں بیٹھنے لگا تو وہ بزرگ صورت بھی بے تکلفی سے بیٹھ گئے، میں نے سمجھا کہ ان کی بھی دعوت ہوگی، افطار ساتھ میں ہوا، اس وقت تک یہ صاحب خاموش رہے، مغرب کی نماز کے بعد کھانے پر بیٹھے، کھا کر فارغ ہوئے تو یہ صاحب کھڑے ہوگئے اور خطبۂ مسنونہ کے چند کلمات پڑھے، میرے کان کھڑے ہوئے کہ یہ صاحب تقریر کریں گے، خیر انھوں نے خطبہ ناتمام پڑھنے کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں کہتا ہے: **ولمن خاف ربی جنتی**، میں چونکا، مگر انھوں نے اس کے بعد اس سے زیادہ چونکا دینے والا ترجمہ کیا، ترجمہ یہ تھا کہ ''جس نے کھانا کھلایا اس کے لئے جنت ہے'' میں نے سر پیٹ لیا، خیریت یہ ہوئی کہ انھوں نے اپنی تقریر اتنے پر روک دی، میں نے صاحب دعوت سے پوچھا کہ آپ ان کو دعوت دے کر لائے ہیں؟ انھوں نے کہا نہیں، میں تو انھیں جانتا بھی نہیں، میں سمجھا کہ آپ کے تعلق والے ہیں، جو اتنی بے تکلفی سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔

میں سوچنے لگا کہ اسی طرح کی الٹی پلٹی باتیں کر کے یہ صاحب اور اس طرح کے لوگ شکار پھنساتے ہوں گے، اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کر کے کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہوں گے۔

بزرگوں کا مقولہ ہے کہ: **نعم الامیر علیٰ باب الفقیر**، فقیر کے دروازے پر اگر امیر جائے تو وہ بہتر امیر ہے، کیونکہ یہ اس کے تواضع اور انکسار نفس کی دلیل ہے۔ اور: **بئس الفقیر علیٰ باب الامیر**، اور اگر امیر کے دروازے پر فقیر جائے تو وہ برا فقیر ہے، کیونکہ اس کا امیر کے دروازے پر جانا حریص ہونے یا کسی غرض دنیوی حاصل کرنے اور تملق وخوشامد کی دلیل ہے، جو طبیعت کا سخت رذیلہ ہے۔ ہاں جب امیر فقیر کے دروازے پر آ گیا تو اس کے ساتھ تواضع اور اکرام کے ساتھ معاملہ کرنا ضروری ہے، کیونکہ اخلاق عالیہ اسلام میں بے حد ضروری ہے۔

میسور میں یہ مقولہ میرے پیش نظر رہا کرتا تھا، کئی اصحاب ثروت ایسے تھے جو دینی مسائل ومعلومات کے لئے بے تکلف حاضر ہوا کرتے تھے، ان سے محبت ہوگئی تھی، وہ اگر کبھی دعوت دیتے

تو مجھے جانے میں تکلف نہ ہوتا، لیکن بعض صاحبان ثروت گھر بیٹھے دعوت بھیجتے تو میں ہرگز قبول نہ کرتا۔

رمضان شریف میں ایک پرانے عالم وخطیب جو بہت عرصہ تک میسور کی ایک مسجد میں امام وخطیب رہ چکے تھے، اوراب دوسرے شہر میں فیض پہونچا رہے تھے، تشریف لے آئے، میسور کے ایک مالدارترین آدمی نے ان کی افطاراور کھانے کی دعوت کی، انھوں نے یہ دعوت قبول کرلی اور مجھے بھی اس دعوت میں شامل کرلیا، اور مجھے اس وقت بتایا جب وہ جانے کے لئے تیار ہورہے تھے، میں نے معذرت کی مگر انھوں نے ایک نہ سنی، زبردستی مجھے گاڑی پر بیٹھالیا، وہ مجھ سے عمر اور مرتبہ میں بہت بڑے تھے، اس لئے میں قوت سے انکار نہ کرسکا، گاڑی ہم لوگوں کومیسورشہر کے کسی ایک کنارے سرسبز وشاداب علاقے میں لے گئی، ایک باغ نما احاطہ میں ایک بڑی کوٹھی میں گاڑی داخل ہوئی، ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا، ایک شخص کو دیکھا کہ کرسی پر بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا ہے، ان عالم وخطیب صاحب نے بڑھ کر مصافحہ کیا، میں ٹھٹک گیا، مولانا نے فرمایا کہ یہی داعی ہیں، میں سخت مکدر رہا، میں نے نہ سلام کیا نہ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا، اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا، میں نے کرھاً مصافحہ کرلیا، میں نے مولانا سے کہا کہ آپ کہاں لے آئے؟ وہ خوشامدانہ لہجے میں اس شخص کی مالداری کے گن گاتے رہے، میں خون کے گھونٹ پیتا رہا، افطاری کا سامان دیکھا تو کہہ سکتا ہوں کہ اتنا پُرتکلف انتظام افطاری کا میں نے اب تک نہیں دیکھا تھا، انواع و اقسام کے کھانے کی چیزیں تھیں، دوتین آدمیوں کے لئے اتنا سامان تھا جو پچیس تیس آدمیوں کے لئے کافی ہوتا، میں نے تکدر کے ساتھ چند لقمے فروکئے، اور ہاتھ کھینچ لیا، مولانا لطف لے لے کر کھاتے رہے اور منہ بھر بھر تعریفیں کرتے رہے، وہیں مغرب کی نماز پڑھی، نماز میں بھی وہ شخص شامل نہ ہوا، اس کا ایک لڑکا شامل ہوا، اس نے روزہ بھی رکھا تھا، نماز کے بعد لوگ کھانے پر بیٹھے، میں بھوک کے باوجود نہ کھاسکا، میں اصرار کررہا تھا کہ جلدی چلیں، مگر مولانا اس اطمینان سے تھے جیسے یہیں مقیم ہوں، وہاں سے کسی طرح رخصت ہوئے، تو ہم لوگ ایک دوسری عمارت میں جوشہر کے اندر تھی لے جائے گئے، مولانا بتاتے رہے کہ یہ ان کا اپنا مکان ہے، اس کو انھوں نے ہوٹل میں تبدیل کردیا ہے، اور جہاں ہم لوگوں نے افطار کیا ہے وہ کرائے کا مکان ہے، اس مکان کا کرایہ

ڈھائی ہزار ماہانہ ہے، خیال رہے کہ یہ بات ۱۹۷۳ء کی ہے، ہوٹل کی سیر تفصیل کے ساتھ مولانا نے کی اور مجھے بھی کرائی۔ ہوٹل میں بہت سے رہائشی کمرے تھے، ہر کمرے کی آرائش الگ تھی، رنگ الگ تھا، کمرے کی دیواروں میں جو رنگ استعمال کیا گیا تھا، کمرے کی ہر چیز اسی رنگ کی تھی، چادر، تکیہ، ٹونٹیاں، صابن، صابن دانی، دروازے، ان کی سٹکنیاں، غسل خانے کی بالٹیاں، غرض سب ایک رنگ کے، مولانا نے بتایا کہ کمرے کا کرایہ ایک شب کا اسّی روپئے ہے، ہوٹل میں چائے پانچ روپئے کی ہے، میں اکتا گیا، آخر بیزار ہوکر باواز بلند مولانا سے کہا: **وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ** (طٰہٰ :۱۳۱) ہم نے ان کو جو مختلف انواع واقسام کی دنیاوی خوشنمائیاں دے رکھی ہیں، جن میں ان کی آزمائش ہے، ان کی طرف نگاہ بھی نہ اٹھاؤ۔ مولانا نے جب میری بیزاری عروج پر دیکھی تب فرمانے لگے کہ جلدی چلنا چاہئے، ہم لوگ گاڑی پر بیٹھے اور جب مسجد میں پہونچے تو آٹھ رکعتیں تراویح کی ہوچکی تھیں، مجھے بڑا صدمہ ہوا، یہ وہ وقت تھا جب حضر میں میری تکبیر اولیٰ فوت نہ ہوتی تھی، بالخصوص رمضان میں اس کا بہت اہتمام تھا، اس نامسعود دعوت کی وجہ سے فرض کی جماعت فوت ہوئی، آٹھ رکعت تراویح گئی۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا، اور طے کرلیا کہ اب ان مولانا کے ساتھ مجھے تعلق رکھنا ہی نہیں ہے میں نے ان سے بعد میں صفائی سے کہہ دیا کہ آپ یہاں کے پرانے ہیں، آپ کی دعوتیں ہوتی رہیں گی، مجھے دعوتوں میں لے جانے سے معاف ہی رکھئے پھر میں ان حضرت سے دور ہی دور رہا

خدا کی مہربانی:

میری پُرسکون زندگی میں ایک مرتبہ اضطراب کی ہلچل مچی۔ گھر میں مدرسہ کی طرف سے ملی ہوئی صرف دال روٹی پر اکتفا تھی، گوشت، ترکاری، تیل مصالحہ سے ہمارے برتن ناآشنا تھے، لیکن ہنسی خوشی اوقات بیت رہے تھے، غربت تھی، مگر اس کا احساس نہ تھا، نہ کوئی پریشانی اور دل تنگی تھی۔ اسی دوران مغرب کی نماز کے بعد عشا کے قریب مدرسہ میں میرے دو بہت عزیز دوست آئے، ایک میرے مخدوم زادے، میرے اخص الخاص محسن استاذ حضرت مولانا محمد افضال الحق صاحب مدظلہ...... جنھوں نے اس وقت میرے سر پر دست شفقت رکھا تھا جب ہر طرف سے میں طمانچوں کا مستحق تھا اور طمانچے لگ بھی رہے تھے، اس سنگین وقت میں انھوں نے اپنی آغوش میں

پناہ بخشی تھی، اس لئے ان سے، ان کی اولاد سے، ان کے متعلقین سے مجھے اس وقت بھی ایسی محبت تھی اور اب بھی ہے کہ ان کی ہر خدمت میرے لئے باعث صد سعادت و ہزار مسرت ہے......
انھیں استاذ محترم کے فرزند گرامی تھے، اور ان کے ساتھ ان کے ایک دوست تھے۔ میں دال روٹی کھا کر گھر سے آ گیا تھا، میں سہم گیا کہ ان عزیزوں کی خاطر داری کیونکر کروں؟ ایک لمحہ تشویش میں مبتلا ہوا، پھر اپنے ایک طالب علم کو بلایا اور دریافت کیا کہ تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں! میں نے کہا عشا کی نماز کے بعد بازار سے کھانا لے کر آ ؤ، مہمانوں کو کھلانا ہے، پھر میں مطمئن ہو گیا، عشا کی نماز کے بعد بازار سے جو عمدہ کھانا مل سکتا تھا وہ لایا، میں نے اپنے مہمانوں کی تواضع کی، یہ وقت تو خیریت سے گزر گیا، اب صبح ناشتے کی فکر سوار ہوئی، جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی، گھر میں کوئی سامان نہ تھا، میں رات کو گھر آیا، اہلیہ کو کچھ نہیں بتایا چپ چاپ بستر پر پڑ گیا، مگر فکر میں نیند کہاں آتی، رات کو بارہ بجنے کے بعد میں نے بستر چھوڑ دیا، وضو کر کے نماز اور مناجات میں مشغول ہو گیا، بڑے کرب اور درد میں یہ رات گزری، لیکن صبح ہوتے ہوتے دل میں ٹھنڈک پڑ چکی تھی، میں روزانہ کی عادت کے مطابق مدرسہ میں آیا، اذان دی، نماز پڑھی، نماز کے بعد پھر دعا و مناجات میں مشغول ہونا چاہ رہا تھا، اور اسی نیت سے مسجد سے نکل کر اپنے چھوٹے سے حجرے میں بند ہونے جا رہا تھا کہ مدرسہ کے مہتمم صاحب بھی مسجد سے نکلتے ہوئے مل گئے اور انھوں نے کوئی گفتگو چھیڑ دی، ان کی گفتگو دراز ہوتی تھی، مگر اتنی دلچسپ ہوتی تھی کہ وقت کے گزرنے کا احساس نہ ہوتا تھا، مگر آج مجھے بے کلی تھی، میں اپنے پروردگار سے کچھ مانگنا چاہتا تھا، اس لئے آج میں اکتا رہا تھا، خیر وہ چند باتیں کر کے رخصت ہوئے اور میں کمرے میں جا کر اسے بند کرنے لگ گیا، ابھی ٹھیک سے بند نہ کر سکا تھا کہ مہتمم صاحب پلٹ کر آئے اور سلام کیا۔ مجھے خیال ہوا کہ پھر کوئی بات انھیں یاد آئی، انھوں نے کہا کہ آپ کی تنخواہ کے یہ ستّر روپئے باقی رہ گئے تھے، میں دو روز سے اسے جیب میں لئے ہوئے ہوں کہ آپ کو دیدوں، مگر یاد نہ رہا، اب بھی بھول کر جا رہا تھا، تھوڑی دور پہونچا تھا کہ یاد آ گیا، پلٹ کر آیا کہ ابھی دیدوں، میں نے لے لیا، وہ چلے گئے، اور میں دروازہ بند کر کے حق تعالیٰ کے احسان اور مہربانی کے تصور سے بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رویا، میں روئیں روئیں سے شکر الٰہی بجا لا رہا تھا، جب اس حال سے افاقہ ہوا تو میں نے ناشتے کا سامان

منگوایا، اس وقت کے لحاظ سے پُر تکلف ناشتہ بنا، مہمانوں کو ناشتہ کرایا، رخصت کے وقت دونوں کو دس دس روپئے ہدیہ دئے، اس رقم میں بہت برکت ہوئی۔

اتحاد کی برکت:

دملہ جھارکھنڈ میں ایک قابل ذکر بات یہ سامنے آئی کہ یہ سارا علاقہ پنج وقتہ نماز کی جماعت اور جمعہ کی جماعت میں تو متحد ہے، ایک امام کے پیچھے، ایک مسجد میں ساری نمازیں ادا کی جاتیں، مگر عیدین کی نماز ایک کے بجائے دو جگہ پڑھتے، اور معلوم ہوا کہ اس کا سلسلہ ایک عجیب وغریب جھگڑے سے شروع ہوا۔ ایسا جھگڑا جس کی نظیر اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی، وہ یہ کہ آج سے کم ازکم سو ڈیڑھ سو سال پہلے علاقے کے لوگ عیدین کے لئے اکٹھا ہوئے تو کچھ لوگ جو پنج گانہ نمازوں کے پابند تھے وہ خود اگلی صف میں کھڑے ہوئے اور بے نمازیوں کو اپنے ساتھ صف میں کھڑے ہونے اجازت نہ دی، اس کی وجہ سے نمازیوں اور بے نمازیوں میں سخت افتراق پیدا ہوگیا، اور بے نمازیوں نے اپنی عیدگاہ الگ کرلی اور اس طرح کچھ عرصے تک سال بھر کے نمازی الگ عید کی نماز پڑھتے اور دوسرے لوگ الگ، کچھ مدت گذرنے کے بعد الگ الگ آبادیوں کی عیدگاہیں ہوگئیں، اور اس بنیاد پر ایک بدمزگی کی کیفیت مستقل رہنے لگی، بعد میں مختلف لوگوں نے عید کی نماز کو متحد کرنا چاہا مگر اختلاف کی جڑیں اتنی مضبوط تھیں کہ کوشش بسیار کے بعد بھی اتحاد پیدا نہ ہوسکا۔ ۱۵/ رمضان المبارک کے بعد میرے سامنے بھی یہ مسئلہ شدت سے ابھرنے لگا، کئی حضرات نے مجھ سے نہایت دردمندی کے ساتھ اس مسئلے کو ذکر کیا کہ سال میں یہ دو خوشی کے مواقع ایسے آتے ہیں جن میں دلوں کا سکون درہم برہم ہوجاتا ہے، آپ کو یہ سارا علاقہ ماننے لگا ہے اگر آپ کی فہمائش سے یہ اختلاف دور ہوجائے تو بہت مبارک ہوگا، میں نے اس سلسلے میں محنت شروع کردی، لیکن اندازہ ہوا کہ جھگڑے کا یہ جن آسانی سے لوگوں کے سروں سے اترنے والا نہیں ہے۔

یہ زمانہ برسات کا تھا، مگر بارش نہیں ہورہی تھی، کھیتیاں سوکھی جارہی تھیں، اس علاقے میں بارش کے علاوہ آب پاشی کا اور کوئی ذریعہ نہیں، پہاڑی زمین ہونے کی وجہ سے ہینڈ پائپ اور ٹیوب ویل کا کوئی نظم نہ تھا، چند ایک کنویں تھے جن سے لوگ پانی پینے کا انتظام کرتے تھے، اور

دوایک تالاب تھے جن میں لوگ نہاتے اور کپڑے دھوتے، سینچائی کے لئے صرف بارش کا سہارا ہوتا، مگر بارش مطلق نہیں ہورہی تھی، اس لئے خلقت پریشان تھی، میں نے نمازِ استسقاء اور دعاء و استغفار کے لئے کئی مرتبہ لوگوں کو اکٹھا کیا، مگر بظاہر ہر اجتماع ناکام رہا اور دعا نامراد رہی۔ بارش نہ ہونی تھی اور نہ ہوئی، جن لوگوں کے دلوں میں بدگمانی کی خلش تھی انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ فلاں مولوی کی نحوست سے بارش بند ہے، اس افواہ سے مجھے قلبی صدمہ ہوا، مگر قرآن کریم کی ان آیات سے تسکین ہوتی جن میں انبیاء کی قوموں نے انبیاء کو ملزم گردانا تھا اور اللہ نے ان کی تردید فرمائی ہے۔ عشرۂ اخیرہ میں اس خاکسار کا قیام مرکٹا میں ہوا، بلکہ مسجد میں اعتکاف کیا اور وعظ و نصیحت میں مزید سرگرمی پیدا ہوئی، رمضان کا آخری دن آتے آتے اللہ کا خاص فضل یہ ہوا کہ پورے علاقے میں اتحاد کی صورت پیدا ہوگئی، صرف ایک گھرانہ بلکہ اس گھرانے کا ایک فرد جو خاصا با اثر تھا وحدتِ کلمہ کی اس صورت سے بدکتا رہا، میں نے عید کے دن فجر کی نماز کے فوراً بعد اس کے گھر جاکر اس موضوع پر گفتگو کی، وہ شخص تھوڑی دیر میں موم ہوگیا، اور عید کی نماز آٹھوں گاؤں نے ایک جگہ جمع ہوکر ادا کی، اس یکجائی کا منظر بھی قابل دید تھا، سب کے چہروں پر خوشی کی لہر تھی، پرانی رنجشیں یکلخت کافور ہوگئیں، کسی کو کسی سے گلہ نہ رہا، جب تمام لوگ خوشی خوشی ایک جگہ اکٹھا ہوگئے اور صفیں درست ہونے لگیں تو اچانک بادِ رحمت چلنے لگی، پانی لئے ہوئے گھنگھور گھٹائیں آسمان پر امنڈنے لگیں، تمام لوگوں کی آنکھیں بارانِ رحمت کے آثار دیکھ کر خوشی سے چمکنے لگیں۔ میں نے اعلان کیا کہ اللہ کی رحمت برسنا ہی چاہتی ہے، مگر کوئی فرد یہاں سے ہرگز نہ ہٹے، اس اعلان کے بعد نماز شروع ہوئی، ایک رکعت کے بعد موسلا دھار بارش شروع ہوگئی، اتنا پانی برسا کہ دوسری رکعت کا سجدہ لوگوں نے پانی میں کیا، بارش ہورہی تھی اور امام نے عید کا خطبہ پڑھا، ہر فرد شرابور ہوکر گھر لوٹا، دن بھر بارش ہوتی رہی اور گرمی کی شدت یکا یک کافور ہوگئی، اور قحط سالی کا منظر شادابی اور خوشحالی سے بدل گیا، کسان نہال ہوگئے اور سب نے محسوس کیا کہ یہ قلبی اتحاد کی برکت ہے، عید اچھی گزر گئی، دین داری کا رنگ جمنے لگا، تعلیم کا شوق بھی بڑھا۔

جنیہ کا قصہ:

دملہ میں قیام کے دوران عید کے دن شام کے وقت یہ بات زیر بحث آئی کہ دس دن

مزید قیام کرنا ہے، یہ وقت کہاں گزارا جائے؟ مرکٹا گاؤں میں مولوی ولی محمد کے گھر والوں نے ایک لمبا سا کھپریل کا کمرہ گاؤں کے مکتب کے لئے متعین کر رکھا تھا۔ سب کی تجویز یہ ہوئی کہ باقی دس دن میں اسی کمرے میں رہوں، چنانچہ میری رہائش کا اس میں انتظام کر دیا گیا، یہ کمرہ شمال وجنوب میں لمبا تھا اور مشرق میں اس کا دروازہ کھلتا تھا، مغربی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی، اس کے بعد تھوڑی سی زمین غیر آباد تھی، اس سے متصل مولوی ولی محمد کا رہائشی مکان تھا، مولوی ولی محمد اپنے گھر سے نکل کر اسی کھڑکی سے کبھی کبھی کمرے میں آتے تھے، عشاء کی نماز کے بعد میرے طلبہ کچھ دیر میرے ساتھ رہے، پھر میں نے انھیں رخصت کر دیا اور باہر کا دروازہ اندر سے بند کر دیا، کھڑکی کا دروازہ بھیڑ دیا، بارش کی وجہ سے ہلکی سردی ہوگئی تھی، وہاں مچھروں کی بہتات تھی اس لئے چارپائی پر مچھر دانی لگا دی گئی تھی، بستر پر بیٹھ کر کچھ دیر میں وظائف پڑھتا رہا، پھر لالٹین گل کر کے جیسے ہی تکیے پر سر رکھا ایسا محسوس ہوا کہ کوئی شخص تکئے کے نیچے سے مچھر دانی کھینچ رہا ہے، مجھے خیال ہوا کہ شاید کھڑکی کے راستے سے مولوی ولی محمد آ گئے ہیں، اور غالباً سر پر تیل رکھنا چاہتے ہیں، میں نے منع کیا کہ جاؤ سو جاؤ، دیر ہوگئی ہے، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی عورت کا ہاتھ میرے سر پر آ گیا ہو، یہ ہاتھ برف کی طرح سرد تھا اور ٹھنڈک کی لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی، بے ساختہ میرے منھ سے نکلا کون ہو؟ اس کے جواب میں بجائے کسی آواز کے وہی ہاتھ میرے منھ پر آ گیا، مجھے سخت وحشت ہوئی، اب نہ کچھ بولنے کی تاب ہے، نہ کچھ پڑھنے کا یارا ہے، میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ یا اللہ! میں اجنبی جگہ پر ہوں، یہ کون سی فاحشہ عورت میرے پاس گھس آئی ہے، پتہ نہیں اس کا کیا ارادہ ہے؟ صبح کے وقت میری کیا گت بنے گی؟ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ عورت پورے جسم کے ساتھ بستر پر آ کر لیٹ گئی میں نے ہاتھ سے زوردار جھٹکا دیا تو اٹھ کر میرے پاؤں پر آ گئی، میں نے بدحواسی میں پاؤں کو جھٹکا دیا تو وہ چارپائی سے نیچے زمین پر دھم سے گر گئی، مچھر دانی تتر بتر ہوگئی، میں نے اٹھ کر لالٹین جلائی تو کچھ نہ تھا، نہ مرد نہ عورت، میں کچھ دیر بیٹھا، کچھ سوچتا رہا، کچھ پڑھتا رہا، پھر لالٹین مدھم کر کے سونے کی کوشش کی، دس منٹ بعد پیروں کی کھسکھساہٹ کی آواز آئی جیسے میرے سرہانے کوئی چل رہا ہو، کچھ دیر تک یہ آواز آتی رہی، پھر میں نے لالٹین کی روشنی بڑھائی تو کچھ نہ تھا، تھوڑے تھوڑے وقفے سے یہ آواز آتی رہی اور میں کچھ سوتا،

کچھ جاگتا رہا، اسی کشمکش میں ایک بج گیا، میں اس صورتحال سے تنگ آ گیا تھا، پانی لے کر باہر نکلا کہ استنجاء سے فارغ ہو کر وضو کرلوں، کمرے سے تھوڑے فاصلے پر استنجاء کے لئے بیٹھا تو میرے دائیں بائیں درختوں سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی لکڑی توڑ رہا ہو، استنجاء سے فارغ ہو کر اٹھا تو لالٹین کی روشنی میں دروازے پر ایک آدمی کھڑا دکھائی دیا، قریب پہونچا تو غائب ہو گیا، میں نے وضو کیا اور دو رکعت نماز میں پوری سورۂ بقرہ کی تلاوت کی، مجھ کو گمان ہو چلا تھا کہ یہ کوئی جن ہے جو روپ بدل بدل کر مجھے وحشت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے، اور اس علاقے میں بکثرت تجربہ ہوا کہ جناتوں کی بہتات ہے، نماز سے فارغ ہو کر میں بیٹھا کچھ پڑھتا رہا، ابھی صبح صادق کی کرن نہیں پھوٹی تھی، مجھے قضائے حاجت کا تقاضا ہوا، اس دیہات میں بیت الخلاء کہاں میسر! میں نے پانی لیا اور میدان کی طرف نکل پڑا، موقع کی دعائیں پڑھ کر ایک مناسب جگہ دیکھ کر بیٹھ گیا، بیٹھنا تھا کہ ایک ہنگامہ شروع ہو گیا، دائیں بائیں، آگے پیچھے سے مٹی کے بڑے بڑے ڈلوں کی بارش شروع ہو گئی، لیکن کوئی ڈلا نہ بدن پر آتا نہ بدن کے قریب گرتا، دو دو چار گز کے فاصلے پر وہ ڈلے گرتے رہے، میں فارغ ہو کر اٹھا تو ڈلوں کے حملے بند ہو گئے، اطمینان سے کمرے پر واپس آ گیا، مجموعی طور سے اس واقعے سے دل میں وحشت کی سی کیفیت پیدا ہوئی، مگر بحمد اللہ خوف طاری نہیں ہوا، میں دوپہر تک سوچتا رہا کہ یہ سرگزشت کسی سے ذکر کروں یا نہ کروں؟ اللہ جانے ان لوگوں پر کیا اثر پڑے؟ مگر اس قسم کی باتیں ہضم کرنا خاصا مشکل کام ہے، اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھ سے یہ مشکل کام نہ ہو سکا، ظہر کی نماز کے بعد کچھ لوگوں سے میں نے اس کا تذکرہ کیا، تو ایک صاحب کہنے لگے کہ جی! اس کمرے میں ایک جِنّیہ رہتی ہے، میں نے کہا جب یہ بات آپ کو معلوم تھی تو مجھے پہلے ہی بتا دینا چاہئے تھا تاکہ میں اس کی کوئی تدبیر کر رکھتا، خیر یہ بات رفت و گزشت ہو گئی اور اس جنّیہ نے اس کمرے کو چھوڑ دیا بلکہ اس گاؤں کو چھوڑ دیا، اس سے پہلے اس کمرے میں کوئی رات میں رہنے کی ہمت نہیں کرتا تھا، اس قصے کے بعد وہ آباد ہو گیا۔

نیت کی برکت:

بمبئی میں ایک صاحب ثروت کے مکان پر تھا، ان کا تعلق قدرے دینداری سے بھی تھا، کہنے لگے مولانا آپ وعظ کہتے ہیں، ایک ایسی چیز آپ کو دکھاتا ہوں جو آپ کے وعظ و تقریر کیلئے

مفید ہوگی، پھر کہنے لگے کہ قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ جنگل میں جانور کس طرح بغیر کھائے پیئے، صرف ہوا کے سہارے مدتوں زندہ رہتے ہیں؟ میں نے پوچھا یہ منظر آپ مجھے کس طرح دکھائیں گے، کہنے لگے ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ ٹی۔وی پر! میں نے معذرت کی، اور کہا کہ میں مجمع عام میں ٹی۔وی دیکھنے کو حرام کہتا ہوں، اگر خلوت میں مَیں وہی کام کروں گا تو اللہ ورسول سے بغاوت ہوگی میرے وعظ کے لئے قرآن وحدیث اور بزرگوں کے حالات وواقعات کافی ہیں، حافظ شیرازی نے ایسے واعظوں کے بارے میں جو خلوت وجلوت کا رنگ الگ الگ رکھتے ہیں کہا ہے۔ ؎

واعظاں کیں جلوہ برمحراب ومنبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

یہ واعظ حضرات جو منبر ومحراب پر جلووں کی نمائش کرتے ہیں، جب خلوت میں جاتے ہیں تو دوسرا کام کرتے ہیں۔

میرے انکار پر بھی وہ مصر رہے، وہ اپنے بیٹے کو بتاکید حکم دیتے رہے کہ فلاں کیسٹ تلاش کرو، وہ کیسٹوں کے انبار میں مسلسل تلاش کرتا، اور میں کانپتا تھراتا رہا کہ کہیں وہ مل گئی، اور مجھے مجبور کیا گیا، تو وہ دین وشریعت کے ساتھ وفاداری کہاں رہی؟ جس کو میں سوچا کرتا ہوں، پھر میں نے دل ہی دل میں خداوند ذوالجلال سے مناجات کی، اور ڈھونڈھنے والا پسینہ سے تربتر ہوگیا اور وہ کیسٹ نہیں ملی۔

غلطی کا احساس:

زمانۂ تدریس میں مَیں اپنی درسگاہ میں بیٹھا تھا، ایک ذہین طالب علم دوسرے طالب علم سے کہہ رہا تھا، میرا کمرہ پہلی منزل پر تھا، وہ طالب علم کمرے سے نیچے، پانی کا نل تھا، وہیں کھڑا دوسرے کو سمجھا رہا تھا کہ، مولانا تم سے ناراض ہیں، تم ان سے جلدی معافی مانگ لو۔ میرے کان میں آواز آئی اور اس کی محبت بھی دل میں محسوس ہوئی کہ وہ دوسرے کے ساتھ خیر خواہی کی بات کررہا ہے، کچھ دیر اسے سمجھاتا رہا اور آخر میں ایک ایسی بات میرے کان میں آئی کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، اس نے کہا کہ ایک مرتبہ مولانا مجھ سے ناراض ہوگئے تھے، اور مجھے ایسی سخت بات کہہ دی تھی کہ میں ایک ہفتہ تک ٹھیک سے کھانا نہ کھا سکا تھا، میں اپنی غلطی کے احساس

میں ڈوب گیا، اور سوچنے لگا کہ ایک مرتبہ اپنے استاذ کی ایک بات سے میرا کھانا تلخ ہو گیا تھا، اب میری ایک بات سے میرے ایک طالب علم کا بھی وہی حال ہوا، میں نے اسی وقت اللہ سے معافی مانگی کہ اب ہمیشہ اس کا خیال رکھوں گا، پھر جب کسی کی غلطی پر غصہ آیا اور کچھ کہنا چاہا، تو وہی گفتگو یاد آ گئی، میں نہیں جانتا کہ میں اپنی توبہ میں کامیاب رہا یا نہیں؟ لیکن یہ بات یاد ضرور رہتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

بروایتِ دیگراں

جذبہ اتباع سنت:

حضرت مولانا علیہ الرحمہ کا خاص وصف جذبہ اتباع سنت ہے، میں نے (مولانا ضیاء الحق صاحب خیرآبادی) سالہا سال سفر وحضر میں ساتھ رہ کر اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا نے فرمایا کہ میں نے سیرت نبوی کا تین سال تک مطالعہ محض اتباع سنت کی نیت سے کیا ہے،۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کے اندر اتباع سنت کا کیسا جذبہ فروزاں رہا ہوگا۔(بروایت مولانا ضیاء الحق صاحب خیرآبادی)

تربیت السالکین:

ایک واقعہ حضرت مولانا سے کئی بار سنا، جی چاہتا ہے کہ تمہیں بھی سنا دوں۔

حضرت مولانا نے فرمایا کہ فراغت کے معاً بعد ایک وقت ایسا آیا کہ طبیعت بہت افسردہ رہتی تھی، ہر وقت یہی خیال رہتا تھا ہم جیسے لوگ کسی کام کے نہیں ہیں، ہمارے وجود کا کوئی فائدہ نہیں، ایک روز دوپہر کو کھانے کے بعد طبیعت پر عجیب طرح کی یاسیت طاری تھی اور اس خیال کا بہت شدید غلبہ تھا کہ اللہ نے ہمیں کس کام کے لئے پیدا کیا ہے؟ ہم بالکل بے کار ہیں کسی کام کے نہیں، اسی خیال میں غلطاں و پیچاں سو گیا، خواب میں دیکھتا ہوں کہ ایک بہت بڑا میدان ہے، ذہن میں آیا کہ اللہ تعالیٰ بھی یہیں موجود ہیں، وہی بات میں پھر سوچنے لگا کہ ہمارے وجود کا مقصد!!!، تو دیکھتا ہوں تو سامنے ایک بہت بڑے سبز رنگ کے بینر پر سفید تاروں سے کاڑھے ہوئے عربی رسم الخط میں یہ الفاظ لکھے ہیں:

تربیت السالکین

یہ دیکھ کر دل فرحت وطمانینت سے بھر گیا، اور میں سمجھ گیا کہ انشاء اللہ آئندہ سالکین کی

تربیت کا کام لیا جائے گا۔

واقعی اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا سے تربیت واصلاح کا بہت بڑا کام لیا. رحمہ اللہ تعالیٰ ونور قبرہ وبرد مضجعہ (بروایت مولانا ضیاء الحق صاحب خیرآبادی)

انداز کریمانہ:

مجھے ایک مرتبہ مولانا کے بغل میں نماز پڑھنے کا شوق ہوا، اور اس پر عمل بھی ہونے لگا، میں نماز میں ایک غلطی کرتا تھا، لیکن قربان جایئے مولانا پر کہ روزانہ دیکھنے کے باوجود ایک دن متنبہ بھی کیا تو اس قدر نرمی سے کہ میں آج تک حیرت زدہ ہوں۔ سلام پھیرنے کے بعد میرے گھٹنے پر اپنا ہاتھ رکھا اور بہت ہی پیارے انداز میں پوچھا کہ گھٹنوں میں درد ہے کیا؟ میں نے کہا نہیں، تو کہنے لگے کہ تب کیوں سجدہ میں ہاتھ پہلے رکھتے ہو؟ بس اس کے بعد کچھ نہیں کہا، میں حیرت میں پڑ گیا کہ روزانہ دیکھنے اور جاننے کے باوجود کہ درد نہیں ہے، ٹوکا بھی تو غایت درجہ نرمی کے ساتھ! (بروایت مولوی اعجاز اللہ قاسمی)

غیبی مدد:

ایک مرتبہ مولانا نے فرمایا کہ میرے مجاہدات ایک زمانے میں چل رہے تھے، سخت گرمیوں کے موسم میں نفلی روزہ بکثرت رکھا کرتا تھا، ایک دن میں روزہ سے تھا اور قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول تھا، گرمی اتنی شدید تھی کہ پیاس کی وجہ سے زبان نہیں چل رہی تھی، آخر کار تلاوت بند کر کے سونے پر مجبور ہو گیا، اور خواب کی دنیا میں چلا گیا۔ جیسے ہی آنکھ لگی، میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص پلیٹ میں کھیر لے کر میرے پاس آیا، اور مجھ سے کہا کہ اس میں سے کھاؤ، مجھے بھوک تو لگی ہی تھی، میں نے کھانا شروع کر دیا، اور خوب کھایا، اس نے اور کھاؤ، تو اور کھایا، جب آسودہ ہو گیا تو وہ چلا گیا، کچھ دیر کے بعد جب بیدار ہوا تو مجھے حیرت ہوئی کہ یہ خواب تھا یا حقیقت تھی؟ بس جلدی سے میں نے منہ پانی ڈالا اور کلی کی، منہ سے جو پانی نکلا وہ سفید تھا، پھر ہاتھ کو دیکھا تو اس میں بھی اس کا اثر باقی تھا اور خوشبو بھی آرہی تھی، میں بڑی حیرت میں پڑ گیا کہ یا اللہ! یہ کیا ہوا؟ پھر میں سمجھ گیا کہ یہ اللہ تعالی کی مہربانی تھی کہ کھلایا اور روزہ بھی باقی رکھا۔ (بروایت مولوی اعجاز اللہ قاسمی)

ایک لطیفہ:

مغرب کے بعد وقت تھا، میں والد صاحب (حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نوراللہ مرقدہ) کے پاس بیٹھا ہوا تھا، ایک صاحب کا فون آیا، ان کے یہاں بچے کی پیدائش ہوئی تھی، اور وہ بچہ کا نام الف نون زائد تان کے ساتھ رکھنا چاہتے تھے، والد صاحب نے اس کو نام بتلانا شروع کیا سلمان، غفران، فرقان، عمران، ذیشان مگر ہر نام وہ یہ کہہ کر رد کر دے رہے تھے کہ یہ نام خاندان میں فلاں شخص کا ہے، آخر میں جب بارہ پندرہ نام ہو گئے اور سب کو انہوں نے رد کر دیا تو والد صاحب کی رگ ظرافت پھڑکی اور کہا کہ اب صرف دو نام اس وزن پر بچے ہیں، اور وہ نوں نام ایسے ہیں کہ تمہارے آس پڑوس تو دور کی بات دنیا میں بھی کسی کا وہ نام نہیں ہوگا۔

انہوں نے جلدی سے پوچھا کہ بتایئے۔

مسکراتے ہوئے جواب دیا ''ایک تو ''سامان'' ہے اور دوسرا ''شیطان'' ہے۔ (از مرتب)

پیسوں کے ساتھ معاملہ:

ایک بار حضرت مولانا بزرگوں کی قبر کی زیارت اور فاتحہ خوانی کے لئے پانی پت گئے، وہاں ایک بزرگ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد (ان بزرگ کا نام سے ذہن سے اتر گیا) کہا کہ یہ فلاں بزرگ ہیں انہوں نے اپنی زندگی میں عہد کیا تھا کہ پیسوں کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا، اور پھر پوری زندگی اس عہد کی پاسداری کرتے رہے۔ آج سے میں بھی عہد کرتا ہوں کہ پیسوں سے اپنے کو دور رکھوں گا، اس کے بعد بقیہ زندگی حضرت نے بھی اپنے اس عہد کی پاسداری کی۔

اس عہد و پیمان کے بعد مولانا نے اپنے بیٹے مولانا راشد صاحب کو قولاً تو نہیں عملاً اپنا خزانچی بنالیا، پیسوں کے جتنے معاملات تھے سب انہیں سے متعلق ہو گئے، مثلاً سفر خرچ، ٹکٹ بنوانا، یا کسی کو کچھ دینا اور بھی دیگر معاملات جو ہو سکتے تھے، وہ سب آخر تک مولانا راشد صاحب انجام دیتے رہے، اس عہد کی پاسداری میں کبھی کبھی دقتیں بھی پیش آئیں، مگر مولانا ثابت قدم رہے، ذیل میں اسی سے متعلق دو واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ کہیں سفر میں تھے، فجر کی نماز کے بعد تن تنہا ٹہلنے کے لئے نکلے، راستے میں

ایک فقیر نے صدا دی، اور ہاتھ پھیلا کر سامنے کھڑا ہو گیا، مولانا نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو پیسہ ندارد، معذرت کر کے آگے بڑھ گئے، واپس آئے تو مولانا راشد صاحب سے کہا کہ کچھ کھلے پیسے میری جیب میں ڈال دیا کرو تا کہ مانگنے والوں کے سامنے مجھے خجل نہ ہونا پڑے۔ (بروایت مولانا محمد راشد صاحب مدظلہ)

ممبئی میں قیام کے دوران ایک دن مجھ سے کہا کہ بیٹے! تیار ہو جاؤ، ڈاکٹر کے پاس دانت صاف کرانے چلنا ہے، میں جھٹ سے تیار ہو گیا اور جیب میں پیسہ رکھنا بھول گیا، ڈاکٹر کے پاس پہونچے، اس نے دانت صاف کرنے سے پہلے کچھ دوائیاں لکھیں کہ سامنے کے میڈیکل سے لے آیئے، میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو پیسہ ندارد، والد صاحب سے کہا، انہوں نے اپنی جیب ٹٹولی، تو اس میں بھی کچھ نہیں، مجھ سے کہا کہ تم کو معلوم ہے کہ میری جیب ہمیشہ خالی رہتی ہے، تم کو تو پیسہ لے کر آنا چاہئے تھا، میں نے معذرت کی کہ بھول گیا، ڈاکٹر ہماری بات سن رہا تھا، اس نے کہا کوئی بات نہیں، یہ پیسہ لیجئے اور دوا لے کر آیئے۔ گھر واپس آنے کے بعد سب سے پہلے ڈاکٹر کے پیسے واپس کرائے۔ (از مرتب)

دلداری:

مدرسہ شیخ الاسلام میں ایک مرتبہ تقسیم اسباق کے وقت ایک استاذ نے درس نظامی کی ایک مشکل ترین کتاب پڑھانے کی خواہش ظاہر کی، اور اس کے لینے پر اصرار کیا، مولانا کو ان کی علمی لیاقت کا خوب اندازہ تھا، وہ جانتے تھے کہ یہ کتاب ان کے بس کا روگ نہیں ہے، مگر ان کے اصرار کی وجہ سے بادل ناخواستہ انہیں دے دی، مہینے دو مہینے کے بعد جب انہیں خوب اچھی طرح احساس ہو گیا کہ یہ میرے بس کی نہیں ہے، تو مولانا کی خدمت میں جا کر اپنی بے بسی ظاہر کی اور اس کو اپنے پاس ہٹانے کے لئے کہا۔

اب یہ موقع تھا کہ مولانا ان کے اس وقت کے بے جا اصرار پر ڈانٹتے یا ان کو شرمندہ کرتے، مگر مولانا نے کچھ نہیں کہا، بہت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ کہا کہ بہتر ہے، آپ کا یہ اقدام لائق تحسین ہے، یہ آپ کے خلوص کی دلیل ہے کہ آپ نے اپنے بارے میں نہیں بلکہ لڑکوں کے بارے میں سوچا اور کتاب واپس کرنے آگئے۔

یہ بات سن کر خود وہ صاحب بہت متأثر ہوئے، ان کا گمان تھا کہ میں نے اصرار کر کے یہ کتاب لی ہے، اب نہیں پڑھا پا رہا ہوں تو مولانا اس پر خفا ہوں گے اور شرمندہ کریں گے مگر وہاں تو رنگ ہی دوسرا تھا۔ (بروایت مولانا عبدالقادر صاحب کشی نگری)

فتنوں سے احتراز:

والد صاحب نے جب شیخو پور چھوڑنے کا پختہ ارادہ کرلیا تو ممبئی سے شیخو پور جانے کے بجائے بھیرہ آئے، اس سفر میں صرف میں ہی ساتھ میں تھا، ممبئی سے دیو بند، دیو بند سے دلی، اور پھر دلی سے بھیرہ آئے۔

دہلی میں والد صاحب تھے تو ایک صاحب ثروت با اختیار آدمی جو اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں، ان کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے آکر والد صاحب سے کہا کہ آپ بھیرہ جانے کے بجائے سیدھا شیخو پور جایئے، وہاں آپ کی پچیس سال کی محنت لگی ہوئی ہے، اور سب جانتے ہیں کہ وہ پودا آپ کا سینچا ہوا ہے، اس پر سب زیادہ آپ کا حق ہے، آپ وہاں جایئے اور وہیں بیٹھئے، اگر کسی نے کچھ کہا تو ہم لوگ ہیں، حکومت کے زور سے وہ مدرسہ آپ کو دلوا دیں گے، جو بھی خرچ کرنا ہوگا یا طاقت لگانی ہوگی وہ ہم لوگ کریں گے آپ اطمینان سے وہاں جایئے۔

والد صاحب خاموش رہے، جب دو تین مرتبہ انہوں نے یہی بات کہی تو بولے کہ یہ سب کرنا تو آپ لوگوں کے لئے آسان ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ پولیس کی طاقت اور حکومت کا زور لگانے سے اچھا خاصا فتنہ ہوگا، یہ سارا فتنہ میری طرف لوگ منسوب کریں گے، میں نہیں چاہتا ہوں کہ میری طرف کسی طرح کا کوئی فتنہ منسوب ہو، وہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں نہ رہوں تو ٹھیک ہے، میں خاموشی کے ساتھ وہاں سے اٹھ گیا، اب کہیں دوسرا چمن آباد کروں گا، انہوں نے میرے خلاف فتنہ کیا تو میں ان کے خلاف فتنہ کرنے نہیں جاؤں گا۔ (از مرتب)

دین کا جذبہ:

شیخو پور جب آپ نے چھوڑنے کا عزم کرلیا اور یہ بات لوگوں کو بھی معلوم ہوگئی تو ایک دن ایک بڑے مولانا صاحب نے والد صاحب کو فون کیا اور کہا کہ آپ شیخو پور چھوڑنے کے بعد کسی دوسرے مدرسہ میں مت جایئے گا بلکہ اپنا ایک مدرسہ قائم کیجئے، آپ کا اپنا مدرسہ ہوگا تو اس

طرح کے خرخشے اور فتنے کی گنجائش نہیں رہے گے جس سے آپ دوچار ہوئے ہیں، اور آپ کی اولاد کے مستقبل کے لئے بھی یہ مدرسہ کام آئے گا، یعنی مستقل ذریعہ معاش کا ایک وسیلہ ہو جائے، والد صاحب نے ان کی بات سن لی اور کچھ نہیں کہا، میں وہیں بیٹھا ہوا تھا، فون رکھنے کے بعد مجھ سے کہنے لگے کہ مدارس کو میں صرف اور صرف دین کی خدمت کا ذریعہ سمجھتا ہوں، اور اسی جذبہ سے ابھی تک میں نے مدرسوں میں کام کیا ہے، میں مدرسہ کو کبھی بھی ذریعہ معاش نہیں سمجھا، اور نہ کبھی تنخواہ کی غرض سے مدرسہ میں پڑھایا، اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں تو یہ لوگ چاہتے ہیں کہ مدرسہ قائم کر کے اپنی اولاد کے لئے اس کو معاش کا وسیلہ بنا دوں، یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکتا، جیسے میری معاش کا انتظام اللہ نے کیا اسی طرح ان شاء اللہ میری اولاد کی بہتر معاش کا انتظام اللہ کرے گا۔

(ازمرتب)

اولاد کی اخروی خیر خواہی:

ایک مرتبہ ایک صاحب نے والد صاحب سے کہا کہ آپ نے اپنی تمام اولاد کو دینی تعلیم دلائی، کسی کو تو کالج میں بھیج دیئے ہوتے اور ڈاکٹر یا انجینئر بنایا ہوتا۔ والد صاحب نے کہا کہ ایک مرتبہ بعینہ یہی سوال کسی صاحب نے عطاء اللہ شاہ بخاری علیہ الرحمہ سے بھی کیا تھا، تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ دنیاوی تعلیم دلا کر جہنم کے راستے پر لگانے سے بہتر ہے کہ میں اسے اپنے ہاتھوں سے ذبح کر دوں۔ میرا بھی آپ کے لئے یہی جواب ہے۔ (ازمرتب)

بیماری میں شریعت کا لحاظ:

والد صاحب کے گردے تو بہت پہلے سے متاثر تھے پھر اخیر میں بالکل ناکارہ ہو گئے تھے، ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق ڈائیلیسیس ضروری ہو گئی تھی مگر والد صاحب ذہنی اعتبار سے اخیر تک ڈائیلیسیس کے لئے تیار نہیں تھے، کہتے تھے کہ ڈائیلیسیس کا عمل مدت طلب عمل ہے، کم سے کم تین سے چار گھنٹے لگتے ہیں، میں نہیں چاہتا کہ اتنی دیر تک میرا جسم ڈاکٹروں کے ہاتھ کا کھلونا بنے، اور پھر عموماً ہاسپٹل میں لڑکیاں کام کرنے والی ہوتی ہیں، میں مریض بن کر لیٹا رہوں گا تو ان کا بھی میرے پاس آنا جانا رہے گا، اور یہ مجھے برداشت نہیں ہے، اور سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ اس

مدت میں نماز کے قضا ہونے کا خوف ہے۔

جب ڈاکٹروں کا اصرار ڈائلیسیس کے لئے بڑھا اور بادل ناخواستہ تیار ہو گئے تو ہاسپٹل جانے سے پہلے کچھ شرائط رکھی، پہلی شرط یہ رکھی کہ میرے کمرے میں ہاسپٹل کی لڑکیوں کا داخلہ ممنوع ہوگا، دوسری شرط یہ رکھی کہ میرا معالج (ڈاکٹر) کلمہ گو ہونا چاہیے، میں کسی غیر مسلم سے علاج نہیں کراؤں گا، اور پھر کمرہ اتنا بڑا ہو کہ اطمینان سے کھڑے ہو کر نماز پڑھی جا سکے، ڈائلیسیس کے لئے ایسا وقت متعین کیا جائے کہ کسی نماز کے قضا ہونے کا خدشہ نہ ہو، مثلاً فجر کے فوراً بعد، یا پھر عشاء کے بعد۔ جب ڈاکٹروں نے یقین دلا دیا کہ ہم آپ کو آپ کی شرائط پر ہاسپٹل میں رکھیں گے تب آپ جانے کے لئے تیار ہوئے۔ (از مرتب)

☆☆☆☆☆☆

اعلان

امیر المومنین وسید المجاہدین حضرت سید احمد شہید قدس سرہ کے سفر حج کا تذکرہ عجیب و غریب روشن حالات سے معمور ہے، یہ تذکرہ ہم حضرت سید صاحب کے حالات و واقعات پر مشتمل کتاب ''وقائع سید احمد شہید'' سے اخذ کر کے مرتب کر رہے ہیں، یہ کتاب اسی جماعت کا مرتب کیا ہوا مجموعہ ہے جس کو سید صاحب کے مسترشد خاص نواب وزیر الدولہ مرحوم (والی ریاست ٹونک) نے سید صاحب کی وقائع نگاری اور تاریخ نویسی کے لئے مقرر کیا تھا، اس میں سید صاحب کے بعض اعزہ آپ کے رفقاء سفر و جہاد اور آپ کے خدام تھے، ہر ایک اپنی معلومات اور چشم دید واقعات بیان کرتا اور کاتب اسے لکھ لیتا، یہ مجموعہ حضرت سید صاحب اور ان کی دعوت وتحریک سے متعلق مراجع میں سب سے وسیع ذخیرہ ہے۔ (اعجاز احمد اعظمی)

متذکرہ بالا نوٹ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نور اللہ مرقدہ نے ''کاروان حرم'' نامی زیر ترتیب مجموعے پر لگایا تھا۔ مولانا نے ''کاروان حرم'' کے نام سے سید صاحب کے سفر حج کو مرتب کرنا شروع کیا تھا، جو علوم ونکات جلد دوم میں شائع بھی ہوا ہے، مگر مرحلہ تکمیل تک پہونچے سے قبل مولانا کا بلاوا آ گیا، اور یہ کام تشنہ رہ گیا، ارادہ ہے کہ مولانا کے اس مصنوبے کو مرحلہ تکمیل تک پہونچایا جائے، سو اس کے لئے مرتب نے کمر ہمت کسی ہے، اور کام بھی شروع کر دیا ہے، جلد ہی ان شاء اللہ ''کاروان حرم'' کتابی صورت میں شائع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔

آپ سے استدعا ہے کہ اس کام کے بخیر وخوبی مکمل ہونے کی دعا فرمائیں۔

محمد عرفات اعظمی